سہ ماہی اسلام آباد

ادبیات

Ahmad Habib

اکادمی ادبیات پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

* * *

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

شمارے کا مصور

احمد حبیب کا تعلق قافلہ انسانیت کے اسی محدود گروہ سے ہے جو بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں اوراس کے اظہار کے لیے انھوں نے فنون لطیفہ کے کئی شعبوں کو چنا۔

آٹھ جنوری 1971 میں گوجرخان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد عمان سے آرٹ کی بنیادی تربیت حاصل کی۔ اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے عمان کا قومی ایوارڈ حاصل کیا اور پھر پاکستان آ کر اپنے فنی کیریئر کا آغاز کیا۔

احمد حبیب بنیادی طور پر بہت سے بولتے لوگوں کے درمیان کھڑا ایک خاموش انسان ہے جو اپنے اردگرد دیکھتا ہے، سنتا ہے اور محسوس کرتا ہے اور پھر اسی مشاہدے کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے مصوری، مجسمہ سازی، نظم، افسانہ اور ڈرامہ نگاری کے انداز میں واپس لوٹا دیتا ہے۔

پاکستان اور دیگر بہت سے ممالک میں احمد حبیب کے فن پاروں اور مجسموں کی 15 انفرادی اور تقریباً 50 سے زائد اجتماعی نمائشیں منعقد ہو چکی ہیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک مصور ہیں تاہم بطور شاعر بھی ان کی نثری نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے لکھنے کے ساتھ ساتھ اسٹیج ڈرامے کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی طرف سے انھیں کئی ایوارڈز سے نوازا گیا۔

(ادارہ)

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

شمارہ نمبر 113، جولائی تا ستمبر 2017

نگران : پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
مدیر منتظم : ڈاکٹر راشد حمید

مدیر : اختر رضا سلیمی

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ۔ ایٹ/ون، اسلام آباد

مجلسِ مشاورتِ متن

ڈاکٹر توصیف تبسم
ڈاکٹر اقبال آفاقی
محمد حمید شاہد
ڈاکٹر وحید احمد

ضروری گزارشات

☆ مجلے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے نگارشات کے ساتھ اپنا پورا نام اور پتہ بھی تحریر کریں۔

☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آرا کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔

☆ نگارشات اِن پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل بھیجی جا سکتی ہیں:

قیمت موجودہ شمارہ: -/100 روپے (اندرون ملک)   40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
سالانہ (4 شماروں کے لیے) -/400 روپے (اندرون ملک)   160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
(رسالہ اندرون ملک بذریعہ رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔
ڈاک خرچ ادارہ خود ادا کرتا ہے)

طباعت:	علی یاسر	051-9269712
سرکولیشن:	میر نواز سولنگی	051-9269711

مطبع: NUST پریس، سیکٹر H-12، اسلام آباد

ناشر

اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
رابطہ: 051-9269721، 051-9269714
Email: ar.saleemipal@gmail.com
Website: www.pal.gov.pk

فہرست

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو اداریہ 7

اِک نُور سے سو نُور بناتی ہوئی آنکھیں (عقیدت)

سرور حسین نقشبندی حمد پیرا ہے مری اشک فشانی مولیٰ 9

○

سعید اکرم اے کہ تُو والسما مقام، اے کہ تُو والضحیٰ جناب 10
قاضی حبیب الرحمٰن رہتا ہے کوئی نشہ سا موجود، ہوا میں 11

○

خورشید ربانی پہلے منزل اور سفر کا سپنا روشن ہو جاتا ہے 12

محسوس کرو تو مرے اشعار بہت ہیں (غزلیات)

انور شعور محبت کا نسخہ عجب مل گیا 13
سید نواب حیدر نقوی الم کشوں نے چھپایا ہے زخمِ دنیا بھی 14
طارق نعیم رہِ جنوں پہ ابھی تو قدم رکھا نہیں ہے 15
محبوب ظفر اس شہر میں شب خون کے آثار بہت ہیں 16
نجم الثاقب رسمِ زوالِ شب چلی شہرِ ہنر جلا دیا 17
اختر عثمان لیے پھروں نہ سبک سیری تمنا کو 18
رحمان حفیظ ہمارے حق میں کسی کے جفر رمل، کوئی نہیں 19
ارشد معراج گھماؤ ایسا بھی نہیں تھا کہ دکھایا جاتا 20
شہاب صفدر اگر ذرا انہیں ماحول پُر فضا دیتے 21
افضل مراد کل تک ہمارے ساتھ تھے سارے، چلے گئے 22
ناصرہ زبیری سب سے اونچی بولی کی تیاری ہونے والی ہے 23
شمشیر حیدر پہلے مسمار کرے پھر مری تعمیر کرے 24
اشفاق عامر بس اک نظر کہیں دیکھا تھا دیو داسی کو 25

پرویز ساحر	غمِ زمانہ سے رخصت کبھی ملی ہی نہیں	26
منیر فیاض	کون گلی کیسا دروازہ بھول گیا	27
نعمان فاروق	پانی سے کب پیاس بجھائی جا سکتی ہے	28
دلاور علی آذر	ممکن ہے کہ ملتے کوئی دم دونوں کنارے	29
یاسر اقبال	شام کی شاخ شکستۂ برقرار نغمہ ہے	30
عبیدالرحمٰن	کسی کے پاؤں کی رگڑ سے آگ سی لگی تو تھی، کدھر گئی	31
ذیشان مرتضیٰ	تھا خود سے دور کسی دشت میں پڑا ہوا میں	32
انجیل صحیفہ	فضا میں رنگ سے بکھرے ہیں چاندنی ہوئی ہے	33
سید قیس رضا	ہوا کو چیر کے اُس تک صدا اگر پہنچے	34

مجھے یہ نظم لکھنی ہے (نظمیں)

ڈاکٹر توصیف تبسم	سپردگی	35
نصیر احمد ناصر	وقت کی بوطیقا	36
علی محمد فرشی	مشینہ (۲)	37
ڈاکٹر سعادت سعید	آوازیں	39
آصف ہمایوں	اگلے جنم تک	43
ڈاکٹر نثار ترابی	آشنائی	45
اسرار ایوب	امکان	46
قاسم یعقوب	لامرکز کا معروضی تماشا	48
عمران ازفر	چاند کی کشتی	50
فیصل عظیم	سزاوار	51
ذاکر رحمان	ہوا اداسی میں ریت لگتی ہے	54
ذیشان حیدر نقوی	دیکھو سوا نہیں ہے	55
ثمامہ افق	جس میں چاندنی	56
سید سلمان ثروت	وطن کہانی	57
سروان سندھی	تپتے سورج جیسا شاعر!!!	59

قصہ سہانی شام کا۔۔۔۔(افسانے)

محمود احمد قاضی	باقر کی زندگی کا ایک دن	61
محمد الیاس	قضائے معلق	66

خالد فتح محمد	رنگ	70
عاطف علیم	طربیہ خداوندی جدید	79
ڈاکٹر احمد حسن رانجھا	پھیری والا چڑیا گھر	89
جمیل حیات	صوراسرافیل	94
محمد جمیل اختر	ایک الجھی ہوئی کہانی	100
معظمہ تنویر	کون؟	103
عثمان عالم	علامتی موت	108
سیمیں کرن	پچیس کلو کے ڈھائی سو	110
عطا الرحمٰن خاکی	منش، دھرم اور بدھ	115
محمد شعیب	زبان کاٹنے والے	124
نازیہ خلیل	مٹی کا سفر	128
حمزہ حیدر	حسِ مشترک	130
نیاز محمود	پیوند	133
وقار سپرا	قصہ حسرت	139

سفرنامہ

محمد عارف	کیہ جاناں میں کون؟	143

مرے لیے نذر کے کوئی موجِ استقبال (فکروفلسفہ)

ڈاکٹر اقبال آفاقی	کروچے: جمالیات کی تخلیقی فعلیت	149

خوشبو بھی ہم راز بنائی جا سکتی ہے (عالمی ادب سے تراجم)

موپساں/حمزہ حسن شیخ	چاندنی	165
ڈیزی ال امیر/اعظم ملک	ڈاکٹر کی پرچی	170
دینو بوزاتی/ر: خالد فرہاد	سات قاصد	172

تجھے ملا تو محبت سے آشنا ہوا میں (خصوصی گوشہ: کازواو اِشیگورو)

نجم الدین احمد	تعارف	177
کازواو اِشیگورو/نجم الدین احمد	خاندانی توشہ	179
کازواو اِشیگورو/نجم الدین احمد	مُطرب	191
کازواو اِشیگورو/نجم الدین احمد	تاریکی میں ڈوبی ہوئی بستی	214
کازواو اِشیگورو/نجم الدین احمد	جنگ کے بعد کا موسمِ گرما	227

مراسُخن بمرافن دوسروں کی خاطر ہے(پاکستانی زبانوں سے تراجم)

بلوچی

غنی پہوال/غنی پہوال مداوا 245

پشتو

سید شکیل احمد نایابؔ/ابراہیم رومانؔ قاتل ستارہ 246
ایاز اللہ ترکزے/ابراہیم رومانؔ میلا لباس 248

پنجابی

منیر احمد/سید شعیب نعیم کھوپے 250

سرائیکی

خرم بہاولپوری/سید ضیا ءالدین نعیم کیا کوئی بھی نہیں 252
غلام حسن حیدرانی/سلیم شہزاد خُدا 253
محمد ظہیر احمد/ضیا ءالدین نعیم خواب 259

سندھی

ادل سومرو/ادل سومرو جوگی نے کہا وہ آئے گا 260
سندھیا شاہ/سدرۃ المنتہیٰ جیلانی آوارہ گرد 262
بخش مہرانوی/فہیم شناس کاظمی روایت نہیں بدلتی 265

خصوصی گوشہ-گلگت بلتستان کی لوک کہانیاں

احمد سلیم سلیمی ہاشم بیگم 267
احمد سلیم سلیمی میون 289
احمد سلیم سلیمی راجہ ترا خان 310
احمد سلیم سلیمی کارگاہ بدھا-یچھنی 321

کشمیری

غلام حسن بٹ/غلام حسن بٹ چالاک چور، جاہل کسان 326

ہندکو

امتیاز الحق امتیاز/امتیاز الحق امتیاز خواب 328

☆☆☆☆

اداریہ

ادبیات کا تازہ شمارہ پیش خدمت ہے۔

اس سے قبل ہم نے ممتاز فکشن نگار انتظار حسین کے حوالے سے ایک ضخیم شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا، جسے آپ کی طرف سے بے حد سراہا گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم اس کے فوراً بعد ممتاز ناول نگار عبداللہ حسین پر ایک ضخیم شمارہ شائع کریں گے، لیکن اس نمبر کے لیے ابھی تک ہمیں جو مواد موصول ہوا، وہ کم ہے۔ ہم چاہیں گے کہ ان پر بھی ویسا ہی تاریخی نمبر شائع کیا جائے جیسا ہم نے انتظار حسین پر شائع کیا ہے۔ چوں کہ شمارہ لیٹ ہو رہا تھا اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک عام شمارہ مرتب کر لیا جائے۔ اگلا شمارہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نمبر ہوگا، جس پر کام تکمیل کے آخری مرحلے میں ہے۔

حسب روایت موجودہ شمارے میں بھی جہاں حمد، نعت، سلام، غزلیں، افسانے، دیگر اردو اصناف شامل ہیں: وہاں دیگر پاکستانی زبانوں: براہوی، بلوچی، پشتو، پوٹھوہاری، پنجابی، چھاچھی، سرائیکی، سندھی، کشمیری اور ہندکو کے ممتاز لکھنے والوں کی نگارشات کے تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں بین الاقوامی زبانوں سے تراجم بھی اس شمارے کا حصہ ہیں۔

اس شمارے کی ایک خاص بات دو خصوصی گوشے ہیں۔ پہلا گوشہ 2017 کے نوبیل انعام یافتہ ادیب کازواو اشیگورو کے حوالے سے ہے۔ جس میں ان کا مکمل تعارف اور ان کے کچھ منتخب افسانوں کے تراجم شامل اشاعت ہیں۔ جب کہ دوسرا گوشہ گلگت بلتستان کی لوک

کہانیوں کے حوالے سے مختص کیا گیا ہے۔ یہ کہانیاں پہلی مرتبہ اردو میں شائع ہورہی ہیں۔ جس سے ادبیات کے قارئین وہاں کی ثقافت اور معاشرت سے آگاہ ہوسکیں گے۔ ہماری کوشش ہوگئی کہ آئندہ بھی اسی نوعیت کے گوشے ادبیات میں مختص ہوتے رہیں تا کہ دوسری پاکستانی زبانوں کے ادب سے بھی ہر پاکستانی مستفید ہو سکے۔

امید ہے حسب سابق آپ کو یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔ ہمیں آپ کی رائے انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

سرور حسین نقشبندی

حمد پیرا ہے مری اشک فشانی مولیٰ
کھول دے مجھ پہ درِ حرف و معانی مولیٰ

صبح غنچے بھی دما دم تری تسبیح کریں
ذکر تیرا ہی کرے رات کی رانی مولیٰ

حمد کہتے ہوئے ہر آن یہ رہتا ہے خیال
حق ادا کیسے کرے بندہء فانی مولیٰ

سانس جس طرح ارادے کے بغیر آتے ہیں
تیری تسبیح میں ہو ایسی روانی مولیٰ

راس آتا ہے یہی طرز تکلم مجھ کو
حال دل کہتا ہوں اشکوں کی زبانی مولیٰ

جاتے جاتے ہو ترا ذکر زباں پر جاری
یوں خوش انجام ہو سرور کی کہانی مولیٰ

☆☆☆☆

سعید اکرم

اے کہ تُوؐ وَالسّما مقام، اے کہ تُوؐ والضُّحیٰ جناب
اے کہ تُوؐ شرحِ وَالقلم، اے کہ تُوؐ معنیِ کتاب

جب وہ حروفِ اَلعلَق تیرا مکالمہ بنے
نورِ حرا نے کر دیا، ظلمتِ شب کو بے نقاب

وقت ہے تیری خاکِ پا، کس نے یہ آج تک کہا
وقت ہے تیرا ہم قدم، وقت ہے تیرا ہم رکاب

کتنا کرم کہ تا ابد، تیری کریم ذات سے
سلسلہ ہائے روز و شب، ہوتے رہیں گے فیض یاب

عشق ترا جو لَو نہ دے، درد مرا جو ضَو نہ دے
جسم مرا فقط حباب، روح مری فقط سراب

دائرہ دائرہ ضوفشاں، پھیلتا پھیلتا آسماں
عالِم شش جہات سے ترا وہ آخری خطاب

گنبدِ سبز پر نظر، میرے نصیب اوج پر
ہو گئی میری زندگی، ترے حضور مُستجاب

☆☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

رہتا ہے کوئی نشہ سا موجود، ہَوا میں
بھر دیتا ہے چپکے سے جو تاثیر، دُعا میں
اے صلِ علیٰ--- قریۂ تہذیبِ محبت!
ثانی ہی نہیں جس کا کوئی، ہر دو سَرا میں
اک نُور سے سو نُور بناتی ہوئی صبحیں!
اک رنگ میں سو رنگ ملاتی ہوئی شامیں
کھنچتے چلتے آتے ہیں یہاں، عرشی و فرشی
کیا حُسنِ خداداد ہے، طیبہ کی فضا میں
اک شخص نے کیا سہل مِٹا ڈالا ہے، دیکھو!
اک بُعد جو تھا، خلقِ خدا اور خدا میں
اک ہاتھ میں تھامے ہوئے دل، غمزدگاں کے
اک ہاتھ میں ہیں، اشہبِ دوراں کی لگامیں
آقاؐ، ترے فیضان پہ کچھ ان کا بھی حق ہے
شامل ہیں یہ آنسو بھی، ترے بحرِ سخا میں
مدت سے ہے اُمت تری، آوارہ و بے حال
اک نام ہی کافی ہے تراؐ، رَدِّ بلا میں
خاکِ درِ محبوبؐ ہے--- معراجِ تمنا
کٹ جائے جو باقی ہے، ترے کُوئے وفا میں
اک کاہکشاں بنتی گئی--- حدِ نظر تک
جھانکا جو حبیبؔ، آئنۂ صلِ علیٰ میں

خورشید ربانی

سلام

پہلے منزل اور سفر کا سپنا روشن ہوجاتا ہے
پھر اک دیپ چمکتا ہے اور جادہ روشن ہوجاتا ہے

موجِ ہوا خود اپنی آگ میں جل بجھتی ہے اور جہاں میں
بیعت سے انکار پہ دیپک کیا کیا روشن ہوجاتا ہے

ایک مسافر چلتے چلتے کھو جاتا ہے راہ گزر میں
ایک مسافر کے قدموں سے رستہ روشن ہوجاتا ہے

تشنہ لبی ٹھکرا دیتی ہے دریا کو اور دو عالم پر
اک خالی مشکیزہ اور اک صحرا روشن ہو جاتا ہے

اک موسم میں پھول نہیں کھل سکتے باغوں کے منظر میں
اک موسم میں دشت کوئی گل زار سا روشن ہوجاتا ہے

جبر و جفا کے موسم نے گو لاکھ اندھیر مچا رکھا ہو
نخلِ وفا و صبر کا پتا پتا روشن ہو جاتا ہے

☆☆☆☆

انور شعور

محبت کا نسخہ عجب مل گیا
جو ہم چاہتے تھے وہ سب مل گیا

رفاقت کے موسم کی کیا بات ہے
ہمیں دورِ عیش و طرب مل گیا

نہیں مل سکا تھا جو ہر وقت وہ
خدا کی عنایت سے اب مل گیا

تعیّش ہماری ضرورت نہیں
یہ ساماں ہمیں بے سبب مل گیا

بھلا کیا، زمیں پر نچا کر ہمیں
تجھے گردشِ روز و شب مل گیا

نہیں تھے مرے دل کے محتاج وہ
یہ تحفہ اُنھیں بے طلب مل گیا

کوئی خواب تھا یا ملاقات تھی
نہ معلوم وہ ہم سے کب مل گیا

خرافات ہم چھوڑ دیں گے شعورؔ
اگر کوئی جینے کا ڈھب مل گیا

☆☆☆☆

سید نواب حیدر نقوی

الم کشوں نے چھپایا ہے زخمِ دنیا بھی
لبوں پہ ٹھہر گئی آن کر تمنا بھی

دل و نگاہ کو آ جائے گا قرار آخر
اتر ہی جائے گا بے تابیوں کا دریا بھی

سوائے مقتلِ صد آرزو اماں نہ ملی
لہو نے دیکھا ہے رہ کر بدن میں تنہا بھی

بس اور کیجیے کاوش فلاحِ انساں کی
تمام ختم ہوئے کارہائے بے جا بھی

اگر وہ بارگہِ حسن جگمگا دیتی
تو اپنی داستاں میں رات بھر سناتا بھی

ہے ڈر کہ ٹوٹ نہ جائے کہیں حصارِ خرد
نہ اپنی حد سے بڑھے شورشِ تمنا بھی

وفا کی راہ میں ایسے مقام آئے جہاں
قدم لرزتا ہے راہی بڑے بڑوں کا بھی

☆☆☆☆

طارق نعیم

رہِ جنوں پہ ابھی تو قدم رکھا نہیں ہے
یہ راستہ مجھے کہتا ہے راستہ نہیں ہے
گیا ہوا ہوں کسی اور آسمان پہ میں
زمیں تو کیا مرا خود سے بھی رابطہ نہیں ہے
عجیب شہر ہے باتوں سے جگمگاتا ہُوا
مگر کسی سے کسی کا مکالمہ نہیں ہے
میں کائنات کے بارے میں کیا بتاؤں تمھیں
مجھے تو ٹھیک سے اپنا بھی کچھ پتا نہیں ہے
وہ ہوگا اور کوئی جس سے تم ملے ہو گے
میاں یہ عشق ہے اس جیسا دوسرا نہیں ہے
میں اس جہاں کو الگ سے نئے خیال کے ساتھ
بنا رہا ہوں مگر مجھ سے بن رہا نہیں ہے
تمام رات دعاؤں کو ہاتھ اُٹھتے رہے
مگر جو معجزہ ہونا تھا وہ ہُوا نہیں ہے
بچھڑ تو جاؤں میں اُس سے تمھارے کہنے پر
قسم خدا کی بچھڑنے کا حوصلہ نہیں ہے
اُسے خبر ہے میں کیا کر رہا ہوں اُس کے خلاف
مگر وہ چُپ ہے مروّت میں بولتا نہیں ہے

محبوب ظفر

اس شہر میں شب خون کے آثار بہت ہیں
ہم جاگ رہے ہیں تو گنہ گار بہت ہیں

دشمن نے میری پشت پہ کیوں وار کیا ہے
یہ رسم نبھانے کو مرے یار بہت ہیں

کب تک میں دکھاتا رہوں زخموں کے دہانے
محسوس کرو تو مرے اشعار بہت ہیں

اس شہرِ ستم گار کی ویرانی کے سائے
دیوار پہ کم ہیں پسِ دیوار بہت ہیں

دل داریِ دل کے لیے کوئی نہیں محبوبؔ
کہنے کو تو اس شہر میں دل دار بہت ہیں

☆☆☆☆

نجم الثاقب

رسمِ زوالِ شب چلی شہرِ ہنر جلا دیا
قحطِ سحر کے خوف سے اپنا ہی گھر جلا دیا

غم کی طویل رات میں مہرِ وفائے عمر کو
اُس نے اُدھر بجھا دیا میں نے اِدھر جلا دیا

قصہ سہانی شام کا، صدمہ پرانی بات کا
آندھی کے ختم ہوتے ہی میں نے شجر جلا دیا

اپنی انا کے شور میں کیسا مقامِ جبر تھا
رستہ گداز کیا ہوا عزمِ سفر جلا دیا

ایسی مہیب رات تھی، ایسا ہراس تھا کہ بس
گھر کی منڈیر پہ دِیا میں نے مگر جلا دیا

☆☆☆☆

اختر عثمان

لیے پھروں نہ سبک سیریِ تمنا کو
میں توڑ پھوڑ دوں آئینۂ تماشا کو

متاعِ جاں کا عوض ہے حباب کی ہستی
سنبھالتا ہے صدف آپ موجِ دریا کو

پھٹے پہ دامنِ یوسف ابھی سلامت ہے
ہنر کا پاس نہیں حضرتِ زلیخا کو

معاملہ مری آوارگی سے کون کرے
یہ شہر کیسے رکھے گردبادِ صحرا کو

غبارِ راہ کو طاقت نہیں کہ اُٹھ بیٹھے
بس آتے جاتے ہوئے دیکھتا ہوں فردا کو

☆☆☆☆

رحمان حفیظ

ہمارے حق میں کسی کے جفر رمل، کوئی نئیں
جو اہلِ دل کے مسائل ہیں، ان کا حل کوئی نہیں

ہم اہلِ فکر و نظر جس میں جینا چاہتے ہیں
جہانِ گِل! تری تقویم میں وہ پَل کوئی نئیں

عجیب شہر میں میرا جنم ہوا ہے جہاں
بدی کا حل کوئی نئیں، نیکیوں کا پھل کوئی نئیں

نظر تو خیر نظارے پہ ہو گئی قانع
مگر خبر کی پریشانیوں کا حل کوئی نئیں

مِرے لیے نہ رکے کوئی موجِ استقبال
میں رزقِ لمحۂ حاضر ہوں، میرا کل کوئی نئیں

مرا سخن، مرا فن دوسروں کی خاطر ہے
درخت ہوں ، مِری قسمت میں اپنا پھل کوئی نئیں

میں آپ اپنے گلے لگ کے خود سے کہتا رہا
حفیظ! چل کوئی نئیں، اے حبیب چل کوئی نئیں

ارشد معراج

گھاؤ ایسا بھی نہیں تھا کہ دکھایا جاتا
درد سہنے کا بہت شور مچایا جاتا

بات ایسی بھی نہیں تھی کہ نکلتے آنسو
واقعہ ایسا نہیں تھا کہ بھلایا جاتا

میں نے ممنوعہ علاقے میں قدم رکھنا تھا
مری گردن کا اگر ناب بڑھایا جاتا

مری تہذیب نہیں تھی کہ اچھالوں پگڑی
ورنہ مشکل تو نہیں تھا کہ ستایا جاتا

ریل گاڑی میں ملا تھا سو اسے جانا تھا
ربط ایسا بھی نہیں تھا کہ نبھایا جاتا

منجمد کرتا کسی روز میں سورج کا جنوں
گر مجھے موم کی صورت نہ بنایا جاتا

دل کی اک سمت میں دروازہ بنانا تھا اگر
کھلی کھڑکی سے مجھے پہلے دکھایا جاتا

☆☆☆☆

شہاب صفدر

اگر ذرا انھیں ماحول پُر فضا دیتے
سلام کرتے پرندے ، شجر دعا دیتے

رہی ہے محو سفر ساتھ ساتھ یاد ان کی
جو بے نشاں ہوئے اوروں کو راستہ دیتے

کشادہ صحن کشادہ سواریاں تھیں مگر
وہ تنگ ذہن کے مالک کسی کو کیا دیتے

کہاں سے لاتے وہ بے فکر عمر کے موسم
بچھڑنے والوں کو حالات اگر ملا دیتے

اجاڑ گھر میں اکیلا سسک رہا تھا شہاب
اب اس کو کیا در و دیوار حوصلہ دیتے

☆☆☆☆

افضل مرآد

کل تک ہمارے ساتھ تھے سارے، چلے گئے
لمبے سفر پہ یار ہمارے چلے گئے

نا حق ہمارا خون نہ جائے دیار میں
وعدہ، ہمارے دل میں اتارے چلے گئے

کیسی گھڑی تھی کوئی سہارا نہ تھا وہاں
کیسی گھڑی تھی ہم کو پکارے چلے گئے

تاریخ اک رقم ہوئی ان کے لہو کے ساتھ
راہ وفا میں اشکوں کے دھارے چلے گئے

دشمن کے سامنے ہمیں ڈٹ کر نکلنا ہے
جذبہ نیا دلوں میں ابھارے چلے گئے

آنکھیں تلاش کرتی ہیں اب ان کا راستہ
صبح سفر کے ساتھ ہی تارے چلے گئے

چاہا تھا ہم نے چاہنے والوں کو روک لیں
کنجِ قفس میں درد کے مارے چلے گئے

☆☆☆☆

ناصرہ زبیری

سب سے اونچی بولی کی تیاری ہونے والی ہے
اک سرکاری بستی کی نجکاری ہونے والی ہے

یہ بھی ہم کو خوش خبری ہے ملنے والی خواب میں ہی
خوابیدہ سی قوم میں کچھ بیداری ہونے والی ہے

کام سے جانے والے ہیں سب تجھ کو دیکھنے والے لوگ
دل والوں کی دنیا میں بے کاری ہونے والی ہے

اُٹھ کر محفل سے تم جاؤ پہلے یا میں، کچھ بھی ہو
دونوں میں سے ایک کی دل آزاری ہونے والی ہے

دل نے پہلا زخم سہا اور جیسے تیسے جی بھی لیا
دنیا کی تلوار مگر دو دھاری ہونے والی ہے

سوچ رہے ہیں مالی مہکے باغوں کو اب بیچ ہی دیں
بڑھتے بڑھتے رونق یہ بازاری ہونے والی ہے

جنگی کاروبار ہے یہ سو اس نے ہے چلتے رہنا
اجڑے شہروں پر پھر سے بمباری ہونے والی ہے

پہلے تو تھی اور طرح کی مشکل خود سے ملنے میں
اور طرح کی لیکن اب دشواری ہونے والی ہے

☆☆☆☆

اشفاق عامر

بس اک نظر کہیں دیکھا تھا دیوداسی کو
چھپاتا پھرتا ہوں اب اپنی بدحواسی کو

یہ کس نے رنگِ جنوں خیز دیکھنے کے لیے
تمام شہر میں پھیلا دیا اداسی کو

عزیز ہے مجھے یوسف کا دامنِ صد چاک
فریب کہتا ہوں دنیا کی خوش لباسی کو

کہیں قریب ہی دریائے سرخوشی بھی تھا
پتا چلا نہ کبھی شہرِ غم کے باسی کو

تری تلاش میں سب رائیگاں تو جانا تھا
بچا لیا ہے مگر خوابِ خود شناسی کو

میں دیکھتا تھا ہوا کس نظر سے دیکھے گی
مرے چراغِ تمنا کی بے ہراسی کو

☆☆☆☆

شمشیر حیدر

پہلے مسمار کرے پھر مری تعمیر کرے
عشق چاہے تو مجھے خاک سے اکسیر کرے

کون ہر روز ترے ناز اٹھائے دنیا
کون ہر روز یہاں جینے کی تدبیر کرے

جس نے بخشی ہے مجھے دشت نوردی اب وہ
میرے لفظوں کو عطا درد کی تا ثیر کرے

عقل کہتی ہے بھلا دوں ترے عہد وپیماں
دل وہ نادان کہ تاخیر بہ تاخیر کرے

جس نے خودسے بھی محبت کو چھپائے رکھا
کیوں درختوں پہ کوئی نام وہ تحریر کرے

میں اسیری سے رہائی کی طرف آ جاؤں
شور اتنا تو مرے پاؤں کی زنجیر کرے

رائیگاں ڈھونڈتے پھرتے رہے ہم لوگ یہاں
ایسی خوشبو جو کسی گل سے بغل گیر کرے

بڑھ گئی ہے مری دیوار کی قدر و قیمت
اور اب کیا مرے حق میں تری تصویر کرے

پرویز ساحر

غمِ زمانہ سے رخصت کبھی ملی ہی نہیں
کہ میری خود سے کوئی گفتگو ہوئی ہی نہیں

مَیں اِس گلی سے اُٹھوں بھی تو اَور جاؤں کہاں؟
کہ اس گلی سی کوئی دوسری گلی ہی نہیں

بس ایک بار توجہ سے اُس کو دیکھا تھا
پھر اُس کے بعد توجہ مِری ہَٹی ہی نہیں

کئی دِنوں سے مری خامشی ہے رُوٹھی ہوئی
کئی دنوں سے مرے ساتھ بولتی ہی نہیں

کچھ اور بڑھ گئی، جینے کی آرزو مجھ میں
عجیب پیاس تھی جو زہر سے بُجھی ہی نہیں

مَیں کیا کسی پہ بھلا بھید کھولتا کوئی
کہ مجھ پہ خود مِرے دل کی گِرہ کھلی ہی نہیں

یہ تیرگی بھی حقیقت میں ایک روشنی ہے
یہ اور بات، ہمیں اس کی آگہی ہی نہیں

☆☆☆☆

منیر فیاض

کون گلی کیسا دروازہ بھول گیا
پھر میں اپنے گھر کا رستہ بھول گیا

اس چہرے پر اتنی سوچیں حیراں تھیں
دیکھنے والا کہنا سننا بھول گیا

آج آئینے میں اک چہرہ دیکھ کے میں
کیوں اک چہرہ دیکھا بھالا بھول گیا

تیرے دھیان کا دیپک جاگ اٹھا جب جب
میں آنگن میں دیے جلانا بھول گیا

جس کی چھاؤں میں تیرے میرے پھول کھلے
اس پیپل کا پتا پتا بھول گیا

تیرے ساتھ جو لمحے گزرے یاد رہے
باقی ساری بیتی بپتا بھول گیا

اس نے پلٹ پلٹ کر دیکھا جاتے ہوئے
میں ہی، آخری بار، بلانا بھول گیا

☆☆☆☆

نعمان فاروق

پانی سے کب پیاس بجھائی جا سکتی ہے
دریا کو یہ بات بتائی جا سکتی ہے

اُس کو لایا جا سکتا ہے جنگل میں
پیڑوں کی توقیر بڑھائی جا سکتی ہے

پھولوں سے ہی دل کی باتیں کیا کرنا
خوش بُو بھی ہم راز بنائی جا سکتی ہے

صحرا سے گر رشتہ ٹوٹ بھی جائے تو
اپنے اندر خاک اُڑائی جا سکتی ہے

کھول کے اک دن دل کے البم کو نعمانؔ
اُس کی یاد سے گرد ہٹائی جا سکتی ہے

☆☆☆☆

دلاور علی آذر

ممکن ہے کہ مِلتے کوئی دم دونوں کنارے
اِک موج کے محتاج تھے ہم دونوں کنارے

یوں آنکھ جھپکتا نہیں بہتا ہوا پانی
منظر میں نہ ہوجائیں بہم دونوں کنارے

آباد ہمیشہ ہی رہے گا یہ سمندر
رکھتے ہیں مچھیروں کا بھرم دونوں کنارے

تا عمر کسی موجہ خوش رو کی ہوس میں
بے دار رہے دم ہمہ دم دونوں کنارے

کھلتی ہے یہاں آ کے مِرے خواب کی وسعت
ہوتے ہیں مِری آنکھ میں ضم دونوں کنارے

یہ فاصلہ مٹی سے کبھی طے نہیں ہو گا
دریا کی ہیں وسعت پہ قسم دونوں کنارے

سب سیر کو نکلیں گے سرِ ساحلِ ہر خواب
سیاحوں کے چومیں گے قدم دونوں کنارے

کشتی کی طرح عمرِ خضر گیر ہے آذر!
ہستی کے ہیں موجود و عدم دونوں کنارے

☆☆☆☆

یاسر اقبال

شام کی شاخِ شکستہ، برقرارِ نغمہ ہے
مطلعِ خاموش سے اُتری قطارِ نغمہ ہے

لحن کھینچا یا کسی نے رنگ سینچا چار سُو
پردۂ پرداز پر نقش و نگارِ نغمہ ہے

آبشارِ خامشی ہے کوہساروں سے اُدھر
خاکساروں کے یہاں جو انتظارِ نغمہ ہے

تھرتھراتی سرسراتی سنسناتی ساعتو!
تھم رہو، اِس راستے پر شہسوارِ نغمہ ہے

رنگ سا یا راگ سا پہچانیو یہ باغ سا
ہُو کے عالم میں یہی پروردگارِ نغمہ ہے

شش جہت کے اِس چھتارے سے کشاکش ہی سہی
کہنے کو اِن انگلیوں کو اختیارِ نغمہ ہے

بجھنے والے اب بجھیں گے لرزشِ مستانہ سے
یعنی اِن افسردگاں کو اعتبارِ نغمہ ہے!

(نذرِ غالبؔ)

☆☆☆☆

عبیدالرحمٰن (نجمان)

کسی کے پاؤں کی رگڑ سے آگ سی لگی تو تھی ، کدھر گئی
نظر تو آئی تھی مجھے ذرا سی دیر روشنی ، کدھر گئی

میں اس کے لفظ لفظ کی بناوٹوں میں گم تھا جب ہوا چلی
جو میرے دل کی میز پر کتاب تھی کھلی ہوئی ، کدھر گئی

بس ایک موڑ کیا کٹا کہ واپسی کا راستہ ہی کھو گیا
میں ڈھونڈ ڈھونڈ تھک گیا یہیں تو تھی مری گلی، کدھر گئی

میں بھول آیا ہوں کہیں کہ چھین لے گیا کوئی ، خبر نہیں
جو میں نے رب سے پائی تھی مرے نصیب کی خوشی ، کدھر گئی

اداسیوں کے دشت نے تھکا دیا، بجھا دیا ، سلا دیا
وہ میری آنکھ میں جو تھی سمندروں سی تازگی ، کدھر گئی

☆☆☆☆

ذیشان مرتضیٰ

تھا خود سے دور کسی دشت میں پڑا ہوا میں
تجھے ملا تو محبت سے آشنا ہوا میں

نکل پڑا ہوں کسی بے نشان منزل کو
فنا کے دشت میں سائے کو ہانکتا ہوا میں

خود اپنے آپ کو رستے میں بھول آیا ہوں
تمھارے نقشِ کفِ پا کو ڈھونڈتا ہوا میں

تمھیں خبر بھی ہے کن جنگلوں میں جا نکلا
تمھارے بارے پرندوں سے پوچھتا ہوا میں

پھر ایک موڑ پہ آنکھوں سے ہاتھ دھو بیٹھا
کہ چل پڑا تھا یونہی خواب دیکھتا ہوا میں

☆☆☆☆

انجیل صحیفہ

فضا میں رنگ سے بکھرے ہیں چاندنی ہوئی ہے
کسی ستارے کی تتلی سے دوستی ہوئی ہے

مری تمام ریاضت کا ایک حاصل ہے
وہی دعا جو تیرے نام سے جڑی ہوئی ہے

میں حادثے سے نکل آئی ہوں مگر دیکھو
زمین اب بھی میرے جسم پر پڑی ہوئی ہے

میں تیرے لمس کے جادو سے خوب واقف ہوں
وہ شاخ ہوں جو تیرے ہاتھ پر ہری ہوئی ہے

میں لال رنگ لگاتی تھی نیلے خوابوں کو
اسی لیے تو یہ تعبیر کاسنی ہوئی ہے

وہ میرے بارے میں کیا سوچتا ہے کیا معلوم
خدا سے میری ملاقات سرسری ہوئی ہے

میں پچھلے سال کی تصویر بھیج دیتی تجھے
مگر یہ ایک طرف سے زرا جلی ہوئی ہے

مزا تو جب ہے کہ انجیلؔ ہی لگے سب کو
نزولِ عشق پہ جتنی بھی شاعری ہوئی ہے

سید قیس رضا

ہوا کو چیر کے اُس تک صدا اگر پہنچے
محال ہے کہ مدد کو نہ چارہ گر پہنچے

دیارِ عشق کو راہِ سناں پہ چلتے ہوئے
جہاں پہ جسم نہ پہنچے وہاں پہ سر پہنچے

ٹھکانا دور تھا اور سامنا ہوا کا بھی
پہنچ نہ پائے پرندے سو اُن کے پر پہنچے

ضعیف پیڑ نشانی تھا جو محبت کی
وہ کٹ چکا تھا مسافر جو لوٹ کر پہنچے

یہ ایک آہ محبت کی ترجمان نہیں
بہت طویل تھے قصے جو مختصر پہنچے

دعا بدست پسِ در تھی انتظار میں ماں
ہم ایک شب ذرہ تاخیر سے جو گھر پہنچے

پہنچ تو جاتی ہے ہربات، بات کا کیا ہے
مزہ تو جب ہے کہ اُس بات کا اثر پہنچے

☆☆☆☆

ڈاکٹر توصیف تبسم

سپردگی

ہمارے درمیاں
شیشے کی اک دیوار ہے
جسے ہم چھو تو سکتے ہیں
شکستہ کر نہیں سکتے!
تمھیں فرصت نہیں
آرائشِ رُخسار و گیسو سے
مجھے یہ نظم لکھنی ہے
ہمیں فرصت کہاں
اک دوسرے کو چھو سکیں
محسوس کر پائیں!
مگر وہ سامنے دیوار پر لمبی قطاروں میں
ہزاروں چیونٹیاں دیکھو!
ذرا سی دیر کو رُکتی ہیں
اک دوسرے کو چھو کے کچھ کہتی ہیں
پھر آگے گزرتی ہیں
جو تم سمجھو تو یہ منظر کنایہ ہے
وضاحت سے زیادہ ہے

☆☆☆☆

نصیر احمد ناصر

وقت کی بوطیقا

وقت کا اپنا کوئی وزن نہیں ہوتا
لیکن یہ جس کا ہو جائے اُسے بھاری کر دیتا ہے
اور جس کا نہ ہو اُسے بے وزن
وقت کی اپنی کوئی شکل بھی نہیں ہوتی
ہم ہی اس کا چہرہ ہیں
ہم ہی آنکھیں
اور ہم ہی اس کے پاؤں
لیکن کبھی کبھی یہ ہم سے آگے نکل جاتا ہے
یا ہم اس سے پیچھے رہ جاتے ہیں
متواتر اس کے ساتھ چلنا
دنیا کا مشکل ترین کام ہے
بعض لوگ وقت کو پہیے لگا لیتے ہیں یا پر
اور دوڑنا یا اُڑنا شروع کر دیتے ہیں
یہاں تک کہ وقت کی یا اُن کی اپنی حد ختم ہو جاتی ہے
وقت سدا دوڑ سکتا ہے نہ اُڑ سکتا ہے
اسے بس چلتے رہنے کے مَوڈ میں رکھا گیا ہے
اس کی اصل سائنس کیا ہے
اسے کب چلنا ہے
اور کب رک کر عظیم دائمی ٹھہراؤ کا حصہ بن جانا ہے
یہ کوئی نہیں جانتا

علی محمد فرشی

مشینہ (۲)

مجھے تیرے ریشم میں
سوتے ہوئے بیسواں سال تھا
جب اناروں سے نکلی ہوئی
سرخ چڑیوں نے مجھ کو جگایا:
‘‘جدائی کا دن آگیا ہے’’
مجھے جتنی آیات ازبر تھیں
اس روز کو ٹالنے کے لیے
ان میں اک بھی مرے لب پہ آئی نہیں
میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا
فلک سارا چمگادڑوں سے اٹا تھا
کئی سال پہلے کا دیکھا ہوا خواب
آج اپنی تعبیر کے سچ کی صورت
مرے سامنے تھا

مشینہ!
یہ دنیا تو میلہ ہے
جس میں اگر کوئی بچھڑے تو ملتا نہیں
پھر بھی جانے مجھے کیوں یقیں تھا
کہ تو ‘‘موج میلے’’ کی خاطر
مجھے موت کے اِس کنویں میں
گرا کر نہیں جائے گی

جس سے میں نے نکالا تھا تجھ کو!

مشینہ!
میں اپنی زباں سے کہوں نہ کہوں
کل زمانہ کہے گا
مشینہ سی سب عورتیں
ایک ہی جیسی ہوتی ہیں
جن کو سنہری چمک دھات کی
کھینچ لیتی ہے اپنی طرف

میں فقط ایک شاعر
جو لفظوں کو زندہ تو کر سکتا ہے
اُن پہ سونے کا پانی چڑھاتا نہیں

مجھ کو معلوم ہے
شاعری کے سمندر سے
جو سیپیاں لے کے آتا ہوں میں
اُن کے موتی
ترے ہنس چگتے نہیں

کب تلک خود فریبی کے مخمل میں
آسودہ رہتا، مشینہ!
حقیقت کے دریا کو
آخر مجھے پار کرنا ہی تھا
دل کے پیالے کو
تیری جدائی سے بھرنا ہی تھا

ڈاکٹر سعادت سعید

آوازیں

ذہن آوازوں کی اہمیت سے واقف ہے انھیں
اندھے خانوں میں سجا کر
زندگی سے مستقل رکھتا ہے ربط
شورشیں داخل کی ہوں
یا یورشیں خارج کی ہوں
عضویاتی ہاؤہو کے تاؤ ہوں
سب سے اس کا واسطہ پڑتا ہے پر
کھل کھلیاں چاہنے کے باوجود
صوفیوں کی مثل کر سکتا ہے ضبط

اس کی شخصیت سے ملتا ہے فقط
رسمیاتی کہنگی کو آسرا
شاذ و نادر ہی وہ چھم چھم ناچ سے
زعفراں زاری کو دیتا ہے ہوا
روبرو آئینۂ ایام کے
پارسائی کا بجا جاتا ہے ڈھول
دوسروں کا بے دریغ
کھولنے لگتا ہے پول

انتہاؤں کے سفیر!
دیکھ اپنے باطن کی دیوانگی

دوسروں کو پیر تسمہ پا نہ جان
مانگ ان سے خوش دھنک فرزانگی!

موردِ الزام ٹھہرے ہو تو پھر
اپنی عزلت آشنا کمزوریاں
بے جھجک تسلیمنا ہے کار خیر
مجھ کو اکساتا ہے مکاری کا شوق
تجھ کو لے ڈوبا ریاکاری کا شوق

جنس کا موضوع ہمارا رہنما
جسم کی منزل برہنہ خواہشیں
آنکھ ظالم کو نہیں پردے کا ذوق
رسمسائے ہاتھ ترسی سنگتیں
لب لبالب سرخ ہوتی رنگتیں
منکروں کو دیکھتا ہوں سجدہ ریز
مسجدوں سے لوٹ میخانے گئے

ڈوبتے سورج نے چوما
نیم روشن چاند کو
سرسراتے بستروں پہ
سوختہ تہذیب کی اندھی پڑی ہے

اے پریزاد تصور ناز کر
جسم کی حاجت لیے پرواز کر
اڑ رہی ہے راکھ پروانے گئے
حضرت سعدی ہمہ گیر غضب

ان کی شخصیت حکیمانہ بہت
گلستاں کی تازگی
اور بوستاں کی زندگی
عقل بنیادی شگفتہ ہوش و جوش
سرمدی افکار لفظوں میں خموش

(شورشیں داخل کی ہوں
یا یورشیں خارج کی ہوں
عضویاتی ہاؤہو کے تاؤ ہوں،
سب سے اس کا واسطہ پڑتا ہے پر
کھل کھلیاں چاہنے کے باوجود
صوفیوں کی مشق کر سکتا ہے ضبط)

اک حقائق آشنا کا خواب
میرا خواب ہے
اک مکمل آدمی کا خواب
تیرا خواب ہے

تو کلاسیکی نہیں
میں فرانسیسی نہیں
ایٹمی طاقت ہوں میں
ایٹمی طاقت ہے تو
اب لڑائی بھول جا
اپنی دھرتی کو ہمیشہ فتح کر

تو نے میرے بادشاہ

باغ سے توڑے ہیں سیب
اب تمھارے لشکری بھی
لوٹ لیں گے سارے باغ
سعدیا شیرازیا!

دیکھ اس مدفن کو دیکھ
اے وطن سازو کہاں ہو
کھو چکے تہذیب اپنی کھو چکے
فکر گم گشتہ کدھر ہے تیری کور!
نیم کے پیڑوں سے پیوندی کھجور
جن کی خاطر ملک کا نعرہ لگا
ان کی گہری قبر پر
مفلسی اور بھوک کا کتبہ لگا
ہم جہالت کے امیں
اے ادیبو شاعرو، قائدو! دانشورو!
ہم مراتب کے امیں، نا گفتہ بہ!

اندرونی تلخیاں،
خارجی بدمستیاں، چھیاں چھیاں!!
خطۂ سرسبز کے شب زار میں
اڑ رہی ہے راکھ، پروانوں کی راکھ
زندگی تاراج ہے چاروں طرف
الجھنیں حل ہو سکیں گی کب تلک؟
رات، سناٹا، مزارِ شاعرِ روشن ضمیر!!

☆☆☆☆

آصف ہمایوں

اگلے جنم تک

وہی سب گھاس والا قلعہ
اور اُس پر
ثابت قدمی سے چلتی ہوئی ہوا
کو اَب تھک سی گئی ہے
اور کوئی اُس کا ساتھ بھی نہیں دیتا
پرانا مکان بھی لاتعلق سا ہے
جس میں کوئی آمد و رفت نہیں
اُس کی ایک دیوار پر
مکان برائے فروخت کا اشتہار
اب بھی چسپاں ہے
دیواروں سے جھانکنے والی آنکھ
کہیں بھی نظر نہیں آتی
سہ پہروں کے پیڑوں کے سائے
جانے کس کے پیروں تلے سے گذر جاتے ہیں
مٹی میں ملا ہوا
پُرانے اخبار کا ٹکڑا
کبھی ہوا کی سازش سے

ہنس دیتا ہے
دروازوں اور کھڑکیوں کے پیچھے
شاید ابھی زنگ خوردہ غم باقی ہے
جس کے لبوں کی پھیکی مسکراہٹ
کبھی جب بے جان قہقہے میں بدلتی ہے
تو زندگی کا گماں ہوتا ہے

☆☆☆☆

ڈاکٹر نثار ترابی

آشنائی

تُو نے جس روز مجھے اذنِ حضوری بخشا
خواب تعبیر کا خوش رنگ لبادہ پہنے
میرے احساس کے آنگن میں اتر آئے تھے
تیری قربت سے ہر اک پَل میں اجالا پھیلا
دلِ بے تاب میں خوشبوئے محبت جاگی
اب تو کہتی ہے مری زیست کی اک اک دھڑکن
تجھ کو میں عمر کی ہر سانس میں شامل کر کے
اپنا ہم راز کروں، پیار کی آواز کروں

☆☆☆☆

اسرار ایوب

امکان

(کلائمیٹ چینج یا ایٹمی دھماکوں پر)

ممکن ہے پربت سے آتے بادل راہ بدل جائیں
ممکن ہے کہ اپنے سائے اپنی دھوپ میں جل جائیں
صدیوں کی خاموش مسافت ایک گھڑی کے پیچھے ہو
شہر کی ساری نقل مکانی ایک جھڑی کے پیچھے ہو
جیون بھر کی پیاس اشکوں کی ایک لڑی کے پیچھے ہو
ہو سکتا ہے قہر کی دھوپ بھری ہو ٹھنڈی چھاؤں میں
ہو سکتا ہے موت کی ممتا پوشیدہ ہو ماؤں میں
ہو سکتا ہے مہلک زہر گھلا ہو صاف ہواؤں میں
ہو سکتا ہے آگ بھڑک اُٹھے گھنگور گھٹاؤں میں
ہو سکتا ہے ہو تیزاب کی بارش اپنے گاؤں میں
ممکن ہے کہ دھوئیں کے بادل سُکھ کا سانس نگل جائیں
ممکن ہے اَن دیکھے ہاتھ ہمارے پھول مسل جائیں
ممکن ہے اک اشک میں اپنے سات سمندر ڈھل جائیں
ممکن ہے ہو جائیں موم چٹانیں سنگ پگھل جائیں
ہر رستہ ہر قافلہ اک مرجھائی کلی کے پیچھے ہو
آدم کا ہر ایک سفر اک بند گلی کے پیچھے ہو

ممکن ہے کہ اپنا یہ اندیشہ بھی ناممکن ہو
ممکن ہے کہ اس ہونی کا ہونا بھی ناممکن ہو
ممکن ہے غفلت کی نیند میں جاگتا سپنا ممکن ہو
ممکن ہے اس شب کے بیچوں بیچ سویرا ممکن ہو
ممکن ہے شاداب ہو دھرتی دشت میں دریا ممکن ہو
ممکن ہے تصویر میں گزرے وقت کا چہرہ ممکن ہو
ممکن ہے ادراک کے پنچھی صدیوں دور نکل جائیں
ممکن ہے جلتے صحرا میں سرد ہوائیں چل جائیں
ممکن ہے گرنے سے پہلے آدم زاد سنبھل جائیں

☆☆☆☆

قاسم یعقوب

لامرکز کا معروضی تماشا

میں اپنی آنکھ کے پردے پہ چاروں طرف پھیلے منظروں کو جمع کرتا ہوں
جو ریزہ ریزہ بکھرا ہے
اُسے معروض میں پھر جوڑتا ہوں
کوئی منظر نہیں بنتا
بس اک سورج کی گردش میرا استقبال کرتی ہے

بوڑھا سورج چہرے پر یرقان کا غازہ سجائے
مشرق و مغرب کے کہنہ راستوں پر چل رہا ہے
رات اور دن کا تبدّل ___
چاندنی کا مخملِ شب میں برہنہ رقص ____
اور سورج کی لُو کا فرغلِ بے رحم ____
لامرکز کا معروضی تماشا ہے

میں اپنے حال میں پھیلے تغیر کے تسلسل میں ہوں
یا اپنے ہی اندر بے توازن ہوں ____؟
یہ تہذیبی تصادم ہے
کہ طبقوں کی وہی بے کار، لا حاصل کہانی ____؟

میں کتنا کھوکھلا ہوں
دل دھڑکتا ہے تو میری ہڈیاں آپس میں بجتی ہیں
میں اپنے ذہن کو لا حاصلی کے کرب سے کیسے بچاؤں
کہاں جاؤں!
مرے ہاتھوں میں دنیا ہے مگر پاؤں میں رعشہ ____
میں بحرِ علم کا پیراک ہوں
لیکن مری پیشین کوئی میرے اندر اور بھی مشکوک ہوتی جا رہی ہے
مرے اشکوں میں تازہ دم مرے جذبے
مجھے کس سے بچانے آئے ہیں ___!
میں تو خود اپنی وار کی زد میں پڑا ہوں
فلسفوں، بے نام عقیدوں،
ماورائی طاقتوں سے بچتے
اپنے ہاتھ سے مرنے لگا ہوں

☆☆☆☆

عمران ازفر

چاند کی کشتی

رات کشتی پر سوار
تو غزالِ دشتِ شب
آگ میں لپٹی ہوئی اک موجِ آب
پانیوں کے دیس کی اُجلی کرن
چوکڑی مارے ہوئے، آسن جمائے
دیکھتی ہے آسماں کے بھید کو
کیا چھپا ہے چاند کی کشتی کی اوٹ
کیوں وہ بڑھیا کاتتی ہے انگلیوں کے پور پر!

کیا چھپا ہے
زندگی ہے؟
روشنی ہے؟
یا ہر اک سُو آگ ہے دہکی ہوئی؟

آنکھ نے کن حیرتوں کے نرم و نازک
ریشمی جسموں کو خود پہ اوڑھ رکھا ہے بتا!
اے غزالِ دشتِ شب!
دل گرفتہ! چاند کی کشتی میں
روز و شب کے پھیر میں کچھ سوچتی
تو غزالِ دشتِ شب!
پانیوں کے دیس کی اجلی کرن
آگ میں لپٹی ہوئی۔۔۔۔

فیصل عظیم

سزاوار

ماہِ کامل حیرت کی تصویر ہو جیسے
حدِّ چاہِ نخشب عالمگیر ہو جیسے
ہولی کے رنگوں کا دھوکہ
چہروں پر تحریر ہو جیسے
بھیگی رات میں آبِ شر انگیز کے مارے،
مست ستارے،
اپنی چالیں چوک رہے ہیں
دہلیزوں پر پگھلی شمعیں
نیلے بادل کے پردے میں اوجھل ہوتے
آنکھ کے تارے ڈھونڈ رہی ہیں
آئینوں سے نالاں، نقش سے عاری چہرے
جذبوں کے عقدوں میں الجھے
مورتیوں کی مالا جپتے
لال تلک میں آنکھ بنائے
کان میں حلقے ڈالے، گیروی بادل پہنے
شمعیں تھامے، چوب اٹھائے
یک رنگی دستاریں، جبّے، گنبد اوڑھے

صدیوں کی اندھی دیوار اُٹھائے،
بوڑھے اشک بہاتے
رقصِ وحشت کا زہراب پیے جاتے ہیں!
نابینائی کے پیغمبر
رنگ رچاتی
موت کی بولی بول رہے ہیں
چیخ رہے ہیں
”سب کے پیراہن کو دیکھو
چہرے دیکھو، آنکھیں دیکھو
دیکھو! سب ہاتھوں کو دیکھو
جس پر رنگ نظر آ جائے
جان سے جائے!“

لیکن ان کو کون بتائے!
سب کے ہاتھ رنگے ہیں،
سب کے دامن تر ہیں
آنکھیں خونیں ہیں، چہروں پر خوف لکھا ہے
لیکن بے نوری میں
سب تحریریں آنکھوں سے اوجھل ہیں

راہِ عدم پر نقش، قدم کے ڈھونڈنے والا

سایوں کی بہتات میں سہما
دہشت کی ہر تال پہ رقصاں
سوچ رہا ہے
وقت کے پیروں کو دلدل سے کون نکالے
شب کی اوٹ سے جلتا سورج
اپنے سر پر کون اٹھائے
رنگوں کی بوچھار میں جانے
کس چہرے پر
کس کو رنگ نظر آ جائے
دیو کا سایہ اگلے پل کس کو کھا جائے
کیا معلوم
کہ میری باری کب آ جائے

☆☆☆☆

ذاکر رحمان

ہوا اُداسی میں ریت لگتی ہے

ہوا اُداسی میں ریت لگتی ہے
گلاب اپنے لہو کی چادر میں کانپتا ہے
کجل غزالوں کے نیم وا شربتی لبوں پر
کوئی بھی حرفِ وفا نہیں ہے
یہ وقت
رخشِ بدن دریدہ ہے
جو کہ خود ایک اور وقتِ بدن دریدہ میں سانس لیتا ہے
ہانپتا ہے
سڑک کے سینے پہ رات دن دوڑتی
گاڑیوں کے ٹائر
چپک بھی جائیں تو کیا عجب ہے
کہ فاصلوں کی مہیب وحشت
تو اپنے بالوں سے ناخنوں تک
بدن کے اندر اتر چکی ہے
ہوا اُداسی میں رینگتی تھی
اور اب اُداسی بھی مر چکی ہے

☆☆☆☆

ذیشان حیدر نقوی

دیکھ سونا نہیں ہے

دیکھ سونا نہیں----
آج کی رات کا آخری خواب ہے----
دیکھ لیں----جاگ لیں
اس نے پھر دوسری بار ہونا نہیں----
دیکھ سونا نہیں

دیکھ رونا نہیں
وہ جو پریاں----تری نیند کے بس میں تھیں
ان کا گھر آ گیا
ایک بادل کا سایہ اچانک تری آنکھ سے ہو کے سیدھا اِدھر آ گیا----
یار----شونا----نہیں!!!
دیکھ رونا نہیں----!!
دیکھ کھونا نہیں
گم شدہ----موسموں----کی یہ تسبیح کرتے ہوئے خال وخد
جلتی بجھتی ہوئی آگ کو ناپتے ہاتھ کی اپنی حد
اس تماشے پہ رُکنا تو بنتا ہے پر
اس میں ہونا نہیں----!!!!
دیکھ کھونا نہیں

☆☆☆☆

شامہ افق

حبس میں چاندنی

جیسے بوڑھی حسینہ کی ہو آرزو
اُس کی خاطر کوئی اب بھی غزلیں لکھے
اُس کی میلی لٹوں کو کوئی
کاکلِ مشک افزا پڑھے
اُس کے شکنوں سے بھرپور چہرے کو بھی
اُس کا جوبن کہے
اس کی پتھرائی آنکھوں کو جیسے غزالیں لکھے

اس کے انکار پر پھر سے تکرار ہو
اُس سے اب بھی کسی کو وہی پیار ہو
اُس کی باتوں کو پھر سے کوئی ایک فرہنگ دے
اک نیا رنگ دے۔۔

ایسے ہی رات مُجھ کو لگی۔۔
حبس میں چاندنی۔۔

☆☆☆☆

سید سلمان ثروت

وطن کہانی

کوئے وارفتگی میں ستم گر ہواؤں کے جھکڑ چلے
ہر طرف رقص کرتے ہوئے
جبر کے مست وحشی بگولے اُٹھے
ہر شجر، ہر عمارت کی جڑ ہل گئی
زندگی دھول میں مل گئی
اب کھنڈر ہیں جہاں پر بسیرا ہے آسیب کا
یہ جو آسیب ہے/اس کے سو روپ ہیں
یہ کسی روپ میں
پگ سجائے ہوئے، چوب تھامے ہوئے ہے
کسی روپ میں بوٹ پہنے ہوئے ہے
کبھی ایک فربہ جسامت کا سؤر
ہوس کی غلاظت میں لتھڑا ہوا
اور کبھی یہ مُقدس صحیفے بغل میں دبائے
موت اوڑھے ہوئے
ایک باریش پرچھائیں ہے
یہ جو آسیب ہے/اپنے ہر روپ میں
خوف کی داستاں، ظلم کی انتہا ہے
مگر ڈھونڈتا پھر رہا ہے
کہ یہ زندگی ہے کہاں
وہ ڈرائے کسے

خوف کے قہقہے وہ سنائے کسے
کوئی سامان ہو اُس کی تسکین کا
زندگی ہے کہاں
زندگی! زندگی، وہ تو ملبے تلے دب چکی
اپنا دم کھو چکی، جاں بلب ہو چکی
آہ بھرتی ہوئی، درد سہتی ہوئی
سسکیوں میں بلکتی ہوئی زندگی
ہائے افسوس! اُن سسکیوں کی صدا
سُن لی آسیب نے/پھر وہ آسیب ملبہ ہٹانے لگا
جو گرے تھے شجر

اور وہ دیوار و در
سب اُٹھانے لگا
اپنے ہاتھوں سے وہ زندگی تھپتھپانے لگا
کیا غضب ہو گیا
زندگی ہوش میں آ گئی
زخم خوردہ تو تھی/اب ہراساں بھی ہے
کوئے وارفتگی

جو کہ بدحال تھا
اب کے ویراں بھی ہے
اور وہ آسیب ہے
جو کہ خونخوار تھا/ایک آزار تھا
اب کے سرخیل ہے
اور مقدس بھی ہے

سروان سندھی

تپتے سورج جیسا شاعر!!!

(فیض احمد فیض کو ٹریبوٹ)

وہ تو تپتے سورج جیسا شاعر تھا
جس کی نظمیں بارش بوندیں
غزلیں دن میں تاروں جیسی
ساری باتیں بھول گیا وہ
خاموشی سے جھول گیا وہ
جس کی خاطر بارش لوٹے
لگتا ہے کہ رونے آئے
میں بھی ایسے ہی رویا تھا
اس کی کوتا پڑھتے پڑھتے
جانے کیوں یہ آنکھیں بادل بنتی ہیں
ہر آنسو کیوں قطرہ قطرہ لگتا ہے
میرا گھر تو دور تھا اس کی بستی سے
پھر بھی ایسے لگتا ہے کہ
اک ہی آنگن میں ٹھیرے ہیں
شاید صحراؤں میں چلتے

تھوڑا وقت گذارہ ہوگا
اب تو وہ آواز کہاں پر دیتا ہے
خاموشی سے تکتا تکتا رہتا ہے؟
میں اس سے یہ پوچھ رہا ہوں
کب لوٹو گے واپس آخر
تیرے گھر کی دیواریں بھی
اکثر کہتی رہتی ہیں کہ
کب کرسی پر آ بیٹھو گے
اپنا کوئی گیت کہو گے
تپتے سورج جیسا شاعر

☆☆☆☆

محمود احمد قاضی

باقر کی زندگی کا ایک دن

ہر روز ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ آفس پہنچتا ہے، اپنی سیٹ سنبھالتا ہے تو صاحب کا نائب قاصد آ دھمکتا ہے۔

سر جی، آپ کو بلا رہے ہیں۔

وہ بےدلی سے مسکراتا ہے، اسے پتہ ہے یہ روٹین کی پیشی ہے۔ وہ متوقع تند و تیز جملوں، جملوں اور طنزوں کا کسی حد تک مناسب جواب دینے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگتا ہے۔

صاحب، حسبِ معمول اپنی گھومنے والی کرسی کی ایک سمت میں جھکا کچھ نہ کرتے ہوئے بھی مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ جانتا ہے وہ ایک منجھا ہوا اداکار ہے اس لیے ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے سامنے اس کی دال نہیں گلے گی۔ صاحب اس کی آہٹ پا چکا ہے لیکن جان بوجھ کر اس کی موجودگی سے بےخبر رہنے کا بہانا کرتا ہے۔ وہ اپنے سامنے پڑے کاغذوں کو اٹھا کر ایک طرف کھسکا دیتا ہے۔ بائنڈرز کو اپنے سامنے رکھ لیتا ہے۔ قریب رکھی ایک فائل کے تسمے کو کھولنے کی کوشش میں پھر سے پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی سے بند کر دیتا ہے۔ صاحب اس کی طرف دیکھنے کی بجائے سامنے والی دیوار کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ وہ میز پر پڑی خوب صورت اور نازک سی پلاسٹک کی بنی جدید برقی گھنٹی کا بٹن ہلکے سے دباتا ہے۔

نائب قاصد آتا ہے۔

نذیر، تم لحہ بہ لحہ نکمے ہوتے جا رہے ہو۔ یہ گرد دیکھو، یہ فائلیں، ہر چیز، یہ سب کیا ہے؟

سر جی!

سر جی کا بچہ! اب تم اپنی پرانی بہانہ بازی کرو گے۔

اسے پتہ ہے یہ سب کچھ تمہید ہے اس پر چڑھائی کرنے کی تیاری ہے۔

صاحب، ایک دم پہلو بدلتا ہے۔

اور تم، تم کیا اپنا بولوتھا اٹھائے کھڑے ہو۔ میں نے تمھیں کل کہا تھا کہ یہ ڈرافٹ مکمل کر کے اور کمپوز کروا کے جانا ہے۔ تم نے آخر میں لکھا:

آ گے تم نے ایک لفظ لکھنا تھا یعنی Part۔ وہ تم شاید اس لیے لکھے بغیر چلے گئے کہ گھڑی نے عین اس وقت ساڑھے تین بجا دیے ہوں گے۔ تمھیں چوں کہ زعم ہے کہ اس دفتر میں تم ہی ایک ایسے فرد ہو جو ڈیوٹی فل اور پنکچوئل ہو۔ تم صبح ساڑھے آٹھ بجے آتے ہو اس لیے تمھارا حق ہے کہ تم واپسی پر پورے ساڑھے تین بجے یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ چاہے ڈرافٹ کا آخری لفظ ہی تمھیں کیوں نہ لکھنا ہو۔

وجہ یہ نہیں تھی۔ وہ کہتا ہے

تو کیا وجہ تھی جناب باقر صاحب!

وہ چپ رہتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہاں کچھ بھی کہنے، کوئی دلیل دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔

صاحب پھنکارتا ہے۔

کل ایک بج کر سترہ منٹ پر جب میں نے تمھارے سیکشن کا دروازہ کھول کر دیکھا تو اس وقت تم انگڑائی لیتے ہوئے ستا رہے تھے۔ تمھاری میز پر ایک کنو اور نمک والی پڑیا رکھی نظر آ رہی تھی۔ وہاں سب ہنس رہے تھے شاید کسی نے اپنے لطیفوں والی پٹاری کھولی ہوئی تھی۔

اسے پتہ ہے صاحب جب سٹارٹ ہوتا ہے تو پھر رکنے کا نام نہیں لیتا۔ صاحب اپنی گن گرج کے درمیان وقفہ لیتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ پھر اسے قریب بلا کر آہستہ سے کہتا ہے۔ گھر میں فون کر کے پتہ کرو کہ وہاں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ اگر ہے تو کسی کو ادھر بھیج دو۔

وہ اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ اس کے صاحب کے پاس آج کی جھڑکوں کے لیے جتنا سٹاک تھا وہ ختم ہو چکا ہے یا ختم ہونے کو ہے۔ آخر میں وہ ہمیشہ کی طرح ''دفعہ ہو جاؤ'' جیسا جملہ سننے کے لیے خود کو تیار پاتا ہے۔ جب وہ جانے کے لیے مڑ رہا ہوتا ہے تو اسے سننے کو ملتا ہے۔ ''آئندہ اگر ایسا ہوا تو تمھیں اس کے نتائج بھگتنا ہوں گے۔'' وہ سنی ان سنی کرتا ہوا اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے کوریڈور میں آ جاتا ہے۔ وہاں لحہ بھر کے لیے رک کر وہ چند لمبے لمبے سانس لیتا ہے تا کہ اپنے اوسان کو بحال کر سکے۔ اس عمل سے اسے ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے کہ چند لمحے پہلے جو چیزیں اسے تیزی سے گھومتی دکھائی دے رہی ہوتی ہیں وہ آہستہ آہستہ اپنی جگہوں پر آنا شروع ہو جاتی ہیں اور ایسی ایکسر سائز کا دوسرا مفید نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آتے ہی اپنا سارا غصہ سٹاف پر اتارنے سے بچ جاتا ہے۔ وہ اپنی سیٹ پر پہنچ کر تھوڑی دیر کے لیے ست سا دکھائی دیتا ہے۔ پھر کہتا ہے! ''آؤ بھئی کام شروع کریں۔''

یہ ایک Vicious سرکل ہے جس میں وہ گھوم رہا ہے۔ گھومے جا رہا ہے۔

۲

وہ سٹاف بس میں سوار ہوتا ہے۔ وہ حسبِ معمول سنٹرل پوائنٹ پر اترتا ہے۔ وہ بازار کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اسے گھر کے لیے کچھ سودا سلف لینا ہے۔ سبزی، مرغے کا گوشت، والد کے لیے تنگ خانوں کے ڈیزائن والی اسٹیپل کی دھوتی، اپنے لیے شوگر کی گولیاں، بیوی کے لیے باریک دندانوں والی کنگھی، ایک درجن کیلے۔ وہ یہ سارا کچھ لے کر اپنے مخصوص چائے خانے میں آ بیٹھتا ہے۔ یہاں اس کے چند دوست ابھی آنے والے ہیں۔ یہ ان کا پسندیدہ میٹنگ سپاٹ ہے۔ یہاں وہ اپنی دن بھر کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ بدزبانی کرتے ہیں۔ وہ جن کو اُن کے سامنے گالی نہیں دے سکتے، یہاں بیٹھ کر آسانی اور آرام سے ان کے خلاف بکتے چلے جاتے ہیں۔ یہ جگہ ان کی سیف ہیون ہے، کچھار ہے۔ ابھی ان لوگوں کے آنے میں دیر ہے۔ اس لیے وہ جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالتا ہے۔ پھر قمیص کی سائیڈ پاکٹ سے کالی سیاہی والا (اسے کالی سیاہی پسند ہے) بال پوائنٹ نکالتا ہے۔ وہ خریدی گئی اشیا کے نرخ لکھتا ہے۔ ایک بار، دوبار ان کی تعداد اور نرخوں کو چیک کرنے کے بعد وہ ٹوٹل کرتا ہے۔ وہ متفکر ہے۔ کافی پیسے خرچ ہو گئے ہیں۔ ابھی مہینہ ختم ہونے میں چند دن باقی ہیں۔ کوئی بھی اَن ہوا خرچ کسی بھی ضرورت کی بغل سے اپنا سر ابھار سکتا ہے۔ اس لیے احتیاط لازمی ہے۔ وہ دوستوں کے آنے سے پہلے اکثر اپنے لیے چائے کی پیالی منگوا لیا کرتا ہے۔ بعد میں ان کے ساتھ مل کر بھی ایک پیالی پیتا ہے لیکن آج نہیں کہ اس کے حساب سے اس نے آج کچھ زیادہ ہی خرچہ کر دیا ہے۔ دوستوں میں طے ہے کہ خرچ اپنا اپنا۔ اس لیے وہ ایک دوسرے پر بوجھ نہیں بنتے۔ وہ زبردستی کی جماہی لیتا ہے اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر چائے خانے میں آڈیو کیسٹ پر چلتے زبیدہ خانم کے ایک پرانے مدھر گیت کو سنتا ہے۔ ”میری چنی دیاں ریشمی تنداں۔“ وہ آگے پیچھے خواہ مخواہ جھومنے لگتا ہے۔ چائے خانہ لوگوں کی کائیں کائیں اور سگریٹوں کے دھوئیں سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ اتنے میں وہ آ جاتے ہیں۔ سناؤ بھئی، آج کی تازہ ترین کڑوی کسیلی خبریں۔ دفتر کے پھیکے چٹکلے اور بیوی سے ڈرنے والے اپنے باس کی بدتمیزیوں پر مبنی واقعات۔ ”وہی ہے چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔“ وہ زاری سے کہتا ہے اور کرسیوں اور میزوں کے درمیان موجود جھریوں کی طرح کی چھوٹی چھوٹی تنگ درزوں اور جگہوں میں پتہ نہیں کیا ڈھونڈنے لگتا ہے۔ ان میں سے ایک بولتا ہے...... پھر دوسرا...... پھر تیسرا...... پھر چل سو چل وہ سارے اپنی باتوں کا چرخہ گھمانے لگتے ہیں۔ وہ خوش رہتے ہوئے غمگین ہوتے رہتے ہیں اور غمگین ہوتے ہوئے خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے شور زیادہ ہوتا ہے، پھر ان کی آوازیں روں روں جیسی آواز میں بدلنے لگتی ہیں۔ آخر میں پتہ نہیں کیوں ہر روز کی طرح ان کی باتوں سے رونے جیسی صدا بلند ہونے لگتی ہے۔ وہ ایک ایک کر کے اٹھنے لگتے ہیں۔ سارا دن، انھوں نے

اپنے حصے کا جتنا لوہا کوٹنا تھا، کوٹ لیا ہے۔ سو اب وہ اپنے گھروں کی طرف لوٹنے کا قصہ کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اپنے آج کا سارا زہر اور غصہ اپنی میز پر انڈیل چکے ہیں۔ اس لیے اب وہ بالکل خالی ہو کر چائے خانے سے نکلتے ہیں۔ یہاں سے ان کی منزلیں اور سمتیں جدا ہو جاتی ہیں۔ کوئی اِدھر جاتا ہے تو دوسرا اُدھر۔ وہ چائے خانے سے نکلنے سے پہلے کاؤنٹر پر اپنے حصے کی ادائیگی کر چکے ہیں۔ ان کی آج کی تفریح کا کھاتا بند ہوتا ہے۔ آنے والے کل کو ایک بار پھر ان کی کھال کے نیچے سے اسی پرانے آدم کو طلوع ہونا ہے۔

وہ اپنے ان دیرینہ واقف کاروں کے جھرمٹ سے جدا ہو کر ویگن سٹاپ تک آتا ہے۔ وہ ایک سیٹ خالی پا کر وہاں بیٹھ جاتا ہے اور سودے والے شاپر اپنی گود میں رکھ لیتا ہے۔ وہ اطمینان بھرا سانس لیتا ہے۔ وہ آج ویگن میں دہرا ہو کر کھڑے رہنے کی اذیت سے بچ گیا ہے۔

۳

کال بیل کی آواز سن کر اس کے دونوں بچے آ کر دروازہ کھول دیتے ہیں۔ دونوں لپک کر کیلوں کی طرف جھپٹتے ہیں۔ اندر سے آواز آتی ہے۔

ارے ناہنجارو...... دم تو لو...... باپ کو اندر تو آ لینے دو۔ چیز تم سے چھینی تو نہیں جا رہی۔

وہ آ کر بڑے کمرے میں پڑے سالخوردہ صوفے کی اڑی ہوئی رنگت والے کور پر دیکھ بھال کے انداز میں بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی اضطراری حرکات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس گھر کا میزبان نہیں بلکہ ایک اجنبی بندہ ہے جیسے یہاں کے ماحول میں روح بس جانے میں ابھی کچھ وقت لگ سکتا ہے۔ چند لمحوں تک ایک ہی جگہ پر ساکت رہنے کے بعد وہ ایک دم اچھل جاتا ہے جیسے کوئی ضروری کام اس سے ہونے سے رہ گیا ہو۔ وہ والدین کے کمرے میں جاتا ہے۔ انھیں سلام کرتا ہے، ان کا پیار لیتا ہے۔ ان کا حال احوال پوچھ کر وہ پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھتا ہے۔

بیوی دوپٹے سے اپنے گیلے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس کے سر پر آ کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ شاپروں کو ٹٹولنے لگتی ہے۔ آج پھر آپ ننھے کی خارش کی دوا نہیں لائے۔

ہاں...... وہ...... میں۔ وہ بوکھلا جاتا ہے۔

ایک تو آپ بھولتے بہت ہیں۔ جو چیز ضروری ہوتی ہے وہ ضروری ہی ہوتی ہے۔

آتے ہی شکایتوں کی بوچھاڑ، نوکیلے سوالات۔

وہ کپڑے بدل کر آتا ہے۔

میں کون ہوں۔ یہ سوال وہ اپنے آپ سے دس ہزار سے زیادہ مرتبہ کر چکا ہے۔

میں ایک...... ہوں۔ وقت کا ٹائم پاس ٹائپ کرتا ہے۔

ہمیشہ کی طرح فل ان دی بلینک والا سوال اس سے حل نہیں ہوتا ۔ شام ہو جاتی ہے وہ بچوں کا ہوم ورک دیکھتا ہے ۔ مناسب تصیح کرتا ہے ۔ بعض جگہوں پر وہ ان کی غلطیوں پر انھیں جھڑکتا بھی ہے ۔ وہ آگے سے منہ بسورنے لگتے ہیں ۔ اسے ان پر پیار آ جاتا ہے ۔ وہ انھیں اپنے ساتھ لگا لیتا ہے ۔ ان کے ماتھے کو چومتا ہے ۔ روز ہی وہ اپنی ایسی غلطیوں پر نادم ہوتا ہے ۔ لیکن غلطی کو پھر دہراتا ہے ۔ وہ کل بھی اسے دہرائے گا ۔ بندہ بشر جو ہوا ۔ بعض اوقات وہ مسکرا کر خود سے کہتا ہے ۔

میں ایک آدمی ہوں ۔

نہیں میں الو کا بیٹا ہوں ۔

کئی بار وہ اپنے سے کیے گئے ایسے سوال و جواب کے نتیجے میں ہنسنے بھی لگتا ہے ۔ قریب سے گزرتی بیوی اسے احمقوں کی طرح تکنے لگی ہے بلکہ شاید اسے ایک احمق سمجھ بیٹھی ہے ۔

رات اتر آتی ہے ۔ یہ کھانا کھانے کا وقت ہے ۔ گھر والی نے مرغی کا گوشت کسی مناسب وقت یا کسی مہمان کے لیے رکھ چھوڑا ہے ۔ آج گھر میں آلو گوبھی کا سالن پکا ہے ۔ وہ سب کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔

''سالن میں نمک اور مرچ بالکل ہی نہیں ۔ یہ سالن ہے یا صابن'' اس کا والد بولتا ہے ۔ مدتوں سے اس کے والد کی یہ تکرار جاری ہے حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ ڈاکٹر نے اسے ان دونوں چیزوں سے پرہیز کا کہا ہوا ہے ۔ اس کی اماں اپنے پوپلے منہ سے نوالہ آہستہ سے چبائے جاتی ہے ۔ وہ عموماً خاموش رہنے والی، ایک صلح جو مخلوق ہے ۔ ایک بچہ دوسرے کا آلو چرا کر اپنی رکابی میں رکھ لیتا ہے ۔ دونوں جھگڑنے لگتے ہیں ۔ وہ اس سارے ماحول سے بے خبر اپنی بیوی کے لاتعلق چہرے کی طرف دیکھے جاتا ہے ۔ والدین اس کی طرف شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ اسے ہمیشہ ان کی نظروں میں اپنے لیے ایک شک ہی دکھتا ہے ۔

رات گئے گھر کے کاموں سے فرصت پا کر بیوی اس کے قریب آ کر بیٹھ جاتی ہے اور اپنے منہ سے ایک درد بھری ہائے کی آواز نکالتی ہے ۔ وہ اسے جتاتی ہے، وہ تھک گئی ہے ۔ کیا وہ گدھی ہے؟ وہ خود بھی تو ایک بوجھ اٹھانے والا جانور ہی ہے ۔ اسے نیند آ رہی ہے ۔ اسے نیند میں خواب نظر نہیں آتے ۔ وہ ان کو دن میں ہی دیکھ لیتا ہے ۔ وہ خراٹے لینے لگتا ہے ۔ بیوی ناگواری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کروٹ لے لیتی ہے ۔ اس نے ہمیشہ اس بندے کو اپنے لیے ناقابل برداشت ہی پایا ہے ۔ وہ خود کو کوستی ہوئی آنسو بہانے لگتی ہے ۔ روتے روتے اسے کچھ خیال آتا ہے اور وہ اٹھ بیٹھتی ہے ۔ وہ اس ناپسندیدہ شخص کو چادر اوڑھا دیتی ہے ۔

۴

باقر کے گھر میں ایک اور صبح ہو چکی ہے ۔ یہ پچھلی تمام صبحوں کی ہی کاربن کاپی ہے ۔

محمد الیاس

قضائے معلق

”نہ میری بچی! پیٹ کی بُھوک کے ساتھ اِس بُھوک کا مقابلہ نہ کرو۔ انسان اپنے آپ سے کبھی جھوٹ نہ بولے۔ سترھواں سال ابھی لگا ہی تھا کہ میری شادی ہوگئی۔ تیرے دادا پچھلے سال اِنھی دِنوں اللہ کو پیارے ہوئے۔ اُنہتر سال دو مہینے اور چودہ دن ہم میاں بیوی نے ایک ساتھ گزارے۔ اللہ کو جان دینی ہے، جھوٹ نہ بولوں گی۔ عورت کا بھی اُسی طرح دل چاہتا ہے، جیسے مرد کا۔۔۔ ہاں! مجبوری میں شرم والی نیک پاک عورت اپنے دل کو سمجھا لے، بہلا لے اور صبر کر لے تو وہ اور بات ہے۔ مگر شادی شدہ عورت اپنے مرد کو کبھی نہ چھوڑے۔ اللہ نے یہ سلسلہ اسی طرح بنایا ہے، اس میں بندے کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اور سچی بات، زندگی کا مزہ اسی میں ہے۔ روٹی کپڑا روپیا پیسا گھر بار اور مال اسباب اپنی جگہ ضروری ہیں۔ لیکن انھیں میاں بیوی والے معاملے کے ساتھ نہ ملاؤ۔۔۔“

ذرا سا توقف کر کے بزرگ خاتون دوبارہ بولنے لگی:

”حرام حلال میں تمیز کرنے والی ہم خاندانی عورتوں کو اپنے شوہروں کی سخت سے سخت بات ہنس مسکرا کر برداشت کر لینی چاہیے۔ اِسی میں ہماری بہتری ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے انگریز عورتوں مردوں کو ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے ٹھنڈی سڑک پر گھومتے پھرتے دیکھا ہوا ہے۔ سنا کرتے تھے کہ وہ لوگ آپس میں اِدھر اُدھر بھی منہ کالا کر لیا کرتے تھے۔ جیسے آج کل ہمارے آزاد خیال طبقے کی عورتوں مردوں نے شرم حیا اُتار پھینکی ہے۔ توبہ استغفار۔ اللہ حرام سے بچائے اور ہر مسلمان عورت مرد کی ضرورت حق حلال کے رشتے سے پوری کرے۔۔۔“

حلق خشک ہونے پر جہاندیدہ عورت نے پانی کا گھونٹ لیا اور نم ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے نو بیاہتا پوتی پر نگاہ ڈالی۔ وہ جواب دینے کو بے صبری ہوئی بیٹھی تھی۔ فوراً بول پڑی:

”دادی اماں! میں نے انکار نہیں کیا۔ ان باتوں کو سمجھتی ہوں۔ امی زندہ ہوتیں، تب بھی اتنی محبت سے میری پرورش نہ کرتیں، جیسے آپ نے کی۔ میں نے کب کہا کہ میرا میاں زن مُرید بن جائے۔ لیکن اتنا بھی بے رحم تو نہ ہو کہ عورت کو صرف استعمال کی چیز ہی سمجھ لے۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے دادی اماں! آپ نے مجھے یونیورسٹی تک تعلیم دلوائی ہے۔ خود ہی بتایا کرتی ہیں کہ آپ کے وقتوں میں لڑکیوں کو صرف اتنا پڑھایا جاتا تھا کہ وہ دینی کُتب کا مطالعہ کر سکیں۔ اور شادی سے پہلے لڑکی کو ”بہشتی زیور“ دی جاتی تھی، بغور پڑھنے اور شوہر کے

ہاں اس پر حرف بہ حرف عمل کرنے کے لیے۔ یہ دور خود آگہی کا ہے جس کے مطابق عورت اور مرد دونوں برابر کے انسان ہیں۔ جو سبق آپ کو والدین نے حفظ کروا کر رخصت کیا، اس کی روشنی میں تو میرے نزدیک بیوی اور زر خرید لونڈی میں برائے نام ہی فرق باقی رہ جاتا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ شوہر اگر بیوی کو رات بھر ایک ٹانگ پر کھڑا رہنے کا حکم دے تو وہ اُف نہ کرے؟ ......اور میاں کسی طوائف کے پاس راتیں گزارنے جاتا ہو تو بیوی اپنے سرتاج کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اُس کی داشتہ کے من پسند پکوان تیار کرکے بھجوائے ......نہیں اماں! یہ سراسر تذلیل ہے عورت کی۔ ہر انسان کی عزتِ نفس ہوتی ہے۔''

دادی نے اُنگشتِ شہادت کو لہراتے ہوئے کہا:

''عورت اپنی نہ منوا سکے تو مان جائے۔ جھگڑا نہ کرے۔ اَنا کا مسئلہ نہ بنائے۔ ورنہ معاملہ بگڑ جاتا ہے۔ بعض عورتیں اپنے خاوندوں پر حاوی ہو جاتی ہیں مگر سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ عورت کو اپنے مرد کا مزاج سمجھنا چاہیے۔ میاں کی مزاج شناس عورت کبھی خطا نہیں کھاتی۔ ہر انسان کو کسی نہ کسی کے آگے جُھکنا پڑتا ہے۔ بہشتی زیور کی تعلیمات پر عمل کرنے والی زیادہ تر عورتیں کامیاب بیویاں ثابت ہوئیں اور فائدے میں رہیں۔ عورت ذات کمزور ہے اور مرد کے بغیر اس کا زندگی گزارنا آسان نہیں ہوتا۔ سیدھی سی بات ہے میری بچی! کمزور ذات برداشت کا مادہ پیدا کرکے سکھی کیوں نہ رہے۔ ہمارے زمانے کی عورت نے دل سے مان لیا کہ شوہر اس کا مجازی خدا ہے۔ اگر اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو عورت کو حکم دیا جاتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔''

ناہید نے چہرے سے عاجزانہ تاثرات مترشح کرتے ہوئے کہا: ''ہاں اماں! شادی سے پہلے جب رشتہ طے ہو گیا تھا تو اُس نے اِسی کمرے میں کہا تھا کہ مذہبی ماحول میں پلی بڑھی لڑکی کا رشتہ اس لیے قبول کیا ہے کہ وہ ذہنی طور پر شوہر کو مجازی خدا تسلیم کرتی ہوگی۔ مزید کہا کہ وہ کبھی بھی اور کوئی سی شرط عاید نہیں کرے گا ......دادی اماں! میں نے آپ کی ہر ہدایت پر عمل کیا۔ حالانکہ وہ خود نام کا ہی مسلمان ہے۔ مجازی کی بجائے اصلی خدا بن بیٹھا ہے۔ نعوذباللہ ......رات کو گھر آکر سیدھے منہ بات کرنے کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ بے دم ہوا بستر پر پڑا سویا رہتا ہے لیکن عین فجر کی اذان ہونے پر شیطان مرد وداُس کو جگا دیتا ہے۔ میں انکار نہیں کرتی۔ فارغ ہوتے ہی غسل کرتی ہوں اور نماز ادا کرکے لیٹتی ہوں۔ آج فجر کی اذان سے پہلے ویسے ہی میری آنکھ کھل گئی اور واش رُوم جانا پڑ گیا۔ دیکھا کہ گیزر بند ہوا پڑا ہے۔ پانی کا ٹب بھرا ہوا پاکر غنیمت جانا اور جلدی سے وضو کر لیا تاکہ میاں کو شیطان لگنے سے پہلے پہلے سجدہ دے لوں۔ اتنی کڑاکے کی سردی میں ٹھنڈے یخ پانی سے نہایا نہیں جا سکتا۔ وضو کرتے ہوئے اذان بھی سنائی دینے لگ گئی تھی۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ نماز قضا ہونے سے بچ گئی۔ عجلت میں واش رُوم سے نکل آئی مگر پیشتر اس کے کہ جائے نماز کی طرف بڑھتی، مجازی خدا نے

کرخت لہجے میں بستر پر آنے کو کہا۔ میں نے عرض کیا؟ پانچ دس منٹ کی مہلت چاہیے۔ بس ابھی آئی ......''

گرم سرد زمانہ چشیدہ خاتون مایوسی میں سر ہلاتے ہوئے بُڑبڑانے لگ گئی اور اسی کے ساتھ اُس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ پوتی کچھ سمجھ نہ پائی اور کہنے لگی:

''میں نے اتنی جلد بازی میں نماز پڑھی ...... دل کو سخت خوف لگ گیا کہ نماز کو ایک طرح سے ٹرخایا ہے۔ اللہ معاف کرے۔ استغفار کرتے ہوئے جائے نماز تہہ کیا اور جوں ہی بیڈ کی طرف بڑھی تو مجازی خدا کی غراہٹ سنائی دی؛ اب ڈسٹرب نہ کرو۔ ضرورت نہیں رہی۔ نکلو کمرے سے، مجھے آرام سے سونے دو۔''

پوتی کی آنکھیں بھر آئیں۔ کہنے لگی:

''دادی اماں! اتنی توہین!!! بیوی کی کوئی عزتِ نفس نہیں ہوتی؟ آٹھ دس منٹ میں کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی؟ آخر اللہ کو بھی جواب دینا ہے۔ یا پھر کیا مجازی خدا اپنا جوش نکال کر بخشش کروا دے گا؟''

ڈوپٹے کے پلّو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بوڑھی عورت نے کہا:

''دادی کی جان! خدا بڑا مہربان ہے۔ بندے کی ہزار خطائیں معاف کر کے بھی اُس کی رحمت کا سمندر جوں کا توں ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے۔ لیکن کیا خبر کہ مجازی خدا کا ظرف کتنا ہو۔ گُجی گُھوٹھی جتنا یا پشوری تُقّے کی ٹوپی سے بھی چھوٹا۔ اپنی غلطی مانتی ہوں کہ تجھے میاں بیوی کے رشتے کو جوڑ کر رکھنے والی اصلی بات کُھل کر نہ سمجھائی۔ سیانے سچ کہہ گئے کہ شرع میں شرم کیا۔ میاں کا وہ والا حق، جسے تم شیطان لگنا کہہ رہی ہو، پورا کرنے کا حکم شریعت کی طرف سے بیوی پر بڑی سختی سے لاگو ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اُونٹ کے کجاوے میں بھی شوہر کا دل آ جائے تو بیوی نخرہ نہ کرے۔ تمھارے دادا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ تھا۔ آڑھتیوں کے کھاتے لکھا کرتے تھے۔ جمع تفریق کرتے ہوئے ہر روز ہی دیر ہو جایا کرتی تھی۔ کسی نہ کسی آڑھتی کے ساتھ کھانا کھا لیا ہوتا تھا۔ تھکن سے چُور آتے ہی سو جاتے۔''

کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بزرگ خاتون کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔ کہنے لگی:

''تمھارا شوہر بے چارہ کاروباری بندہ ہے۔ سولہ سترہ گھنٹے گاہکوں کے ساتھ مغز کھپانے اور جان مارنے والے کو گھر آ کر لاڈ کرنے کا ہوش نہیں رہتا۔ بستر پر ڈھے ہی جاتا ہے۔ دن بھر ایک ہی جگہ پر جم کے بیٹھنے والے کی نسیں ویسے ہی کمزور ہو جاتی ہیں۔ شروع کے تیس چالیس سال تو میں نے پکی عادت بنالی کہ بستر اُس وقت چھوڑنا ہے، جب خاوند خود اُٹھنے کو کہے۔ اسی لیے فجر کی نماز میں اکثر قضا ہی پڑھتی رہی۔''

دادی نے قدرے توقف کرتے ہوئے پوتی کے چہرے پر محبت بھری نگاہ ڈالی اور بولنے لگی:

''میری جان! ایک نصیحت زندگی بھر کے لیے پلے باندھ لو کہ شوہر کی سخت سے سخت بات پر بھی

رُوٹھ کر میکے نہیں آتا۔ بھلے وہ غصّے میں کہہ دے: نکلو گھر سے، دفع ہو جاؤ..... تب بھی۔ مرد کا وقتی اُبال ہوتا ہے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت سچ مچ ہی گھر چھوڑ آئے۔ ہاں! اِدھر اُدھر ضرور کھسک لے۔ نظروں سے اوجھل رہے اور اُس وقت کا انتظار کرے، جب اُسے زیادہ شدت سے بیوی کی قربت کی خواہش ہوتی ہے۔ سمجھ دار بیوی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُس کے شوہر پر اِس طرح کی خواہش کا غلبہ کس موقع پر زیادہ زور کا ہوا کرتا ہے۔ مرد اِس موقع پر اندر سے بڑا کمزور پڑ چکا ہوتا ہے۔ بیوی کے سامنے آ جانے پر خواہ زبان سے اقرار نہ بھی کرے، دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور کڑوی کسیلی باتیں خود کی ہوئی ہوں یا بیوی نے، سب اسے بھول جاتی ہیں..... تو میری بچی! تم ابھی اپنے گھر چلی جاؤ۔"

ناہید روہانسی ہو کر بولی:

"کس منہ سے جاؤں دادی اماں! بالکل ہی بے وقعت ہو کر رہ جاؤں گی۔ اوّل تو اُس کو خود آنا چاہیے، معذرت نہ بھی کرے، چلو فون کال ہی کر دے۔ صرف گھر واپس آنے کا بول دے، عزت وقعت نام کی تو کوئی شے کیا باقی رہی، چلو، جھوٹا سچا بھرم ہی رہ جائے تا کہ اپنے آپ کو بہلا سکوں اور خود کو زیادہ بے توقیر محسوس نہ کروں۔"

"عورت ذات کی وقعت اتنی ہی ہے، جتنی میں نے بیان کر دی۔ زیادہ کھل کر کیا بتاؤں؟ کوئی قسمت والی ہوں گی، جنھیں رُوٹھنے پر منا لیا جاتا ہے۔ ورنہ باقی سب کو اَنا مار کے گھر بسانا پڑتا ہے۔ اسی لیے کہتی ہوں کہ ہم بہشتی زیور والی عورتیں فائدے میں رہیں۔" دادی نے پوتی کو ٹُوکتے ہوئے اتنا ہی کہا اور خاموش ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ مسکرا دی اور بول پڑی: "کہاوت مشہور ہے: رُوٹھی ہوئی بیوی باہر کھیتوں میں بیٹھی رہی کہ شاید کوئی منانے آ جائے۔ شام کو گھر لوٹتے مویشیوں میں سے بھینس کی پُوچھل (دُم) پکڑے خود ہی چل دی۔ احاطے میں قدم رکھنے پر خاوند سے سامنا ہو گیا۔ کہنے لگی، یہ تمھاری بھینس بڑی پچھاپھے کٹنی ہے۔ مجھے زبردستی واپس لے آئی۔ اُس موقع پر گھر والے نے بھی جھٹلانا مناسب نہ جانا۔ اِس لیے کہ گھر کو بہر حال گھر والی کی ضرورت تھی۔"

کمرے میں چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دادی نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا: "اِس وقت تمہارا شوہر دکان سے واپس آ کر کھا پی کے اپنے کمرے میں جا چکا ہو گا۔ میں تمھیں تمھاری ساس کے پاس چھوڑ آتی ہوں۔ رات کو اُسی کے پاس رہنا۔ فجر سے پہلے، جب شیطان اُچھلنے کا وقت قریب آنے والا ہو تو چپکے سے اپنے بیڈروم میں جا کر بستر پر لیٹ جانا۔ دیکھنا تم!! سہاگ رات والی وقعت نہ بھی بنی تو وہ گلہ شکوہ کیے بغیر تمھاری طرف کروٹ بدل کر ساتھ لگا لے گا....." بوڑھی عورت کے چہرے پر شفق کھلنے لگی۔ تاہم بول گئی: "دماغ استعمال کرنا سیکھو ناہید! میری جان!! ہم شریف گھرانوں کی عورتیں مجبور رہیں۔ اَنا کی بجائے گھر بچانے کی تدبیر کرنے میں ہی ہماری بھلائی ہے۔ تم نے کبھی اپنے بھتیجے کی طرف ہی دھیان دیا ہوتا تو سمجھ جاتی۔ ڈیڑھ دو سال کا معصوم بچہ بھی صبح سویرے سوتے میں سیدھی چھت کی طرف دھار مارتا ہے۔"

☆☆☆☆

خالد فتح محمد

رنگ

میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا صرف ایک جھلک نظر آئی تھی!

ہلکا سانولا رنگ، باریک ہونٹ ترچھی آنکھیں جو تاتاری نقش لیے ہوئے تھیں، گالوں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں، چھریرا بدن اور بھری ہوئی چھاتیاں جو اُسے ایک جداگانہ تشخص دیتی تھیں، مجھے اپنا گرویدہ بنا گئیں۔ اُس کی جھلک میں نے کہاں دیکھی تھی؟ میں سوچتا رہتا: کسی بازار میں، گلی یا پارک میں، کسی سڑک کے موڑ پر یا رات کو کسی سچے خواب میں جو کسی بھی طرح حقیقی نہیں تھا۔ میں نے اُس کی جھلک دیکھی، مجھے نہیں معلوم کہ اُس نے بھی مجھے دیکھا کہ نہیں لیکن اُس کے نقوش میرے ذہن میں نقش ہو گئے۔ میں اب زندہ نہیں تھا صرف اُس جھلک کو اپنی بیساکھی بنا کر زندگی کر رہا تھا۔ اُس کے بوٹے سے قد پر مجھے اِملی کے درخت کا گمان ہوتا جو میرے صحن میں لگا ہوا تھا۔ میرا مالی ایک دِن کمزور سا پودا لایا جو مرجھایا ہوا تھا اور کسی بھی طرح زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے چہرے پر ناگواری کا تاثر دیکھتے ہوئے اُس نے مجھے حوصلہ دیا کہ پودا چند سالوں میں ایک خوب صورت درخت بنے گا جس لیے مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے صحن کے ایک بے رونق سے کونے میں اُسے درخت لگانے کی اجازت دے دی۔ جب وہ پودا لگا رہا تھا تو اُس نے مجھے بتایا کہ اِملی کا یہ درخت وہاں لگے تمام پودوں سے خوب صورت ہو گا۔ مجھے اُس کی بات میں مبالغہ لگا اِس لیے میں نے کوئی رائے نہ دی۔ وہ کمزور اور خمیدہ سا پودا بتدریج ناگ بچے کی طرح اپنا پھن پھیلانے لگا۔ اُس کے پتوں میں شادابی آنے لگی اور تنے میں سے خم نکلنے شروع ہو گئے۔ مجھے خوشی ہوئی اور میں نے املی کے پودے کو ہر روز دیکھنا شروع کر دیا۔ میں پودے کو ہر روز ناپتا اور مجھے محسوس ہوتا کہ میرا مستقبل اِس کے ساتھ وابستہ ہے۔ کمزور اور خمیدہ سا پودا میرے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہو گیا اور کسی دِن اگر اُس پر نئی کونپلیں نہ بنی ہوتیں تو میں پریشان ہو جاتا؛ مجھے محسوس ہوتا کہ اُس کی افزائش کا عمل رُک گیا ہے۔ مالی بھی ہمیشہ اِس کوشش میں ہوتا کہ اُس کی نلائی ہوئی ہو۔ ایک دِن میں نے اُس سے پوچھ ہی لیا کہ اُسے ایسے پودے سے اتنی دل چسپی کیوں ہے جو میرے چھوٹے سے باغیچے کو اپنے پھل یا پھولوں سے بہار نہیں دے سکتا؟ مالی مجھے بتا چکا تھا کہ یہ پودا بے گل وثمر ہو گا۔ مالی کا جواب ایک جداگانہ منطق لیے ہوئے تھا جس میں مجھے وزن محسوس ہوا: اُس نے بتایا کہ اِملی کا

ہماری تہذیب کے ساتھ قریبی تعلق ہے اور ہر وہ چیز جس کا کسی بھی تہذیب کے ساتھ واسطہ ہو مجھے پسند ہے چناں چہ املی کا یہ پودا مجھے اچھا لگنے لگا!

اب میں ہر روز اُسے نئی آنکھ سے دیکھتا۔

پودا اچانک اپنی افزائش کے عمل کو تیز کر گیا؛ مجھے محسوس ہوتا کہ اُس کے نظام میں کوئی تبدیلی آ گئی ہے۔ وہ اب قد آور ہونا شروع ہو گیا تھا اور ہوا کے جھونکے اُسے ایک سرشاری میں مبتلا کرتے ہوئے محسوس ہوتے۔ جب بھی ہوا لہکتے ہوئے چلتی، میں اُسے دیکھنے لگتا۔ مجھے وہ کچھ یاد دلا رہا ہوتا؛ کچھ ایسا جسے میں یاد نہیں کر پا رہا تھا۔ مجھے جو یاد نہیں آ رہا تھا وہ میری زندگی کا ایک اہم حصہ تھا جسے میرا ذہن اپنی گرفت میں لینے سے قاصر تھا۔ مجھے یوں لگتا کہ جوانی کی طرف بڑھتا ہوا پودا مجھے پہچاننے لگا ہے؛ وہ ساکت ہوتا اور جیسے ہی میں آتا وہ جھومنے لگتا۔ میں کئی بار سوچتا: کیا یہ ممکن ہے؟ میں نے اُسے چھپ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ایک شانِ بے نیازی سے کھڑا ہوتا؛ کسی قسم کی جنبش کیے بغیر اور جیسے ہی میں سامنے آتا جھومنا شروع کر دیتا: مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مجھے رُجھا رہا ہے۔ پہلے تو میرے لیے یہ ایک دل چسپ سی دل لگی تھی لیکن پھر مجھے اِس دل چسپی میں سنجیدگی نظر آنے لگی۔ میں نے درختوں کے اطوار اور خصائص جاننے کے لیے محکمہ جنگلات کے مقامی دفتر سے رابطہ کیا۔ وہ سیلاب کے دِن تھے اور دفتر کا انچارج افسر کسی بھاری کھچاؤ کے بوجھ تلے دبا ہوا پریشانی میں گم بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر سکون آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ برساتی ریلوں کی وجہ سے اُن کا ایک سال کی عمر کا جنگل بہہ گیا تھا جو ایک طرح سے ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ میرے آنے سے اُسے حوصلہ ہوا تھا کہ کسی اور موضوع پر گفتگو اُس کی پریشانی کو کم کر دے گی۔ میں نے جھجکتے ہوئے اپنے آنے کا مقصد بتایا کہ مجھے جاننے میں دل چسپی تھی کہ درخت دیکھ یا محسوس کر سکتے ہیں؟ اُس نے ایسی نظر سے دیکھا جیسے میں نے ایک بار ایسے بہروپیے کو دیکھا تھا جس کے ایک ہاتھ میں خنجر اور دوسرے میں پتھر تھا اور جس نے خنجر لہراتے ہوئے مجھے جان سے مار دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ مجھے بیوقوف بنانے والا خود بیوقوف ہے۔ بہروپیا ایک پیشہ ور اداکار تھا اور میری نظر کی تاب نہ لاتے ہوئے زیرِ لب کچھ بڑبڑاتے ہوئے ساتھ والی گلی میں مڑ گیا تھا۔

محکمہ جنگلات کے اُس مقامی افسر کی حالت بھی اُسی بہروپیے جیسی تھی!

افسر نے غور سے مجھے دیکھا۔ اُس نے بتایا کہ جس طرح انسان اجنبیوں میں اپنے آپ کو غیر مطمئن محسوس کرتا ہے اِسی طرح درخت کو جب نئی جگہ پر لگایا جائے تو وہ کئی دِن اُداس، پریشان اور بجھا بجھا رہتا ہے۔ اُس پر ماحولی حالات اثر انداز ہوتے ہیں؛ موسم اور لوگ پودے کی نشو ونما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جیسے جیسے وہ نئی جگہ، ماحول اور لوگوں سے واقف ہوتا جاتا ہے، اُس کی تازہ کونپلوں میں زندگی کے رنگ

نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ پودا تو پالتو جانوروں کی طرح ہو جاتا ہے، اُن کی طرح اُسے ہر وقت نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اگر یہ پالتو جانوروں کی طرح ہیں تو کیا یہ اپنے مالک یا مالی کو پہچانتے بھی ہیں؟ افسر کے چہرے پر تمسخر میں ڈوبی حیرانی تھی؛ اُس نے برتر سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔ وہ ایک سرکاری افسر تھا اور میں ایک عام شہری! اُس کا ایسی نظر سے مجھے دیکھنا میرے پاگل ہونے کی نشانی تھی۔ وہ شاید یہ نہیں جانتا تھا کہ میری سوچ میری اپنی ذاتی ملکیت ہے۔ میں جو چاہوں سوچوں :وہ میری صوابدید ہے۔

مجھے وہ افسر مطمئن نہ کر سکا!

املی کا وہ پودا جواب چھوٹا سا درخت تھا جس کا تنا سیدھا تھا جیسے اکڑ کر کھڑا ہو۔ اُس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں لیکن اتنی بھی نہیں کہ بے ربط نظر آئیں۔ اُس کے پتوں میں تازگی تھی، لگتا تھا کہ اُنھیں ابھی ابھی دھویا گیا ہے۔ میں جب اُسے دیکھتا تو مجھے اپنے اندر ایک خوشی انگڑائی لیتے ہوئے محسوس ہوتی۔ مجھے اُس کی تازگی اور بشاشت میں اپنی شخصیت کا ہی کوئی پہلو نظر آتا، ایسے محسوس ہوتا کہ میں اپنے آپ ہی کو دیکھ رہا ہوں۔ پودا آہستہ آہستہ میری زندگی کا ایک اہم حصہ بنتا گیا۔ میں کبھی سوچتا کہ یہ بیمار سا پودا مکمل صحت یابی کے بعد میرے چھوٹے سے باغیچے میں سب سے پرکشش درخت بن گیا ہے۔ مجھے جب بھی موقع ملتا میں اُسے دیکھنے چلا جاتا یا بعض اوقات کوئی موقع نہ بھی بن رہا ہوتا تو میں اُسے دیکھنے چلا جاتا۔ مجھے لگتا کہ اُس کا تنا کستا ہی چلا جا رہا ہے، اُس کی شاخیں لچکیلی ہوئی جا رہی ہیں اور اُس کے پتے خواب آلود آنکھوں کے اوپر پھیلی پلکوں کی طرح گھرے ہوتے جا رہے ہیں۔ کبھی مجھے وہ سر جھکائے ہوئے کھڑا نظر آتا، لگتا کہ وہ روٹھ گیا ہے اور تب میں بھی اُس کے ساتھ روٹھ جاتا۔ ہم ایک دوسرے کو کسی حد تک ناراضی، پشیمانی اور پریشانی کے ساتھ اُن دو ساتھیوں کی طرح دیکھتے رہتے جنھوں نے بیچ دریا میں کسی اختلاف پر چپو، پانی برد کر دیے ہوں۔ مجھے کشتی دریا میں ہلکے ہلکے ہلکورے لیتی ہوئی محسوس ہوتی۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ کیا محسوس کرتا تھا؟

اِملی کے اِس درخت کے گھر میں آنے کے بعد میں اُس جھلک کو بھولا نہیں تھا کیوں کہ میں اُسے ہر قیمت پر یاد رکھنا چاہتا تھا۔ میں اِسے دیکھتے ہوئے اُسے یاد کرتا اور اُسے یاد کرنے کے لیے اِس کے پاس آن کھڑا ہوتا۔ اُس جھلک کے لمبے قد کا عکس املی کے درخت کے تنے کے کھچاؤ میں تھا اور کمر کا لوچ اِس کی شاخوں میں پنہاں تھا۔ کیا میں اِملی کے اِس لچکیلے درخت میں اُسے ڈھونڈ کر اُس تصور کو ایک شکل دینے کی کوشش کر رہا تھا جو میرے ذہن کے کسی کورے ورقے پر اپنا خاکہ چھوڑ گیا تھا؟ ایک درخت ایسی عورت کا متبادل کیسے ہو سکتا ہے جس کا کہیں پر وجود ہو۔ مجھے اچانک محسوس ہوا کہ درخت کے پتوں میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ

بادامی آنکھوں کی طرح ہونا شروع ہو گئے تھے۔ کیا اُس کی آنکھیں بھی بادامی تھیں؟ نہیں! وہ تو تاتاری آنکھیں تھیں خمیدہ، بادام کی طرح۔ مجھے اپنے اندر ایک خوف جنم لیتے ہوئے محسوس ہوا۔ کیا وہ ایک جھلک میری سوچ کے اوپر اتنی حاوی ہو گئی تھی کہ مجھے املی کے درخت کے پتے عورت کی آنکھوں میں ڈھلتے ہوئے محسوس ہونے لگے؟ میں اپنے نفسیاتی خوف میں گم کھڑا درخت کو گھنٹوں دیکھتا رہتا۔ بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا کہ درخت مجھے دیکھتے ہی مسکرا اُٹھا ہے۔ مجھے اُس کی مسکراہٹ میں اطمینان میں ڈوبی ہوئی اپنایت کا احساس ہوتا۔

میں ایک طرح سے دوہرے خواب میں گم تھا۔ مجھے اُس جھلک کی تلاش تھی جس نے مجھے رنگوں کے حصار میں بند کر دیا تھا، وہ رنگ جنھیں ابھی تک شناخت ہی نہیں کیا جا سکا تھا۔ وہ رنگ صرف میں ہی دیکھ سکتا تھا اور میں کوئی نام دے کر اُنھیں بے نام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ رنگ تتلیوں کی طرح ہر وقت میری نظر کے سامنے رقص کرتے اور میں اُس رقص میں ایک شکل ڈھونڈنے کی کوشش میں رہتا۔ میں کئی بار سوچتا کہ وہ شکل میں نے دیکھی بھی تھی یا میرا کوئی وہم تھا؟ میں نے املی کے پیڑ سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ میری پریشانی تھی کہ میں اُس سے پوچھوں گا کیسے؟

میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگا تھا اور اب رات کو بھی کئی بار اُسے دیکھنے کے لیے چلا جاتا۔ میں جب جاتا تو اُسے اپنا منتظر پاتا۔ رات کو اُس کے تاثرات دیکھنا اتنا آسان نہیں تھا اور میں نے اِسے آسان بنانے کے لیے اُس کے اوپر ایک بلب لگوا لیا۔ میں اب جب جی کرتا اُسے دیکھنے چلا جاتا۔ مجھے راتوں کو یہ بھی احساس رہتا کہ میں اُس کی نیند میں خلل انداز ہو رہا ہوں لیکن میں اپنے آپ کو حوصلہ دیتا کہ اِس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ میں اب اُسے راتوں میں بھی چمکتا ہوا دیکھتا۔ اب کچھ ایسا معمول بن گیا کہ دِن کو میرے ذہن میں وہ ایک جھلک ہمیشہ زندہ ہوتی جس نے مجھے خود سے بھی دور کر کے املی کے اِس پودے کے ساتھ منسلک کر دیا تھا۔ میں اکثر سوچتا کہ یہ پودا کہیں اُس شکل کا دوسرا روپ تو نہیں جس نے صرف ایک جھلک سے ہی مجھے اپنے اردگرد سے بے نیاز کر دیا تھا۔ کیا املی کا یہ پودا ایک فرار تھا؟ میں جب اِس سوچ کے راستے پر گامزن ہوتا تو فوراً اُس کے پاس چلا جاتا: اب میرے وہاں جانے کا کوئی وقت طے نہیں تھا، میں اپنے کام سے اُٹھ کر بھی وہاں پہنچ جاتا۔ اُس کی موجودگی مجھے ایک حوصلہ دیتی یا وہ میرے وہاں ہونے سے اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کرتا۔ ایک رات میں اپنی مجبوری کے تحت وہاں گیا۔ وہ وسط اگست کے حبس زدہ موسم میں خلافِ توقع ایک خوش گوار رات تھی۔ املی کا پودا اپنے پورے قد کے مطابق تنا ہوا تھا اور خوش گوار جھونکوں میں اُس کی شاخیں بانھوں کی طرح حرکت میں تھیں۔ میں اُس کی رقص بھری مسکراہٹوں کو دیکھتا رہا۔ مجھے وہ اُس اناڑی رقاص کی طرح لگا جسے ناچنے کا جنون کی حد تک شوق ہو۔ ہوا اُسے ایک بے سُرا تال مہیا کر رہی تھی جس میں وہ

اپنا بھدا لیکن والہانہ رقص جاری رکھے ہوئے تھا۔ میں ہوا کی خوش گواری میں گم اُسے دیکھتا تھا کہ مجھے ایک دم قہقہہ سنائی دیا۔ مجھے پہلے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ مجھے یہ کسی پہلے سنے ہوئے قہقہے کی بازگشت محسوس ہوئی۔ میں ایک عجیب کیفیت سے دوچار تھا؛ مجھے اچانک املی کا پودا آسیب زدہ لگا۔ میرے بدن میں خوف کی ایک جھرجھری دوڑ گئی، اُس خوش گوار ہوا میں مجھے اپنے اردگرد شدید حبس کا احساس ہوا۔ مجھے اپنی ٹانگوں، جِڑوں، بغلوں اور گردن پر پسینہ بہتے ہوئے محسوس ہوا۔ مجھے یہ بھی احساس گزرا کہ یہ قہقہہ محض میرا ایک وہم تھا اور اگر دوبارہ سنائی دیا تو حقیقت ہوگی۔ میں آدھا خوف زدہ اور آدھا پُر اُمید قہقہے کے دہرائے جانے کے انتظار میں تھا کہ مجھے اچانک خیال گزرا کہ قہقہہ نسوانی کیوں تھا؟ میں نے سوچا کہ اگر یہ قہقہہ مردانہ ہوتا تو کیا کوئی مختلف کیفیت ہوئی تھی؟ مردانہ قہقہہ شاید اتنا اہم نا ہوتا۔ نسوانی قہقہے نے میرے ذہن میں وہی شکل کھڑی کردی جو رات اور دِن میں کئی بار مجھے یہاں لا کھڑا کیا کرتی تھی! میں اِملی کے درخت کی طرف دیکھنے سے خائف تھا گو اُس قہقہے کے اثرات کسی حد تک زائل ہو چکے تھے۔ ہوا نے میرا پسینہ بھی خشک کردیا تھا اور میرا بدن اپنے معمول کی زبان پر لوٹ آیا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ قہقہہ میرا وہم نہیں تھا۔ وہ قہقہہ، جہاں سے بھی آیا تھا، میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا کر اپنی موسیقی اور خوف سے مجھے ایک شک میں گرفتار کرگیا تھا۔ وہ جھلک جو میں نے دیکھی تھی، دراصل میرا وہم تھا اور یہ درخت جو الہڑ سے رقص میں مبتلا تھا، املی تھا۔

میں نے پھر ایک بار درخت کی طرف دیکھا!

مجھے درخت آنکھیں بند کیے جھومتا ہوا نظر آیا۔ اُس کے ہونٹوں پر جیسے ایک مستی بھری مسکراہٹ تھی اور وہ میری طرف دیکھنے سے گریزاں تھا۔ میں اُسے جھومتے ہوئے دیکھتا تھا اور وہ اپنے ہی طور رقص کرتا تھا۔ مجھے اچانک ایک خیال نے چونکا دیا: ایسا تو نہیں کہ درخت اپنے جذبات کا اپنی ہی زبان میں اظہار کرتے ہوں اور وہ زبان انسانوں کو سنائی ہی نہ دیتی ہو؟ جس طرح وسط اگست میں ہوا کرتا ہے؛ ہوا ایک دم بند ہوگئی اور حبس نے گھٹن پیدا کرنا شروع کردی۔ میں نے درخت کی طرف دیکھا، وہ سر جھکائے پریشان سا کھڑا تھا۔ کیا اُسے بھی حبس نے اُکتاہٹ میں ڈال دیا تھا۔ مجھے وہ کچھ پریشان بھی لگا: کیا اُسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے ہنسنا نہیں چاہیے تھا؟ مجھے یقین تھا کہ وہ ہنسی اُسی کی تھی اور میں نے ایک بار پھر محکمہ جنگلات کے مہتمم سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

اب مہتمم کی اور میری شناسائی ہو چکی تھی۔ وہ مجھے اپنایت سے ملا اور اُس کے لہجے میں مجھے ہمدردی بھی محسوس ہوئی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ کیا درختوں کی کوئی زبان ہوتی ہے یا وہ ہماری طرح کبھی قہقہہ لگا کر ہنس

سکتے ہیں؛ ایسا قہقہہ جس میں ایک لبھاؤ ہو۔ وہ میز کے دوسری طرف بیٹھا مجھے دیکھتا جاتا تھا۔ اب اُس کی نظر میں مجھے ہمدردی نظر نہیں آئی۔ اُس نے پوچھا کہ میں اُس فلم کا ذکر تو نہیں کر رہا جس میں درختوں پر آواز کو magnify کرنے والے آلات لگائے گئے تھے اور پھر جب درخت کو کلہاڑے یا کسی تیز دھات سے کاٹا جاتا تو درخت سے دل کو دہلا دینے والی ایک کراہ نکلتی۔ قدرتی سی بات تھی کہ وہ کراہ اصلی ہونے کے بجائے ایک بوڑھے درخت کی کہانی کا حصہ تھی۔ مہتمم کی یہ بات سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگر کوئی ایسی فلم بنی تھی تو وہ کسی نہ کسی سچے واقعے یا قصے پر مبنی ہوگی۔ اُس نے طنز سے کہا کہ درخت کا قہقہہ سننے کے لیے ویسے ہی آلات لگا کر اُسے گدگدی کرنی ہوگی۔ وہیں باتوں میں مجھے پتا چلا کہ اِملی پنجاب کے اِس حصے کا پودا نہیں اور یہ جوڑے میں ہوتا ہے جو اِن کے پھل لانے کا سبب بھی بنتا ہے۔ اکیلا درخت صرف پھول لاتا ہے جو پھل میں تبدیل نہیں ہوتے۔ میں نے اُسے اپنے صحن میں لگے پودے کا بتایا تو اُس نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اُس نے کسی کو میرے ساتھ یہ دیکھنے کے لیے بھیجنے کا وعدہ کر لیا کہ درخت نر ہے یا مادہ؛ میں اُس کی جنس طے کروانا چاہتا تھا تا کہ اُس قہقہے کا معمہ حل ہو سکے۔

محکمے کا آدمی کچھ دیر کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ پودے کی صحت سے مطمئن تھا۔ اُس نے جب بتایا کہ پودا مادہ تھا تو میں شرما گیا۔ مجھے لگا کہ کسی نے مجھے قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ لیا ہے۔ وہ آدمی میری کیفیت سے بے نیاز بتائے جا رہا تھا کہ درخت کو پھول بھی نہیں لگنے۔ درخت کے مادہ ہونے کا مجھ پر عجیب سا اثر ہوا۔ ایسے لگا کہ جیسے درخت میری پرانی محبوبہ ہو جو طویل عرصے بعد واپس آئی ہے۔ میں اُس کے ساتھ کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ مجھے پودا اُس آدمی کی موجودگی میں شرماتے ہوئے محسوس ہوا شاید وہ بھی تنہائی ہی چاہتا تھا۔ اُس آدمی نے مشورہ دیا کہ میں اِس پودے کی طرف زیادہ توجہ نہ دوں کیوں کہ یہ ایک طرح سے بانجھ ہے۔

پودا مونث تھا!

جب سے مجھے پودے کی جنس کا پتا چلا وہ عورت مجھے شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ اُس کی وجہ میری والدہ کے شادی کے تقاضے بھی تھے۔ کئی لڑکیوں کی تصویریں دکھائی گئیں اور چند ایک سے ملایا بھی گیا لیکن اُس ایک جھلک کا عکس مجھے کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ میں شادی صرف اُسی سے کرنا چاہتا تھا کیوں کہ کسی اور عورت کا تصور میرے ذہن میں تھا ہی نہیں۔ میں سوچتا کہ ایک ایسی عورت جس کا قد اُٹھتا ہوا نہ ہو، ناک لمبی اور ہونٹ باریک نہ ہوں اور آنکھیں تاتاری نہ ہوں، میرے بدن کی ساجھے داری کیسے کر سکتی ہے یا کسی بہت ہی نازک لمحے میں اُس کے ساتھ جذباتی اپنائیت کا اظہار کیسے کر سکوں گا؟ میں ہر بار انکار کر دیتا اور اُس کے کھوج میں چل نکلتا اور جب ناکام واپس لوٹتا تو املی میری منتظر ہوتی۔ میں اُس کے پاس پہنچ کر خاموش نظروں سے اپنی کہانی

سناتا اور مجھے محسوس ہوتا کہ وہ نہ صرف مجھے ثابت قدم رہنے کی تلقین کر رہی ہے، ایسی جگہیں بھی بتا رہی ہے جہاں مجھے وہ مل سکے گی۔ میں بے اختیار اُس کے تنے، ٹانگوں، پتوں، ٹہنیوں اور کونپلوں کو محسوس کرنا شروع کر دیتا۔ ایسا کرتے ہوئے میں عجیب قسم کی سرشاری میں گم ہو جاتا، مجھے کچھ یاد ہی نہ رہتا اور میں اُسے محسوس کیے چلا جاتا۔ ایک دِن میں نے دیکھا کہ اُس کے تنے اور دوساکھی شاخوں کے جوڑوں پر باریک باریک سے پتے ہیں جو مجھے بغلوں، ٹانگوں اور زیرِ ناف غیر ضروری بال محسوس ہوئے۔

ہمارے گھر میں باغبانی شوق کے بجائے جنون ہے۔ جب بھی نیا مالی رکھا جاتا اُسے مستقل ہونے سے پہلے کئی امتحانات میں سے گزرنا ہوتا۔ ہمارے پچھلے صحن کے ایک کونے میں ڈربہ نما ایک کمرہ تھا جس میں گھاس کاٹنے والی مشینیں، مختلف اقسام اور سائز کی درانتیاں، رمبیاں، قینچیاں، کسیاں، بیلچے، چوہے رہبے، کلہاڑیاں اور کدالیں رکھی ہوتی ہیں۔ میں نے وہاں جا کر ایک چھوٹی قینچی کا انتخاب کیا جس سے غیر ضروری پتے ہٹاؤں گا۔ مجھے زراعت کے مہتمم کی magnified کراہوں والی بات یاد آ گئی اور میں متذبذب سا ہو گیا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ بے شمار عورتیں غیر ضروری بالوں کو ہٹانے کے لیے انگلیوں پر گندے بیروزے کی تہہ چڑھا کر بال جڑوں سے کھینچ باہر کرتی ہیں اور ایسا کرتے ہوئے اُنھیں ہلکے سے درد میں ڈوبی ہوئی لذت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ جب اِن پتوں کو کاٹوں تو شاید املی کو بھی ایسے ہی محسوس ہو!

میں نے اُن پتوں کو کاٹنا شروع کر دیا اور مجھے املی پہلے سے زیادہ پُرکشش محسوس ہونے لگی!

ایک دِن مجھے وہ نظر آ گئی۔ وہی لانبا قد، ستواں ناک، باریک ہونٹ اور تاتاری آنکھیں..... ہم ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے: وہ مجھے دیکھتی تھی اور میں اُسے۔ اُس کے چہرے پر اپنائیت کا اعتماد تھا اور میں پریشان کہ وہ مجھے کیسے جانتی ہے کیوں کہ اُس کی آنکھوں میں شناسائی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بھی مجھے ڈھونڈتی رہی ہو؟ اِس خیال کے آتے ہی میری گھبراہٹ جاتی رہی اور میں مسکرا دیا اور جواب میں وہ اپنی مسکراہٹ سے مجھے نہلا گئی۔ وہ ایک جدید سٹور تھا جہاں گاہکوں کی بھیڑ تھی اور ہم بھی اُسی بھیڑ کا حصہ تھے۔ اُس سٹور کے ایک کونے میں خوش وضع کوفی شاپ تھی جہاں میں اُسے لے گیا۔ ہم باتیں کرتے رہے، ایسی باتیں جو بچے کرتے ہیں۔ مجھے لگا کہ ہم بچپن سے جوانی کی طرف آنے سے خائف تھے۔ اُس کی آواز مدھم، قہقہہ مترنم اور باتیں معصومانہ تھیں۔ میں اُس کی شخصیت کے حصار میں گم بھول ہی گیا کہ میں اُسے ایک عرصے سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ میرے سامنے تھی اور مجھے بار بار احساس ہوتا کہ وہ مجھ سے دور کبھی تھی ہی نہیں۔ میں اُسے سیدھا یہاں سے اپنے گھر ہی لے جانا چاہتا تھا؛ ایک خوف بھی تھا کہ ہم پھر شاید نہ مل سکیں۔ اندھیرا ہو گیا اور وہ مجھے بے چین لگی۔ وہ اُٹھنا چاہتی تھی اور میں متذبذب سا اُسے دیکھتا تھا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی؛ اُسے واقعی جانا

تھا اور وہ کل وہاں پھر ملنے کا کہہ کر چلی گئی۔

اُس رات میں اور املی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میری طرح وہ بھی خوش تھی کہ مجھے وہ مل گئی۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ میں نے اُس کا نام نہیں پوچھا اور اپنا بھی نہیں بتایا۔ میں ہنسنے لگا اور مجھے املی کا درخت ہلتے ہوئے محسوس ہوا جیسے اپنا قہقہہ روکنے کی کوشش میں ہو۔ اُس نے مجھے سمجھایا کہ کل ملاقات کے مقررہ وقت سے تھوڑا پہلے جا کر اچھی سی جگہ پر بیٹھ کر، اُس کا انتظار کروں تا کہ اُسے میرا انتظار نہ کرنا پڑے۔ میں نے ایسا ہی کیا اور جب وہ آئی تو میں اُس کے انتظار میں تھا اور اُس کے چہرے پر آئی خوشی دیکھ کر مجھے املی کی دانش کا معتقد ہونا پڑا۔ اُس کا نام عاقلہ تھا اور اُس نے ہنستے ہوئے کہا کہ وہ قطعاً عقل مند نہیں تھی۔ اب ہم روز ملتے اور میں املی کو تفصیل بتاتا اور اُس سے مجھے اگلی ملاقات کی ہدایات ملتیں۔ اُس کے کہنے پر میں نے والدہ کو عاقلہ کے بارے میں بتا دیا۔ ہم ایک روایتی خاندان ہیں اور ہمارے ہاں اپنی برادری سے باہر شادی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا لیکن میری ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے پرانی دیوار میں سے پہلی اینٹ نکال لی گئی۔

شادی والی رات گھر کو سجایا جانے لگا، میں نے املی پر کوئی سجاوٹی بتی نہ لگنے دی۔ اُسے کسی سجاوٹ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ بغیر کسی سجاوٹ کے ایک دلہن نظر آ رہی تھی، اُس کا ہر پتا کنوارے پن کی چمک لیے ہوئے تھا۔ میں خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میں عاقلہ کے پاس جانے کی جلدی میں نہیں ہوں۔ میں نے املی کے تنے اور دو ساکھوں کو چھوا تو مجھے اُس میں ایک جھرجھری سی دوڑتے ہوئے محسوس ہوئی۔ پھر اُس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا تو مجھے شدت سے عاقلہ کا خیال آیا۔

کمرے کو دبیز پردوں میں سے رِس کے آتی ہوئی روشنیوں نے ایک دودھیا سی ہلکی روشنی میں نہلایا ہوا تھا جس میں عاقلہ کے بدن کی چمک بھی شامل تھی۔ نیند میں اُس کے باریک ہونٹ آدھے کھلے ہوئے تھے اور سانس لینے سے اُس کے حساس نتھنے پھیل اور سکڑ رہے تھے۔ اُس کی بے داغ لمبی ٹانگیں کمرے کی پراسرار دودھیا روشنی میں غیر حقیقی اور تصوراتی لگ رہی تھیں۔ مجھے وہ ٹانگیں دیکھتے ہی املی کا تنا ذہن میں آ گیا۔ میں کچھ دیر سکتے میں اُس کی ٹانگوں کو دیکھتا رہا، اُس مختصر سے وقفے میں مجھے ہوش ہی نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں؟ پھر آہستہ آہستہ میں اپنے آپ میں واپس آیا تو مجھ پر املی کی طاقت کا راز کھلا۔ مجھے لگا کہ میری زندگی کو وہی چلا رہی ہے۔ وہ مجھے عاقلہ کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے اُکساتی رہی اور اگر وہ مجھے جانے کا اشارہ نہ کرتی تو میں ابھی تک اُس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوتا! شبِ عروسی میں جو ہوا اب مجھے سب کی اُس کے ساتھ ساجھے داری بھی کرنی ہوگی تا کہ وہ مجھے مزید ہدایات دے؟ کیا وہ ہمیشہ عاقلہ اور میرے درمیان میں رہے گی؟ میں نے عاقلہ کو دیکھا جو ایک معصوم اور گہری نیند میں گم کوئی خواب دیکھ رہی تھی کیوں کہ اُس کے ادھ کھلے ہونٹوں پر

ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اب مجھے عاقلہ کے خواب کا پتا چلا کر اُسے بتانا ہوگا۔ کیا اُسے ہر بات بتانا میرا فرض ہے؟ مجھے عاقلہ کے کچھ راز بھی رکھنے ہیں اور کچھ ایسی باہمی باتیں جو ہم دونوں کی ملکیت ہوں گی۔

مجھے ایک دم املی اجنبی لگی جس کی مجھے ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی ضرورت تھی۔ وہ میرے لیے اجنبی ہو سکتی تھی لیکن میں شاید اُس کے لیے اجنبی نہ ہوں۔ اُس نے مجھے ہمیشہ کی طرح اپنے پاس بلا لینا ہے اور اِس طرح عاقلہ کا اور میرا ہر راز اُس تک پہنچ جائے گا۔ کیا اُس کا ہونا ضروری ہے؟ میں نے اُسے کاٹ کے پھینک دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں آہستہ سے ہلا کہ عاقلہ جاگ نہ جائے۔ میرے ہلنے سے اُس کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی اور پھر اُس نے کروٹ لے لی۔ میں نے گاؤن پہنا اور باہر آ کے دبے قدموں مالی کے ڈربے نما کمرے کی طرف چل پڑا۔ میں کسی کو نظر بھی نہیں آنا چاہتا تھا کیوں کہ شبِ عروسی کو دولہا کا ایسے دبے پاؤں نکلنا ایک منفی پیغام ہے۔ مالی کے اُس چھوٹے سے گودام میں سے مجھے کلہاڑی ڈھونڈنے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔ کلہاڑی ہاتھ میں لیے خالی دماغ اُس بھاری رطوبت کی بو رچے کمرے میں کھڑا رہا۔ میری حالت اُس قاتل سی تھی جس نے کسی کا قتل اِس لیے کرنا ہے کہ خود کو مار سکے۔ کیا میں اپنے آپ کو مارنا چاہتا تھا؟ نہیں! میں نے ایک درخت کو کاٹنا تھا۔ کیا املی کی درد میں ڈوبی magnified کراہ سننے کا میں متحمل ہو سکوں گا؟ درخت بے جان اور بے زبان ہوتے ہیں۔ میں نے کلہاڑی کو مضبوطی سے تھاما اور مالی کے گودام سے باہر آ کر ہوا میں چند وار کیے تا کہ میرے بازو میں خون کی حرکت تیز ہو جائے۔ سارا گھر سجاوٹی بتیوں کی روشنی میں نہایا ہوا تھا اور میں اُس اندھیرے کونے کی طرف چل پڑا جہاں املی میری منتظر تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے تنے کا زمین کے ساتھ جُڑا ہوا وہ حصہ تھا جس پر میں نے وار کرنا تھا۔ میں ایک گہرے ارتکاز کے ساتھ وہاں پہنچا جہاں میں نے جانا تھا اور پہلا وار کرنے کے لیے کلہاڑی کو قوس بناتے ہوئے نظر اُٹھائی تو سامنے میری طرف دیکھتی ہوئی روشنی میں ایک خلا تھا!

☆☆☆☆

عاطف علیم

طربیہ خداوندی جدید

(قاطع طربیہ خداوندی از دانتے)

طربیہ خداوندی (قدیم) کا تیرھواں کانتو اور لایعنیت کے بے انت پھیلاؤ میں پھیلا خودکشوں کا جنگل۔

تم جو خوش بخت ٹھہرو اور اس کائنات پر محیط جہنم زار کے طبقاتِ ارضی میں برپا ابسرڈ سفاکیت سے رہائی پانے کی کوئی ترکیب کر پاؤ تو تمھیں یہیں آنا ہوگا۔

یہ مقامِ لامقام جو لاموجود کی لکھو لکھا پرتوں میں سے کسی ایک بے نام پرت میں نہاں ہے اور سیاہ دھند کے مرغولوں کی پناہ میں ہے، تمھارے لیے ناگزیر ابدی جائے پناہ ٹھہرا دیا گیا ہے۔ کچھ اور نہیں تو تمھاری تنوع پسند طبیعت کو یہاں پہنچ کر قرار ضرور مل جائے گا۔ روز کے روز نئے عذاب اور روز کے روز نئے چٹخارے۔ واللہ! طبیعت بشاش ہو جائے گی۔

تم جو یہاں آنا چاہو تو کوئی ایسا مشکل بھی نہیں، ارضِ فنا نصیب سے رہائی کا پروانہ ہاتھ آتے ہی تم بھائی تھاناٹوز کے خودکار بندوبست کے تحت وقت کو لاوقت سے جدا کرتے دریائے ظلمات کے کنارے از خود پہنچا دیے جاؤ گے۔ تبھی کہیں سے ایک مہیب شکل کی کشتی نمودار ہوگی۔ اس کشتی کو کھینے والا، ایک ڈراؤنی شکل کی انسان نما مخلوق جسے دیکھ کر ہنسی ضبط کرنی مشکل ہو، تمھیں کشتی میں بٹھلائے گا اور شب دیجور سے سیاہ تر پانیوں کے پار پہنچا دے گا۔

اک ذرا ٹھہریو، تمھیں خبردار کیے جاویں کہ کیرون نامی یہ سرپھرا یادگار ہے ملاحوں کی کسی معدوم نسل کی جو مذکور ہے کہ غیض کے پانیوں میں بیرا کرتی تھی اور دیوثیت میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔ اس مضحک مخلوق نے نامعلوم زمانوں کے کسی خدا سے زوری یا یاری میں دریائے ظلمات کے دونوں کناروں بیچ کشتی رانی کے حقوق حاصل کر رکھے تھے اور مذکور ہے کہ بشاشت اور مذاقِ سلیم سے عاری اس قبیل کا ہر فرد دوسرے کی جورو اور ماس خود پر مباح رکھتا اور گروہی روایت کے عین مطابق کسی دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار کر چپوار چلانے کے حقوق جیتا کیا کرتا تھا۔

اپنے یہ کیرون صاحب (خدا ان کا حامی و مددگار ہو) اپنے پیشرو ملاحوں کی تین نسلوں کے گھونٹ بھر چکے تب کہیں جا کر انھیں معدوم ہوتی نسل کا آخری فرد ہونے کا ٹائٹل اور چپوار چلانے کے حقوق نصیب

ہوئے۔ سومیاں! کشتی میں بیٹھنا تو ذرا دھیان سے۔ اپنی نگاہ نوک پا کے ساتھ باندھے رکھنا اور ہنسی ٹھٹھول تو خیر لپیٹ لپوٹ بغل میں دابنا ہی، بیکار کی سوشلائزیشن سے بھی گریز کرنا ورنہ تم انھیں جانتے ہی نہیں۔

خیر، دریائے ظلمات سے آگے جانے کے لیے تمھیں کسی ورجل کو ٹورسٹ گائیڈ ٹھہرانے کی ضرورت نہیں۔ تم کیرون بھیا کے غیض کو ہوا دینے سے باز رہے تو از خود ہلکے ہلکے یہاں، اس دیار ممات میں پہنچ ہی جاؤ گے۔ سیاہ خون سے بھرے درختوں اور زرد چرمراتے پتوں کے اس بن میں۔ زرد پتوں کا بن جو میرا دیس ہے۔ زرد پتوں کا بن جو تیرا دیس ہے۔

ذرا رکو، میں اپنی رو میں بہک کر کہیں اور نکل گیا ہوں۔ مقصود اس مقامِ فرحت بخش کو مارکیٹ کرنا نہیں بلکہ یہ اطلاع بہم پہنچانا ہے کہ میں مامور کیا گیا ہوں کہ اس جہنم زار کے بارے میں حضرت دانتے الیگری اور ان کے سرپرست کلیسا کے عقائد کے تحت رنجور اور مقہور انسانوں کے دلوں میں کلیسائی دہشت بٹھانے کے لیے گھڑی گئی بیکار کی یاوہ گوئی کا بطلان کروں اور اس کی اصل شکل و صورت کو ریکارڈ پر لے آؤں تا کہ جو بندہ بشر مقام فنا سے آئے وہ اس مقام آخر کو بنا شکوہ و شکایت خوش دلی سے اپنا سکے۔

یہ تب کی بات ہے جب میں تمھاری دنیا میں زندگی کیا کرتا تھا (اور خیر سے کیا زندگی تھی وہ بھی!)۔ میں وہاں کے نوع بہ نوع عذابوں، تذلیلوں، تنہائیوں اور رسوائیوں کے ایک طویل اور غیر مربوط سلسلے کو بہلانے کے لیے کتابوں کے ورق الٹاتے پلٹاتے کسی اور دنیا میں نکل جایا کرتا تھا۔ کوئی ایسی دنیا جہاں اور طرح کے لوگ ہوں، اور طرح کے عذاب ہوں۔ اور کچھ نہ سہی کم از کم عذاب دہندگان کے مکھوٹے تو بڑھیا کوالٹی کے ہوں نہ کہ ایسے بوسیدہ اور نچے نچائے کہ ان کے پیچھے سے جھانکتے کریہہ چہرے صاف پہچانے جائیں۔

انھی دنوں مجھے ڈیوائنا کامیڈیا والے موسیو دانتے الی گیری سے تعارف کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس تعارف کا بہانہ تھا ان کی وہ تصنیف جو آج بھی جہنم کے بیان میں حرف آخر تصور کی جاتی ہے۔

ڈیوائنا کامیڈیا میں خیر اور کیا تھا مگر جہنم کا بیان۔ بھئی واہ! کیا نقشہ بندی تھی، کیا جرجور تخیل تھا جیسے کتاب کے پہلے لفظ سے آخری لفظ تک خوف میں بھیگے اسرار کا قالین سا کھلتا چلا جائے۔ مانو جہنم کا سفرنامہ نہ ہو ایک طرح کی ہڈبیتی اور خواہش مرگ کو انگیخت کرتا مرتیو راگ ہو۔ مرتیو راگ بھی ایسا کہ اس میں برفیلی آگ میں سلگتی ہڈیوں کی پرلذت کراہوں اور انتظار کی صلیب پر گڑی بے دید گناہ گار آنکھوں میں پھرتی تیزابی سلائیوں کی اذیت سے جنم پذیر ہوتی پرہوس سسکیوں سے مزین راگنیوں اور بندشوں نے سماں باندھ رکھا تھا۔

میں مسحور سا ہو ڈیوائنا کامیڈیا کے ایک کے بعد ایک کانتو سے گذرتا، نویکلے عذابوں کی بشارتوں

کا تعاقب کرتا اس ظلمت پارے کے قلب میں اترتا چلا گیا۔ کٹ ٹو شارٹ کروں تو یہ کہ ارضِ فنا نصیب میں اپنے چاروں اور پھیلی جمائیاں لیتی بوڑھی سفاکیت سے اور بے ہنر دماغوں کے تخلیق کردہ عذابوں کی بے گیاہ یکسانیت سے اور بار بار دہرائے جانے والے تذلیلوں، تنہائیوں اور رسوائیوں کے طویل وغیر مربوط سلسلے سے رہائی پانے کی جو میں نے ترکیب کی تو اس کی ترغیب میں نے اسی ڈیوائنا کامیڈیا سے پائی۔

میں مارجن آف ایرر رکھتے ہوئے کہوں گا کہ جہنم زار کے اس پروموشنل میٹریل یعنی ڈیوائنا کامیڈیا کا ترمیم شدہ ایڈیشن مرتب کرنے کی اسائنمنٹ جو آج سے کہیں پہلے دانتے کی بجائے میرے سپرد ہوئی ہوتی تو میں اپنی جانب سے ایک عقیدت مند کی ناگزیر یاوہ گوئی کو شامل کرتے ہوئے جہنم زار تک کے راستے کو کچھ ان الفاظ میں تصویر کرتا:

”میں نے جب وقت کی گرد جھاڑ مقام موعود کا قصد کیا تو دیکھا کہ دریائے ظلمات یہ میرے سامنے تھا۔ میں نو نکلے پن کا تمنائی مارے خوشی کے کلکارتا ہوا کالے بھجنگ پانیوں کے کنارے آ بیٹھا کہ ابھی کشتی آئے گی اور دریا پار مجھے بھی کوئی ڈھنگ کا ٹھکانہ نصیب ہو جائے گا۔ چلو یہاں تک تو ٹھیک رہا مگر یہ دیکھ کر دل کچھ بیٹھ سا گیا کہ وہاں دور دور تک کوئی نیا نہ کھیون ہار بس ایک سیاہ رات سی ہے جو اپنے بھیتر میں نت نئے عذابوں کا طومار لیے شانت سی بہے جا رہی ہے۔

خودکشوں کے جنگل کے پار دریائے ظلمات کے کنارے کا یہ حصہ ان لوگوں کے لیے مخصوص تھا جو میری ہی طرح سے اپنی حیات ارضی کا سلسلہ خود منقطع کر کے وہاں پہنچے تھے۔ بھائی تھاناٹوز نے جب مجھے وہاں اتارا تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک خلقت تھی کہ ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ حیات ارضی میں پالی جانے والی عمر بھر کی عادتوں کا بگاڑ بھلا لمحے بھر میں کیسے دور ہوتا سو وہاں بھی ایک عجب سی آپا دھاپی تھی۔ شاید نو واردان نے یہاں بھی پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر پاتال میں اپنے لیے رفعتیں پانے کا امکان فرض کر لیا تھا۔ یہ آپا دھاپی مقام موعود میں بیڈ گورنینس کا پہلا اشارہ تھا۔

نجانے کے وقت تلک ہم لوگ وہاں ڈیرے ڈالے پڑے رہے کہ کوئی سواری میسر ہو تو پار اتریں۔ فرصت میسر تھی سو خوب سوشلائزیشن ہوئی۔ سب کے سب وہ تھے جو زندگی کے امکانات سے تہی ہو چکے تھے۔ سو کسی نے زہر پھانکا، کسی نے گولیاں نگلیں اور کسی نے پھندہ لیا۔ الغرض جتنے بندے اتنے ہی خود ہلاکتی کے طریقے۔ ہم میں ایک حساب کتاب سیکھا ہوا بندہ بھی تھا، جمع تفریق میں سخت کھرا۔ اپنی حیات ارضی کے دنوں میں کہیں ایمانداری کا ارتکاب کر بیٹھا اور نوکری سے گیا۔ اس کے بعد روزگار کی راہ دیکھتے دیکھتے پھانسی لے بیٹھا تھا۔ اس نے بہت پیچیدہ حساب کتاب کر کے بتلایا کہ کیرون پہلوان کی سوختنی سواری نمودار ہونے

تلک کچھ اوپر نیچے ہزار کے لگ بھگ یگ تو بیت ہی چکے تھے۔

خیر، انتظار ختم ہوا، سیاہ دھندلکوں کی دبازت میں سے کشتی نمودار ہوئی اور ہم اس میں دھڑا دھڑا سوار ہو جانب کوچہ دلدار یعنی بطرف تحت الثریٰ چلے۔ کشتی میں سوار ہو سب اپنی اپنی جگہ سنبھال چکے تو ہم نے دیکھا کہ اس اللہ ماری پرانی دھرانی کشتی کا کھیون ہار مسٹر کیرون عجیب کینڈے کا تھا، دیوقامت اور کریہہ و مضحک صورت، اتنی کہ ایک نظر دیکھنے سے کپکپی چھوٹ جائے۔ اس نے چپّو ہاتھوں میں تولتے ہوئے ایک بھرپور نگاہ ہماری جانب کی۔ ان شعلے برساتی نگاہوں میں صاف ایک انتباہ تھا کہ خبردار اپنی اوقات میں رہیو۔ اک ذرا میری مضحک صورت دیکھ چہرے پر ہنسی کا سایہ تک تو لائیو پھر دیکھیو کہ بھرکس نکالنا کسے کہے ہیں۔

اس نے ہماری جانب پشت کی اور چپّو ہولے سے سیاہ پانیوں میں اتار دیے۔ تب بھی وہ دیوث پلٹ پلٹ ہم پر نگاہ کیے جاتا کہ ہے کوئی شامت کا مارا۔ ہم مجبور روحیں بھلا کریں بھی تو کیا۔ سو ہم مقہوروں نے راستہ بھر کیرون پہلوان کی کڑے تیوروں کی زنجیر زنی جھیلی۔ خیر یہ بھی غنیمت تھا لیکن ہوا کیا کہ ایکا ایکی دریا کے کسی شوریدہ دھارے سے ایک ہیبت ناک چہرے والی مچھلی نے جنم لیا اور گویا ہمارے پیچھے ہی پڑ گئی۔ یا وحشت، ابھی اور کیا کیا دیکھنے کو باقی ہے۔ یہ دیو ہیکل مچھلی کہ صاف شری تھی اور اپنے پیٹ میں روحوں کا قبرستان بسائے تھی کیرون پہلوان کی گیدڑ بھبکیوں کو خاطر میں لانے کے موڈ میں ہرگز نہ تھی۔ وہ بار بار بڑھے تھی کہ ہماری کشتی کو الٹا کر دو چار روحوں کی معدومیت سے لذت کام و دہن کا اہتمام کرے لیکن خیر گذری کہ کیرون واقعی میں پہلوان تھا۔ ایک بار جو وہ منحوس مچھلی منہ کھولے ہماری جانب بڑھی تو اس کی آنکھ میں اس دلاور نے ایسا کھینچ کر چپّو مارا کہ چہیوں چہیوں کرلاتی بھاگ نکلی۔"

تو اگر طربیہ خداوندی بطرز جدید لکھنے کا کام میرے سپرد کیا گیا ہوتا تو یہاں تک پہنچ کر میں حضرت دانتے الی گیری کو فرش تک جھکتے ہوئے سلام گذارتا اور ایک رسمی سی شردھانجلی پیش کرتے ہوئے بات جاری رکھتا۔ میں لکھتا:

"تب میں نے دیکھا کہ میں دریائے ظلمت کے پار تھا۔ وہ ایک عجیب رومان پرور جگہ تھی۔ کچھ وہاں کوئی آسمان سا تھا جس سے لٹکا ہوا ایک نیم مردہ سورج جانکنی کے عالم میں ہونک رہا تھا۔ اس کی دم بدم مرتی روشنی سیاہی میں ملگجاہٹ گھولتی ہوئی موت کا کوئی ان بوجھا بھید افشا کیے دے رہی تھی۔ اور وہیں موت کے اس بے پناہ دل فریب رومانس میں کالے بھجنگ مہیب پہاڑوں کے قدموں میں مست خرام سیاہ دھند کے مرغولوں میں ملفوف ایک مہیب تر جنگل جس کا کوئی اور نہ چھور۔ اور پھر جنگل سے ٹرانسمٹ ہوتیں ڈوبتی ابھرتی سسکیاں اور کراہیں، جنسی لذت سے بوجھل، ہل من مزید پکارتی ہوئیں اور ہمارے پرشوق دلوں کو دھڑکاتی

ہوئیں۔ یہ تھا الم نصیب خودکشوں کا جنگل، ڈائیونا کامیڈیا کے تیرہویں کانتو کا موضوع۔

اگر تم پڑھنے والے کو تھوڑی اور منظر نگاری کا دماغ ہو تو بتلاتا چلوں کہ ہمارے اور جنگل کے بیچ ایک پارے کی جھیل حائل تھی جس کی جھلملاتی بوجھل موجوں میں جل پریاں اور جل دیوفری ٹیکس کی ان تھک گرما گرمی میں کاما سوترا کے ایک سو ایک آسنوں کو ایک کے بعد ایک ڈیمانسٹریٹ کر رہے تھے۔ اس پرشہوت بھیانکتا کی سیٹنگ میں اس جھیل اور اس کے لوازمات کا ہونا کچھ ایسا تھا جیسے پبلک کو ورغلانے کے لیے کسی عبادت گاہ میں رنگ برنگ مچھلیوں کا ایکیوریم رکھ دیا جائے۔ اس عجب کی تُک کو ہم نوواردان کیا جان پاتے مگر یہ کہ بے ہودگی کو چھوتی بدمذاقی ایک یونیورسل ٹرتھ ہے اور اس پر محض زمین والوں کا اجارہ نہیں ہے۔

کیرون پہلوان کو آگے کا کچھ زیادہ پتا نہیں تھا۔ بصورت لجاجت بہت سی رشوت وصولنے کے بعد وہ اپنی گھورتی آنکھوں کے ساتھ ہمیں اتنا ہی بتا سکا کہ ہمیں پارے کی جھیل میں ڈنڈ مچاتی تہذیب سے عاری اس مخلوق کی واہیاتی کا نوٹس لیے بغیر جھیل کی نیم ٹھوس مردگی پر پاؤں پاؤں چلتے سیدھے اس جنگل کی اور جانا ہوگا۔ سو اس کے کہے پر ہم نے اپنی لطافت کا بھاری بوجھ کندھوں پر ڈالا اور ابدالآباد تک اپنا بھگتان بھگتنے کو جنگل کی اور چل دیے۔"

میں اس ان لکھی عذاب بیتی کا مفروضہ مصنف اگر جو دانتے بھیا کے بے لگام تخیل کو بروئے کار پاتا تو کتیا امید کے تعاقب میں لگی دم توڑتی روحوں کو راہ پر لگانے اور ان میں جہنم زار کے ہاٹ سپاٹ کی سیاحت کا لپکا جگانے کے لیے کچھ یوں اپنی گوہر فشانی جاری رکھتا:

"تب راستے میں ایک کلاک ٹاور آیا۔ یہ گویا ایک سرحد تھی کہ یہاں تک سیلیسٹی ایل ٹائم کی راجدھانی ہے اور اس کے آگے قلمرو ہے فیوچر لیس نیس کی جو عبارت ہے اتم اداسی اور گھنی چپ سے۔ یوں جیسے سمندر ساحل پر ٹوٹ پڑنے سے پہلے دم سادھ لے اور پیش آمدہ تباہی کا سوچ کر اداسی کے گہرے بھنور میں ڈوب جائے۔

میں اپنے جیسے بہت سے خودکشوں کی ہمراہی میں خامشی کی ٹھوس کثافت میں چپو کی طرح بازو چلاتا آگے بڑھا۔ میرے سامنے کالا بھجنگ کوہ ندا تھا اور جنگل تھا اور مایوسی کی دولت لٹاتے کسی مصور کا تخلیق کردہ سیاہ منظر تھا جس کی کوکھ سے پھوٹتی اٹوٹ اداسی مجھے اپنی اور کھینچے جائے تھی۔ مجھے بس اپنا آپ اس کے حوالے کرنا تھا۔ سوچوں ہی میں نے خودسپردگی کا تاثر دینے کو اپنے بازو پھیلائے اچانک مقدس خاموشی ایک چھناکے سے ریزہ ریزہ بکھر گئی۔

یہ ایک دھمکی تھی، ایک دھیمی اور مسلسل غراہٹ کی صورت میں لرزاتی ہوئی جو بلند قدیمی پیڑوں کے سلسلہ ہائے دراز سے ذرا پہلے جلی ہوئی جھاڑیوں کی اوٹ سے میری جانب بڑھی۔ میں نے نگاہ کی تو وہاں جگنو

سی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میرے قدموں کو جہاں تہاں سیاہ دلدلی زمین نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور پھر آنکھ کی اگلی جھپک تلک نفرت میں سکڑی تھوتھنیوں سے جھانکتے لمبے نوکیلے دانتوں اور فرش تک لہراتی سرخ زبانوں والی اساطیری مخلوق مجھے گھیر چکی تھی۔ وہاں، زمین پر تو میرے جسم میں چیونٹیاں دوڑانے کو گلی کے کتے بھی بہت ہوا کرتے تھے یہ تو پھر اساطیری درندے تھے، میرے ایتھریکل وجود کو پھاڑ کھانے کے لیے بے تاب۔ میں بدحواس سا ہو بھاگا کہ اچانک پاؤں رپٹا اور میں اندھی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔''

یہاں ایک اختلافی نوٹ جو کسی جلد باز نے میری غیر تحریر شدہ الم غلم کے نیچے تیز قلمی سے گھسیٹ دیا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ نوٹ لکھنے والا میرا ہی اور سیلف تھا یا کوئی اور دانتے کا ڈسا ہوا دل جلا جو دانتے پر پل پڑنے کو مجھ سے زیادہ بےتاب تھا۔ ایمانداری کا تقاضا ہے کہ میں اسے بھی شیئر کرتا چلوں، لکھا ہے:

''جب میں حماقت کا مارا فی الواقعی بھائی دانتے کے جھانسے میں اس غیر ارضی وغیر سماوی جہنم زار میں فروکش ہونے کی حماقتِ صریح کا ارتکاب کر بیٹھا تو مجھ پر کھلا کہ غلیظ رالوں سے لتھڑی لمبی عباؤں والے کارڈینلوں اور پاپاؤں کی سدابہار دھار مک انٹر پرائزز سے وابستہ اس چالاک سیلز ایجنٹ نے مجھے کہاں لا مارا ہے۔

ہم دھتکاری ہوئی، متصور گناہوں کی دلدل میں ڈوبی ہوئی گندی روحوں سے ہائی برو اشراف کی نفرت بجا لیکن ڈیوائنا کامیڈیا کے اس تیرہویں کانتو میں کوئی آپا دھاپی سی آپا دھاپی ہے، کوئی بدتہذیبی سی بدتہذیبی ہے۔ اب وہاں پر ایک تسلسل سے جاری یہ چیختی چنگھاڑتی رننگ کمنٹری ہی ملاحظہ فرما لو کہ اخ ''بوسیدہ معبدوں کے متولی، دراز ریش پیشواؤں کے سفارش یافتہ اور زمین پر دھمک دھمک چلنے کے دائمی حقوق یافتہ معززین ایک جانب تشریف فرما ہو جائیں اور۔۔۔ اوئے کسی بھک منگے کی اولاد! تم کہاں چل دیے؟ چپکا کھڑا رہ، الو کا پٹھا۔۔۔ اور ہاں، تم میں سے جو کشکول بردار ہیں جو راندہ ہیں اور ٹھوکروں کا رزق ہیں اور خاص طور پر وہ فراری جو عذابوں کا کوٹہ پورا ہونے سے پہلے ہی بھاگ نکلے ہیں دوسری جانب چلے جائیں۔ تم لوگوں سے حساب کتاب الگ سے ہوگا۔ اور خبردار لائن ٹوٹنے پائے وغیرہ وغیرہ۔''

یہ بھی کوئی بات ہے،؟۔۔۔ یہاں کسی کو آدابِ میزبانی کے معنی بھی نہیں معلوم؟۔

نہایت غلط لوگ ہو تم بھائی دانتے! تم نے جہنم کو بھی اپنے کارپوریٹ تقاضوں کے طابع کر چھوڑا ہے؟

جبھی تو بھائی دانتے نے ڈیوائنا کامیڈیا کے بیان میں یہاں، ڈیوائنا کامیڈیا کے تیرہویں کانتو میں صاف ڈنڈی ماری ہے اور جہنم زار کی امیج بلڈنگ کی دھن میں فنِ اشتہار نویسی کے زریں اصولوں کی پاسداری میں یہاں کے میزبانوں کی بنیادی انسانی آداب سے دانستہ لاپرواہی کا ذکر صاف گول کر گئے۔ جب کبھی میں نے جہنم زار کا باقاعدہ احوال رقم کرنا شروع کیا تو میں یہاں روا رکھے جانے والی کلاس ڈسٹنکشن پر یقیناً سخت

الفاظ میں احتجاج کروں گا کہ میں بہر حال کسی دانتے وانتے کی طرح غلیظ رالوں سے لتھڑی لمبی عباؤں والے کارڈینلوں اور پاپاؤں کا کفش بردار نہیں بلکہ اس باغیرت گروہ کا فرد ہوں جو از خود، اپنی مرضی اور اپنے آزاد ارادے کے ساتھ زندگی کی بوسیدگی کو اتار کر خداؤں کے منہ پر دے مارنے کی جرات رکھتا ہے ۔

اوراب اگلی بات کہ ڈیوائنا کامیڈیا میں بھائی دانتے نے معصوم خودکشوں کو رجانے اور اس نابکار مقام تک کھینچ لانے کے لیے جو افتراع پردازی کی اس کا عذاب تو خیر اس کی گور گردن پر لیکن مجھے، کہانی ماتا کے ایک ادنیٰ پجاری کو، کون گناہوں کی سزا دی گئی؟ میرے حصے میں گناہ تو خیر کیا آتے البتہ ناکردہ گناہوں کی حسرت ضرور ہے جس کا کوئی شمار نہیں ۔ مجھے سزا ملی تو کس بات کی کہ فی الاصل گناہوں کا ارتکاب تو الٹا میرے خلاف کیا گیا ۔

معاملہ یوں ہے کہ روز ازل سے آسمان سے ملامت کے پتھر مجھ غریب کوزہ گر پر برستے رہے ۔ جانے کب کوہ اولمپس میں شری دیوتاؤں کی کسی فلیگ سٹاف میٹنگ کے دوران میرا کیس ڈسکس ہوا اور پھر شنوائی کا موقع دیے بغیر مجھے سنگساری کا سزاوار ٹھہرا دیا گیا ۔ اور پھر اللہ دے اور بندہ لے، تاک تاک کر مجھے نشانہ بنایا گیا ۔ اگر آسمان سے نزول کرتی ملامت کے پتھر جو کبھی موتی ہوتے اور میں انھیں چن چن ایک لڑی میں پروتا تو میں اسے دسیوں بار آسمان کے نسیان کدے میں کہیں گری پڑی شکستہ پیالی کہ جسے کرہ ارض کہیں، کے گرد لپیٹ سکتا تھا اور پھر بھی پھانسی کے رسے برابر لڑی بچ رہتی ۔''

کسی نامعلوم خودکش کی جانب سے تحریر کیا گیا اختلافی نوٹ تمام ہوا اور اب میری بات کہ اگر میں حیات ارضی کے دوران وقت کاٹنے کو طربیہ خداوندی کا جدید ایڈیشن بمع ترمیم و اضافہ مرتب کرتا تو میں جہنم کی منظر نگاری کا سلسلہ کچھ یوں جاری رکھتا:

''میں وہاں لے جا کر بھٹکائے جانے کے دوران گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا کہ اپنے ہاں کی داستانوں کے مصداق اچانک ایک مہربان ہاتھ نے مجھے تھام لیا ۔ تعارف کا شرف حاصل ہوا تو معلوم پڑا کہ بزرگ موصوف کا نام نامی پابلوس ورجیلیس مارو المتخلص بہ ورجل ہے، کبھی شاعری کا شغل فرمایا کرتے تھے مگر اب یگوں سے رائٹرز بلاک کا شکار ہیں ۔ گویا ہماری تمھاری طرح اپنی سابقہ شہرت سے کام چلایا کرتے ہیں ۔ کام وام تو کوئی خاص ہے نہیں بس عند الطلب یا کہہ لو کہ پارٹ ٹائم کے طور پر جہنم کے ٹورسٹ گائیڈ ہوا کرتے ہیں ۔ بزرگوارم کا نام بہت سنا تھا، درشن آج ہوئے ۔ ماضی کا طلسمی ہالہ اتار کر ایک طرف رکھا جائے تو حضرتِ ورجل بس گوارہ قسم کی شخصیت تھے ۔ ہمارے دور میں ہوتے تو اپنی شاعری سمیت کب کے اٹھا کر حلقہ ارباب ذوق کی سولی پر چڑھائے جا چکے ہوتے ۔ قصہ کوتاہ، اس بے زار صورت بزرگ نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم چل

پڑے سوئے جہنم۔''

میری طلسماتی یاوہ گوئی تمام ہوئی کہ تحقیق یہ وہ ربش تھا جو میں ارضی زندگی میں خود کو نوع بہ نوع عذابوں بیچ خود کو بہلائے رکھنے اور اپنے دس بائی بارہ فٹ کے گھٹن بھرے بے در کمرے میں امید کی کھڑکی تراشنے کو اپنے بھس بھرے دائمیں دماغ میں لیے پھرتا تھا۔ اگر طربیہ خداوندی کے باب میں میری رنگ آمیزی گھڑے پر پھسلتی بوند کی مانند تم پر سے گذر گئی ہو تو سمجھو بال بال بچے۔ میری طرح دانتے کی رنگین وسنگین بیانی کا شکار نہیں ہوئے۔ موسیو موصوف نے غیر ارضی جہنم زار کی فضول نقشہ بندی کر کے مجھے ورغلانے کے جس جرم کا ارتکاب کیا اس کی رسید دینے کو میں کب سے انھیں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ اگر جو کہیں مل جائیں تو ان کی باتصویر رطب ویابس یعنی ڈیوائنا کامیڈیا کا مجلد ایڈیشن اٹھا کر ان کی طوطے جیسی ناک پر دے ماروں کہ یہ کون تک ہے کہ غایت درجہ سنجیدہ معاملات پر بات کی جائے تو یوں لگے گویا گلی کے لونڈے گپ مار رہے ہوں۔ مختصر یہ کہ صاحب ایسا میں نے کچھ لکھا نہ تم نے پڑھا۔ اب آگے چلتے ہیں۔

میں وہاں، زندگی کرنے کے دنوں میں موت کے رومانس میں تھا سو ڈیوائنا کامیڈیا کا پہلا ورق پلٹتے ہی کسی نوخیز دوشیزہ کی طرح موسیو دانتے کی گمکری سے سحر زدہ ہو گیا۔ غلطی میری تھی کہ میری عذاب خواہی مجھے نئے ذائقوں کے لیے بے تاب کیے دے رہی تھی وگرنہ میں ایسا سادہ بھی نہ تھا کہ جان نہ پاتا کہ کسی اسقف اعظم کا کفش بردار کیا نہائے گا کیا نچوڑے گا۔ اس کا لفنگا تخیل موت کے پرہول تقدس کے اس پار کیا جھانک پائے گا کہ نگاہ اس کم نگاہ کی گندی مکھی کی طرح کسی مولانا اسقف اعظم کے چھابے پر ہی منڈلاتی رہے تھی۔ حالانکہ اس کے چھابے میں کیا ہونا تھا سوائے تھیالوجی کی مٹی سے بنے رانگلے سیبوں کے یعنی وہ وعدہ فردا جو یہ کاہن لوگ اپنی دکانداری چمکانے کو بیچتے پھرتے ہیں۔ اب اگر دانتے کا یہی نصیب تھا کہ وہ فیوچر لیس فیوچر کے اس دھندے میں کاہنوں کا چھوٹا بن کر بعد کی نسلوں کو پڑا پرچائے تو اس کی مرضی۔

یوں بھی سوچو کہ ایک تھیالوجسٹ بیچارہ باتوں کے کنکوے اڑانے کے سوا کیا جانے ہے؟ وہ مقدس سایوں کی پناہ میں بیٹھا کیا جانے کہ ریگزاروں میں سرابوں کے پیچھے ننگے پاؤں بھاگنے والوں کے حلق میں کے کانٹے اگے ہیں؟ اور پھر یہ کہ جسے خوش وقتی کی بدنصیبی لاحق ہو وہ بدنصیب کیا جانے کہ زندگانی جب چوتیاپے پر اتر آئے تو کیا کیا غضب ڈھائے ہے۔ وہ کچھ جانے تو تھیالوجی کو ہی پیشہ کرے؟ معصوم روحوں کو چکمے دینے کو ہی روزی روٹی کا وسیلہ ٹھہرائے؟ ۔ اسے تو بس اچمنی لگی رہے ہے کہ کسی مقدس الوژن کے معلق معبد میں بڑھ چڑھ کر سیمنٹ گارا لگائے یا اپنے تئیں مائیکل اینجلو بنا معبدوں کی چھتوں اور دیواروں پر رنگ گارا ضائع کرے اور بدلے میں محبوبیت کا سزاوار ٹھہرے۔ وہی دو کوڑی کی محبوبیت جس کا اوج یہ ہے کہ بندہ دانتے بن جائے

اور متصور گناہ گاروں کو ڈراوے دے دے مارتا رہے۔

بات لمبی کھنچ رہی ہے لیکن مفاد عامہ کے لیے بتلاتا چلوں کہ حضرت مولانا دانتے الیگری کی قبیل کیا ہے۔ دیمک کھائی کتابوں میں جو نہیں لکھایا لکھے کو مٹا دیا گیا وہ یہاں عام گپ کا موضوع ہے کہ موصوف کے اجداد کالی ماتا کے پجاری ہوا کرتے تھے اور ٹھگی کا پیشہ فرماتے تھے۔ موسیو موصوف جب ویسٹرن کلیسا کے تحت چلنے والے ایک دینی مدرسے میں زیر تعلیم تھے تو ان کے خیالات میں تغیر رونما ہوا سو حضرت نے آبائی کام سے ہاتھ اٹھا لیے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی زیادہ معزز پیشے کی تلاش میں کئی جگہ ہاتھ پاؤں مارے۔ کچھ عرصہ کوتوال شہر کے ساتھ ناؤٹ بنے پھرا کیے۔ پھر ضلع کچہری میں دو دو روپلی کے لیے جھوٹی گواہی دینے کو پیشہ اختیار کیا اور خوب مال بنایا۔ ایک غیر مصدق اطلاع کے مطابق ذی وقار موسیو کہ ایک مقرر سحر بیان تھے بھیس بدل کر فلورنس کی سڑکوں پر مجمع لگا کر سانڈے کا تیل بیچتے اور گناہ گاروں کے دلوں میں ہول جگا کر ان کے کھیسے خالی کرایا کرتے تھے۔ لیکن خیر، یہ کوئی ماننے والی بات نہیں ہے کہ یقیناً ان کی اس نوع کی سرگرمیاں ایک پائے کا سانڈک تھیالوجسٹ بننے کی تربیت کا لازمی جزو رہی ہوں گی ورنہ کہاں عالی تبار موسیو اور کہاں سانڈے کا تیل۔ ویسے اس خوش گمانی سے ورا دیکھو تو ان کا سینڈو بن جانا کوئی ایسی اچنبھے کی بات بھی نہیں کہ علم الکلام تو کچھ ایسے ہی تماشے دکھلایا کرے ہے یعنی سانڈے کا تیل وغیرہ۔

تم نے دانتے کی سن لی، اس کے گرو تھامس ایکوناس کی بھی سن لی اب اگر دماغ ہو تو اک ذرا میری بھی سن لو۔

تم جانو کیا ہوا تھا۔ بہت برا، بہت ہی برا۔ میں کہ میرے لیے (اور میرے جیسے سوچنے سمجھنے والے دماغوں کیلیے) زندگی دھکتے کوئلوں سے مزین ایک مسلسل راہ گزر سے کچھ کم نہ تھی اور میں کہ دنیاوی بندوبست سے باہر کہیں کنارے جینے کا عادی تھا جیتے جیتے اُوبھ چلا تھا یعنی انف از انف جس کے بعد مرحلہ تھا انکار کا، اب اور نہیں، ہرگز نہیں والا۔

تم پوچھو گے کہ میری حیات ارضی کے دوران ایسا کیا ہوا تھا جو میں نارمل زندگی جینے کے لائق نہ رہا تھا۔ کیا بتاؤں الا یہ کہ میں بھیڑوں کے گلے سے الگ کھڑا اپنے انسان ہونے پر مصر تھا کہ میرے پاس ایک دماغ تھا جو سوچ سکتا تھا، اس دماغ کے ساتھ جڑا ہوا ایک اعصابی نظام تھا جس کا ہر ایک ریشہ تیز حساسیت کا حامل تھا سو میں سوچ سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا اور اختلاف کر سکتا تھا۔ میں آزاد حالت میں پیدا کیا تھا اور اپنے ڈھب سے جینا چاہتا تھا۔ بھیڑوں کے گلے کو بس یہی گوارہ نہ تھا سو مجھے تنہا کر کے مارا گیا اور مجھ پر توہین اور تذلیل کو روا ٹھہرا دیا گیا۔

بنی نوع انسان کا ایک ادنیٰ کمزور سا فرد کتنی سی تنہائی اور کتنی سی توہین برداشت کرسکتا ہے؟۔ سو ایک روز ڈیوائنا کامیڈیا پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اور کب تک؟

تب فیصلہ کن لمحہ آنے سے اک ذرا پہلے میں نے دھول سے ماتھا اٹھایا۔ گلی کے لونڈے لونڈیوں کے برسائے ہوئے پتھروں سے سرخم سرخ جسم کو پونچھا اور پورے قد سے تن کر کھڑا ہو گیا، اب اور نہیں۔ تب میں نے لال انگارہ آنکھوں سے چہار سمت نگاہ کی اور قہرمانی کے ایک سُچے لمحے کے گیان میں زندگی کی بساط لپیٹ دی۔

میرے پاس ابھی تھوڑی مہلت باقی تھی کہ روح بدن سے کٹتے کٹتے ہی کٹتی ہے (روح اور بدن کے سچے رشتے کا گیان مجھے تبھی ہوا تھا)۔ سو میں نے اپنی تازہ قبر پر اوس کے چند اداس قطرے نچھاور کیا اور ایک گلاب کی پتی پر اپنا آخری لمس ثبت کیا اور اپنے گرد ایک تیز گھماؤ لیتے ہوئے جہنم سے ملاپ کے لیے تیار ہوا۔ اب میرے سامنے تھا ڈیوائنا کامیڈیا کا تیرھواں کانتو اور اس کے پھیلاؤ میں پھیلا خودکشوں کا جنگل۔

دریائے ظلمات کے پار خودکشوں کے جنگل میں پہنچ کر میں نے ازل سے ابد کے درمیان والے نینو سیکنڈ پر محیط اس جنگل کی یخ بستگی کو اور اس کی قدیم سیٹنگ کو محسوس کیا اور سوچا تسلیم کہ وہاں تا حکم ثانی درختا دیا جانا کسی آوارہ مزاج روح کے لیے برداشت سے باہر ہوسکتا ہے لیکن طریوں طریوں کے اساطیری درندوں کی معیت اس بور کن عذاب کی کسی حد تک تلافی بھی کرسکتی تھی۔ اور پھر چوڑے اور مضبوط پروں والی نیم زن ہارپیوں کے ساتھ ابدالابد تک رومانس کا نشہ۔ ان ٹھونگے مارتی، نوچتی کھسوٹتی خوبرو حسیناؤں کی کسی گم گشتہ مانوسیت کو جگاتی دائم رفاقت ۔۔۔ آہ! جنسی تلذذ میں بھیگے اس عذاب پر سو بہشت قربان۔

سو اب میں یہاں ہوں اور نئے خودکشوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں اور وہاں میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا ہے۔ سو اگر تم موت کے رومانس میں ہو تو ڈیوائنا کامیڈیا جیسی لایعنیت سے گذرو اور اک ذرا کھڑکی کھول کر تازہ ہوا کو پھیپھڑوں میں اتارو اور جانو کہ لاریب جہنم زار کہیں اور نہیں تمھارے اپنے بھیتر میں دھواں دے رہا ہے۔ یہیں تھوڑا گہرائی میں تمھیں تنی گردنوں والے کارڈینلوں اور پاپاؤں کے کفش بردار دانتے الیگری کی پرلوک کہانی کی یاوہ گوئی کے مطابق خودکشوں کا جنگل بھی ملے گا۔

جان لو کہ جو دانتے الیگری نے لکھا اور جو میں نے لکھنا چاہا پر نہیں لکھا، سب جھوٹ ہے اور مان لو کہ خودکشوں کا جنگل کہیں اور نہیں تمھاری ارضِ فنا نصیب پر محیط ہے اور تم سب کے سب اس جنگل میں قرنوں کے لیے بھٹکا دیے گئے ہو۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر احمد حسن رانجھا

پھیری والا چڑیا گھر

بیساکھ کی تپتی دوپہر، ہر طرف گرمی اور بھوسے کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ لوگ گندم کاٹ رہے تھے۔ سمیٹ رہے تھے۔ بابے چپ شاہ کے مزار پہ میلہ لگ گیا تھا۔ بیساکھ کی آخری جمعرات سے لے کر اتوار تک بابے چپ شاہ کے مزار پر میلہ لگتا تھا۔ لوگ دور دور سے موضع غوث پور میں آتے۔ بابے کے مزار پہ حاضری دیتے۔ چڑھاوے چڑھاتے۔ دیگیں پکتیں۔ نیاز تقسیم کی جاتی۔ ڈھول کی تھاپ پہ دھمالیں ڈالی جاتیں، دودھ جلیبی کی دوکانیں سجتیں، پکوان پکتے، برف کے رنگ برنگے گولے ریڑھیوں پر بنتے اور بکتے تھے۔ موت کے کنویں میں اسکوٹر چلتا۔ دو دو روپے میں بارہ سنگھے، ببر شیر اور کالے ریچھ کے درشن ہو جاتے۔ گشتی چڑیا گھر میں پنجروں کے اندر یہ جانور سہمے سہمے بیٹھے رہتے۔ لوگ انھیں مڑ مڑ کر دیکھتے، گھورتے اور اشارے کرتے باہر نکل جاتے۔ نوجوانوں کی ٹولیاں کبڈی کھیلتیں۔ اس کے دل میں بار بار ایک خواہش کروٹ لے رہی تھی، پاسے مار رہی تھی کہ چپ شاہ کا میلہ دیکھنا ہے۔ جیب خالم خالی تھی۔ جیسے مائی پھاتاں کا منہ خالی ہے۔ بالکل خالی اور بغیر دانتوں کے منہ میں دیر تک روٹی پپولتی رہتی ہے جیسے انور ماشکی کو بخار ہوا تھا، اس کی مشک خالی پڑی تھی۔ میلہ بھی ضرور دیکھنا تھا۔ جیب بھی خالی تھی۔ چیلیاں والا سے غوث پور دس میل کے فاصلے پر تھا۔ پورے دس میل۔ تانگے والا پانچ روپے کرایہ لیتا تھا۔ پانچ آنے کے پانچ جانے کے کل ملا کے دس روپے ہو گئے۔ میلے کی بہاریں بندہ خالی جیب کے ساتھ تو لوٹ نہیں سکتا تھا۔ پرانے کیکر کے نیچے بیٹھا کب تک اسی سوچ میں گم تھا کہ روپوں کا بندوبست کیسے کیا جائے۔ آخر کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ سر اٹھا کے دیکھا تو سامنے نوری تھا۔ اَنوتر کھان کا شرارتی لڑکا۔

"کیوں بھئی شریفے کن سوچوں میں گم ہو؟" نوری نے کندھے پہ ہاتھ رکھے رکھے کہا۔

"یار غوث پور میں بابے چپ شاہ کا میلہ شرع ہو گیا ہے۔ ......" اس نے نوری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوئے یہ ایسا کون سا حساب کا سوال ہے کہ تو سوچوں میں گم بیٹھا ہے۔ سارے پنڈ بلکہ سارے علاقے کو پتہ ہے کہ میلہ شروع ہو گیا ہے......" نوری آلتی پالتی مار کر اس کے ساتھ کیکر کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔

”یار پتے کو چھوڑ یہ بتا میلہ دیکھا کیسے جائے؟“ شریفے نے نوری کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”بھئی یہ بھی کوئی حکیم لقمان سے پوچھنے کی بات ہے؟ ان دو آنکھوں سے میلہ دیکھا جائے گا اور کیسے!......“ نوری نے اپنی بات پہ خود ہی قہقہہ لگایا۔

”دو آنکھیں تو رب سوہنے نے ہر ایک کو دی ہیں اور پیدا کرتے ہی دے دی ہیں۔ پر عقل مت کسی کسی کو ہی دی ہے...... بے وقوفا میلہ دیکھنے کے لیے دو آنکھوں کے ساتھ ساتھ روپے بھی چاہئیں۔ جیب خالی ہے جیسے تیرا یہ مٹکے جیسا سر بھیجے سے خالی ہے۔“ اس نے طنزیہ انداز میں نوری کا تمسخر اڑایا۔

”پیسوں کا انتظام کیسے ہوگا؟ سوچنا پڑے گا......“ نوری یہ کہہ کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”جلدی سے کوئی طریقہ سوچ یار...... پیسوں کا بندوبست کر کہیں سے!!!“ شریفے نے کہا۔

”اتنی سی بات تو تجھے سمجھ آ ہی جانی چاہیے کہ روپے نہ تو درختوں پر لگے ہیں کہ اتار لیں اور نہ کہیں زمین میں دبا رکھے ہیں کہ وہاں سے نکال لاؤں...... کوئی ترکیب لڑانی پڑے گی پیسوں کا انتظام کرنے کے لیے......“ نوری نے تنکے سے زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے کہا۔

”لڑا پھر تو جنتر منتر......“

نوری کافی دیر تک لکیریں کھینچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ وہ کیکر کے نیچے بیٹھ کر اُسے دیکھتا رہا۔ کافی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد وہ اٹھا اور اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ نوری آگے آگے تھا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے۔ اس کا رخ پنڈ سے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گاؤں سے باہر آ گئے۔ ہر طرف کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ کھیت جن کے کناروں پر شیشم کے درخت سینہ تانے کھڑے تھے۔ لمبے تنوں اور چھوٹے پتوں والے شیشم کے درخت۔ کھیتوں کے اندر ہر طرف گندم کے چھوٹے چھوٹے ٹنڈ تنے بکھرے ہوئے تھے۔ گندم کی فصل اٹھا لینے کے بعد کھیت ہل کے منتظر تھے۔ چلتے چلتے وہ چودھری نذیر کے ڈیرے کے قریب پہنچ گئے۔ دوپہر کی تپتی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں چپ چاپ چل رہے تھے۔

”یار یہ چودھری نذیر کے ڈیرے پر کیا کرنا ہے؟“ بالآخر شریفے نے چپ کا روزہ توڑا۔

”چودھری نے آج ہی گندم سمیٹی ہے کھیتوں سے اور لا کر ڈیرے کے صحن میں ڈھیر کر دی ہے۔ کل تک وہ گندم بوریوں میں بھر کر منڈی میں پہنچا آئے گا......“

”تو پھر؟......“ وہ بات کی تہہ تک ابھی تک نہیں پہنچ سکا تھا کہ یہ لوگ چودھری کے ڈیرے پر کیوں جا رہے ہیں؟

”تو پھر یہ کہ ہم ایک من گندم چوری کریں گے...... بابو تیلی کی دکان پر بیچیں گے اور میلے میں جا کر

عیاشی کریں گے‘‘ نوری نے منصوبہ کھول کر رکھ دیا۔ اُس کے اعصاب پر خوف طاری ہو گیا۔

’’یار کہیں پکڑے نہ جائیں؟......‘‘ بالآخر یہ خوف لفظوں کی صورت اس کی زبان پر اتر آیا۔

’’تو فکر نہ کر، کام نہایت صفائی سے ہوگا، پکڑے جانے کا کوئی خطرہ نہیں حوصلہ کر......‘‘

’’دیکھ لے چودھری کو پتا چل گیا تو لم لیٹ کر کے جوتے مارے گا......‘‘ شریفے کا خوف بدستور قائم تھا۔

’’تجھے کہا ہے ناں کہ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی......‘‘ نوری نے انتہائی پر اعتماد لہجے میں کہا۔

ڈیرے پر پہنچ کے وہ دونوں جامن کے گھنے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ شکر دوپہر میں ڈیرہ سنسان پڑا تھا۔ کسی ذی روح کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ لوگ کام کاج ختم کر کے گھر وگھری پہنچ چکے تھے۔ جامن کے درخت کے نیچے لگے نلکے سے انھوں نے پانی پیا۔ قمیص کی آستین سے منہ پونچھا۔

’’تو ادھر کھڑا رہ، آس پاس نظر رکھ...... میں اندر سے مال لے کر آتا ہوں۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو تو سیٹی بجا دینا۔‘‘

نوری ڈیرے کی طرف بڑھا، اچک کر وہ کچی دیوار پر چڑھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ دیوار پر بیٹھا اندر جھانکتا رہا اور پھر چھلانگ لگا کر اندر اتر گیا۔ شریفا جامن کے درخت کے نیچے کھڑا ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ جامن کی چھاؤں کے نیچے پتہ نہیں کیوں اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے جیسے تاپ چڑھ گیا ہو۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ دل کے دھڑکنے کی آواز کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی آ نہ جائے۔ پکڑے نہ جائیں۔ پکڑے گئے تو وہ چھترول ہوگی کہ نانی یاد آ جائے گی۔

کچھ دیر بعد پٹ سن کی آدھی بھری ہوئی بوری کچی دیوار پر نمودار ہوئی۔ اس کے بعد نوری دیوار پر آ بیٹھا۔

’’اوئے شریفے ادھر آ......‘‘ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ لرزتے کانپتے ہاتھوں اور پیروں کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔

’’اوئے مرد بن مرد!...... یہ کیا تجھے ملیریا ہو گیا ہے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ لے بوری پکڑ‘‘ نوری نے طنزیہ انداز میں کہا اور بوری نیچے سرکا دی۔ من بھر دانوں کا بوجھ کندھوں پر اٹھا کے وہ کھڑا ہو گیا۔ نوری نیچے اترا۔ اب کیا کرنا ہے؟ شریفے نے کندھوں پر بوری کا توازن درست کرتے ہوئے کہا۔

’’بابے گامے کے کھیتوں کی منڈیر پر جو سرکنڈے ہیں ناں ان میں بوری چھپا دیتے ہیں۔ میں بابو تیلی سے ابھی جا کر بات کر لوں گا۔ اندھیرا پڑنے پہ بوری اٹھا کر اسے دے آئیں گے......‘‘ بابو تیلی پنڈ میں غلہ کا بیوپار کرتا تھا۔ نوری آگے آگے شریفا بوری اٹھا کے اس کے پیچھے پیچھے۔ نوری تو چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ شریفا پسینوں پسینی گردن گھما کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بس ڈرتا ڈرتا اس کے پیچھے چلتا رہا۔ بابے

گامے کے کھیتوں کے پاس سرکنڈوں میں بوری چھپا کے وہ دونوں گاؤں کی طرف چل پڑے۔

گھر جا کر پتلی لسی کے گلاس چڑھائے، اچار کے ساتھ روٹی کھائی، پھر پرانے کیکر کی چھاؤں میں پہنچ گئے۔ شام تک نوری اور وہ کیکر کی چھاؤں میں گڈی چرا کھیلتے رہے۔ شام کے سائے گہرے ہوئے تو نوری اٹھ کر بابو تیلی کی دکان پر چلا گیا جب کہ اس نے گھر کا رخ کیا۔ اماں ہانڈی پکانے کے بعد تندوری پر روٹیاں لگا رہی تھی۔ وہ چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”شریفے آج تُو چپ چپ ہے......“ اماں نے آٹے کا پیڑا گھڑتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں اماں......“ دراصل وہ اس وقت اضطراب اور خوشی کی درمیانی حالت میں تھا۔ اماں نے روٹیاں لگائیں۔ چبوترے پر پیڑے رکھے۔ ہانڈی رکھی۔ کندروی میں لپیٹ کر چنگیر کے اندر روٹیاں رکھیں۔

”آجا پُتر روٹی کھا لے......“

”اماں دل نہیں کر رہا......“

”دو چار نوالے ہی کھا لے۔ خالی پیٹ بندے کو بددعائیں دیتا ہے......“ اماں نے کولی میں سالن ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھ کر چبوترے پر پہنچ گیا۔

پیڑھی پر بیٹھا تو اماں نے سالن کی کولی سامنے رکھ دی۔ اس نے دو چار لقمے زہر مار کیے۔ کھانا حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ پیتل کے گلاس سے دو گھونٹ پانی پیا تو روٹی نیچے ہوئی۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور چپ چپیتا چارپائی پہ جا کے بیٹھ گیا۔ نوری نے گلی میں آ کر تین بار جھینگر کی آواز نکالی۔ وہ باہر نکلا۔ نوری گلی کی نکڑ پہ کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اس کی طرف چل پڑا۔ وہ دونوں بابے گامے کے کھیت کی طرف چل پڑے۔ سرکنڈوں میں سے انھوں نے بوری اٹھائی۔ چھپتے چھپاتے بابو تیلی کی دکان پر پہنچے۔ بابو نے کنڈے پر بوری تولی، من سے پانچ سیر کم تھے۔ بابو نے یقیناً ڈنڈی ماری تھی۔ بوری میں من بھر سے پانچ سات سیر زیادہ ہی دانے تھے۔ بابو ہاتھ دکھا گیا تھا، وہ احتجاج بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے بوری تول کر ایک طرف رکھی۔ جیب میں سے سو سو کے آٹھ سرخ نوٹ نکالے اور نوری کو تھما دیے۔ بابو نے تولا بھی کم تھا اور اب قیمت بھی کم ادا کر رہا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ نوری نے چپ چاپ نوٹ پکڑ کے جیب میں ڈال لیے۔

”صبح سات بجے تانگوں کے اڈے پر پہنچ جانا......“

”ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گا......“ یہ کہہ کر نوری نے اپنے گھر کا رخ کیا اور شریفے نے اپنے گھر کا۔

صبح سات بجے وہ بڑی نہر کے پل پر پہنچ گئے۔ پل کے ساتھ تانگوں کا اڈا تھا۔ مندی مصلی کا تانگہ غوث پور جانے کے لیے تیار تھا۔ شریفا اور نوری پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ تانگہ سواریوں سے بھر گیا تھا۔ مندی

نے لاغر اور کمزور گھوڑے کو چھانٹا رسید کیا۔ تانگہ کچی سڑک پر ہچکولے کھاتا چل پڑا۔ کوئی دو گھنٹے راستے کی دھول مٹی پھانکنے کے بعد وہ غوث پور پہنچ گئے۔ گاؤں کے باہر بابے چپ شاہ کا مزار تھا۔ میلہ زوروں پر تھا۔ مندی نے مزار کے قریب اتار دیا۔ کرایہ دے کر ان دونوں نے میلے کا رخ کیا۔ میلہ جوبن پر تھا۔ لوگوں کا جم غفیر تھا۔ نوجوانوں کی ٹولی ایک طرف کبڈی کھیل رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کبڈی دیکھتے رہے۔ ایک جگہ درویش ڈھول کی تھاپ پر دھمال ڈال رہے تھے، وہاں کھڑے رہے۔ لوگوں کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے رہے۔ بے پناہ بھیڑ تھی۔ دونوں پسینے سے بھیگ گئے۔ پھیری والے چڑیا گھر کے دروازے سے انھوں نے دس دس روپے کے ٹکٹ لیے اور اندر داخل ہو گئے۔ پنجرے میں شیر ببر تھا، بھالو تھا، کوڈیوں والا سانپ بین پر رقص کر رہا تھا۔ ایک پنجرے میں دو سہمے ہوئے بن مانس بیٹھے تھے۔ وہ چڑیا گھر دیکھ کر باہر نکلے۔ موت کے کنویں کا نظارہ کیا۔ بہت شدید بھوک لگ رہی تھی۔ وہ بھیڑ میں کہنیاں مار کے راستہ بناتے اچھے پہلوان کی دودھ دہی کی ہٹی پر پہنچے۔ دودھ جلیبیوں کا آرڈر دیا۔ وہ کھائیں، بھوک باقی تھی۔ میٹھی سفید دودھ رس ملائیاں کھائیں۔ پیتل کے دو لمبے لمبے گلاس الائچی والے دودھ کے چڑھائے۔ مزہ آ گیا۔ سرور سا چھا گیا۔ نوری نے پیسے پوچھے۔

"بادشاہو! ڈیڑھ سو روپیہ بل ہے......" اچھے پہلوان نے دودھ کا گلاس ایک گاہک کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ نوری نے جیب میں ہاتھ ڈالا، ہاتھ ایسے نیچے اتر گیا جیسے گہرے کنویں میں ڈول اترتا ہے۔ اس نے ہاتھ باہر نکال کے پھر جیب میں ڈالا۔ ہاتھ پھر نیچے اتر گیا۔ جیسے کھائی میں کسی نے پتھر پھینک دیا ہو۔ نوری کے چہرے پر پریشانی چھا گئی۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اس کی پریشانی کا اثر شریفے تک پہنچ چکا تھا۔ نوری کی جیب کٹ گئی تھی۔ چوروں کو مور پڑ چکے تھے۔

"پیسے نکالو! رک کیوں گئے ہو......" پہلوان نے ذرا غصیلے لہجے میں کہا۔

"وہ پہلوان جی بھیڑ میں کسی نے جیب صاف کر دی ہے......" نوری نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"اوئے تم تو مجھے شکل سے ہی عادی مفت خورے لگتے ہو......اوئے کاکے! اوئے بلو!! اوئے پکڑ لو انھیں، مزہ چکھاؤ ذرا مفت خوری کا" اچھے پہلوان کے لہجے میں زہر تھا۔ اچھے کے ملازموں نے پکڑ کر خوب درگت بنائی۔ چھترول کی۔ کڑاہی کے تھلے سے کالک لے کر منہ کالے کیے۔ بلو اندر سے ٹوٹے لچھروں کے دو ہار لے کر آ گیا۔ وہ شاید انھوں نے ایسے ہی لوگوں کے لیے ریڈی میڈ رکھے ہوئے تھے۔ گلے میں چھتروں کا ہار اور منہ پر کالک مل کر پورے میلے میں پھیرایا گیا۔ لوگ انھیں مڑ مڑ کر ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ پھیری والے چڑیا گھر کے بندر ہوں۔ یہ تماشہ تو انھیں دس روپے کے ٹکٹ کے بغیر ہی میسر آ گیا تھا۔

☆☆☆☆

جمیل حیات

صُورِ اسرافیل

آج وہ بہت خوش تھا۔ اِس دن کا اُس نے بہت بے چینی سے انتظار کیا تھا اُس دن سے جب سے اُس کی تخلیق ہوئی تھی اور وہ اُس جماعت میں سے تھا جنھوں نے اُس کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا تو اب جب کہ اس کو آزمائش کی بھٹی میں سے گزارے جانے کا اعلان ہوا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ پر جوش نہ ہوتا؟ یہی وجہ تھی کہ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ جب وہ جماعت سے الگ کیا جانے لگا تو اس کے ساتھ والوں نے کلمۂ تاسف ادا کیا کہ اتنی حسین جگہ کو چھوڑ کر وہ خواہ مخواہ خود کو گناہوں میں لتھڑنے کی آرزو کیوں کر رہا تھا؟ وہ ان کی طفلانہ سوچ پہ ہنستا کہ میدانِ کارزار میں ہی تو صلاحیتوں کے جوہر کھلتے ہیں اور پھر اپنے ہونے کا، اپنے وعدے کی پاسداری کا، خود کو اُس ایک کا وفادار رہنے کا ثبوت دینے کا جب وقت اور موقع مل رہا تھا تو وہ کیسے پیچھے ہٹتا؟

وہ بلند ہمت تھا، پھر وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شر کا منبع کیسے اتنی بلند مرتبت ہستیوں کو بھی سکون کا سانس لینے کا موقع نہیں دیتا تھا اور کیسے وہ اپنے محبوب کی توجہ کی بدولت صدیوں سے اپنے ازلی دشمن اور کائنات کے سب سے بڑے بھید کے بھیدی کو انگاروں پر لوٹنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ وہ خود اس ساری کیفیت کو خود اپنے آپ پر آزمانا چاہتا تھا۔ شاید وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے پرکھوں کو مصیبت میں ڈالنے والے کی آزمائش بھی کرنا چاہتا تھا۔ جو بھی تھا بہت خوب تھا۔ آدم زادہ آدم کے دشمن کا سکون غارت کرنے کے لیے میدانِ عمل میں آ رہا تھا۔

……

ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا۔ گزرے دس سالوں میں کئی بار ایسا ہوا کہ وقت نے اس کو خوش کرنے کے لیے تین چار اور کبھی کبھار دس پندرہ دن بھی اوپر کیے لیکن بوسیدہ شجر کی سوکھی ٹہنیوں پر بہار نے کوئی ادھ کھلا پھول بھی کھلنے نہ دیا۔ یہ بات بھی نہیں کہ وہ شروع سے خزاں رسیدہ تھی۔ ایسی بات نہیں تھی۔ وہ جس زمین سے تعلق رکھتی تھی وہاں کے تو چھوٹے چھوٹے پودے بھی پھل دینے لگے تھے لیکن وہ جو عین بہار کے موسم میں پیا ملن کو سدھاری تھی اور اس وقت اس کا جوبن عروج پر تھا اور مالی بھی درخت کی دیکھ بھال کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ بار آور نہ ہو سکی۔ حالانکہ اس کی چھوٹی بہنیں جن کی شادیاں اس کی شادی

سے تین اور پانچ سال کے عرصہ بیت جانے کے بعد ہوئی تھیں اب تین تین بچوں کی مائیں تھیں اور وہ تھی کہ امید کی خواہش میں ترس رہی تھی لیکن اس بار ان ہونی ہو گئی تھی۔ ہاں اس بار پورا مہینہ بیت گیا تھا اور رات کو خواب جو اس نے دیکھا تھا وہ بھی بہت خوبصورت تھا۔ وہ ایک چھوٹے بچے کی انگلی تھامے ایک بہت ہی خوبصورت باغیچے کی سیر کر رہی تھی۔ وہاں دنیا جہاں کے درخت تھے اور ان درختوں پر دل کو موہ لینے والے پھول اور پھل آراستہ کیے گئے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ جس پھل کی خواہش کرتی وہ پھل خود بخود اس کی جھولی میں آ گرتا۔ آنکھ کھل جانے کے بعد بھی وہ اسی خواب کے طلسم میں قید تھی۔ یہ کیفیت کافی عرصہ اس کی ہم نشیں رہی۔

آج وہ اپنے شوہر کے ساتھ شہر کی سب سے بڑی لیبارٹری میں ٹیسٹ کرانے آئی تھی اور چند لمحوں بعد ہی ٹیسٹ کی پازیٹو رپورٹ نے اسے رب کے حضور سجدہ ریز ہونے کا ایک اور موقع دے دیا۔ وہ تھی بھی ایسی کہ خالق کے ساتھ ساتھ مخلوق کا شکریہ ادا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی اس لیے گھر پہنچتے ہی جہاں اس نے دو نفل شکرانے کے ادا کیے وہیں اپنے شوہرِ نامدار پر بھی عنایات کی بھرمار کر دی کہ خالق کے ساتھ ساتھ خستہ ہو جانے والے شجر کی آبیاری کرنے میں اہم اور بنیادی کردار تو اس کے شوہر عبداللہ کا ہی تھا۔

یونہی بیٹھے بیٹھے ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ اگر حلال کھایا جائے تو کتنی خوشی ہوتی ہے اور اگر حرام ۔۔۔۔ اسے یاد آیا کہ اس کے گھر کام کرنے والی حمیداں اس دن کتنا روئی تھی جب اس کی نوعمر بیٹی کی الٹیاں نہیں رکتی تھیں تو یہ وہی تھی جو ان ماں بیٹی کو ایک جاننے والی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھی کیوں کہ اس کا ہلدی ہوتا چہرہ اس کے جرم کی گواہی دے رہا تھا۔ بعد میں حمل ٹیسٹ نے اس کے خدشات کو درست ثابت کر دیا۔ وہ معصوم بچی کسی کے بہکاوے میں آ کر کلی سے پھول بن گئی تھی۔ کتنی مشکل سے، حمیداں کے بار بار منتیں سماجتیں کرنے سے، اس نے اس نوعمر لڑکی کی مشکل تو آسان کرا دی تھی لیکن بعد میں بہت عرصے تک ایک نامعلوم بچے کی آہوں اور سسکیوں کی آواز نے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اس نظر نہ آنے والے معصوم کو کیا بتاتی کہ اس کا دنیا میں آنا ایک حوا زادی کے لیے اس کی باقی آنے والی زندگی کو کانٹوں کے حوالے کرنے مل کہ اسے زندہ درگور کرنے کے مترادف تھا اس لیے اس کا نہ آنا ہی بہتر تھا لیکن اس ناکردہ گناہ کے لیے جو اس نے کسی کے بہتر مستقبل کے لیے کیا تھا وہ رب کے حضور سجدہ ریز رہی تھی کہ اس کو معافی دی جائے۔

تو اب اسے حلال اور حرام کا فرق اور احساسات کا درست عرفان ہو گیا تھا۔ وہ خوش تھی کہ اس نے انجانے میں بھی کبھی ایسی غلطی نہیں کی تھی جو اسے بے چین رکھتی۔ وہ مطمئن تھی۔ اب اسے ایک وقتِ معین تک

انتظار کرتا تھا تا کہ خالق کی طرف سے دی جانے والی اس عظیم امانت کا بار اٹھائے جو مقدر والوں کا نصیب ہوتی ہے۔ پچھلے دس سال کتنی تیزی سے گزر گئے تھے اور اب جب کہ اسے خوش خبری دی گئی تھی اب دن گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس نے خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی اور اس کا سارا سسرال اس کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔

……

آج جب اسے اذنِ سفر دیا گیا تھا تو وہ خوشی اس سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ اگرچہ اسے کہا گیا تھا کہ اس کا یہ سفر بہت مختصر ہوگا لیکن وہ اس پر بھی شکر گزار تھا کہ اس پر اعتماد تو کیا گیا تھا۔ وہ جو نیتوں کا جاننے والا تھا، اس کی بے چینی اور جلد از جلد کامیاب لوٹ آنے کی خواہش کا ادراک رکھتا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ایک مخصوص جگہ پر اس نے ایک مقررہ وقت تک رہنا ہے اور پھر ۔۔۔۔۔ مگر وہ وصل اور ہجر کے بین بین دو متوازی لیکن دور دور راہوں کا شیدائی لطف و انبساط کے مزے لے رہا تھا۔

جب ایک پھونک نے اسے آن کی آن میں کائناتِ اکبر سے کائنات اصغر میں لا پھینکا تو ہوش و حواس کی دنیا میں آنے میں اسے کچھ وقت لگا۔ وہ ابھی ہونے اور نہ ہونے کی کیفیت کے درمیان کہیں موجود تھا۔ اسے سمجھ نہیں آئی کہ وہ کہاں تھا۔ پھر اس نے سانس لی: اپنے محبوب سے دور لیکن اس کے ہونے کا محسوس کیے جانے کا مکمل ادراک رکھتے ہوئے اس نے مسکراتے ہوئے نہ صرف اسے اپنے قریب پایا بلکہ اپنی نئی میزبان کو بھی اپنے ہونے کا یقین دلا دیا۔ اس وقت وہ کچھ بھی نہیں تھا لیکن وہ تھا۔ ہاں تھا تبھی تو جب اس نے پہلا سانس لیا تو اس کی میزبان نے گھر بھر کو اس کے ہونے کی گواہی دی تھی اور پھر اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کی میزبان کی قدر و منزلت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔

یہ جگہ بہت پُرسکون تھی جیسے جنت۔ یہاں اسے سب کچھ بن مانگے، بغیر خواہش کیے مل رہا تھا۔ اسے کچھ بھی تو نہیں کرنا پڑتا تھا۔ حالانکہ اسے بتایا گیا تھا کہ جہاں اسے بھیجا جا رہا تھا وہاں پل پل لوگ جدوجہد کرتے تھے۔ کچھ ہیجڑے تھے جو دنیا کی طلب میں خود کو رسوا کر رہے تھے۔ یاد رہے کہ یہ مرد پیدا کیے گئے تھے لیکن اپنے محبوب سے بے رخی برتتے اور ایک کم تر شے کی خواہش کرنے پر ان کو ہیجڑا کہا گیا۔ پھر ایسے بھی تھے جو خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی محبت میں خالق کی عبادت کیے جا رہے تھے۔ یہ بھی مرد پیدا کیے گئے لیکن اپنے محبوب کو، اس کی باتوں کو سمجھنے کی غلطی نے ان کو مؤنث کا لقب دلا دیا۔ ان لوگوں کو علم ہی نہیں تھا کہ وہ بھی مخلوق ہی کے طلب گار تھے۔ اور ایک گروہ وہ تھا جن سے اس کا تعلق تھا جو اپنے محبوب کے ہی ہو کر رہ گئے اور اس کے لیے انھوں نے اس کی مخلوق کی طرف نگاہ ہی نہیں کی۔ ہاں جنت اور دوزخ بھی تو خلق ہی کی گئی تھیں۔ تو پھر

گھاٹے کا سودا یہ لوگ جانتے بوجھتے کیوں کرتے تھے۔ وہ یہ جان نہ پایا۔ وہ ایک نئی دنیا کی رنگینیوں میں کھو سا گیا تھا۔ ایک بار پھر اس نے تخلیق کے مرحلے سے گزر رہا تھا: ”کتنا دلچسپ لیکن اذیت ناک مرحلہ ہوتا ہوگا یہ اس کی اور اس جیسی میزبانوں کے لیے کہ وہ اپنے لہو سے ایک نئی شخصیت ایک نئی ہستی کے تار و پود بُنتی کتنی خوبصورت، کتنی دل ربا لگتی ہوں گی۔

ابھی اسے یہاں رہائش اختیار کیے چوتھا مہینہ تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی نقل و حرکت سے اس کی میزبان کو کبھی کبھار تکلیف بھی ہوتی تھی لیکن یہ اس کے اختیار میں ہی کب تھا تاہم اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کی میزبان بھی اس کی قربت سے لطف اندوز ہوتی تھی کیوں کہ وہ کبھی کبھار اس سے گفتگو بھی کرتی تھی۔ اس کے لہجے میں عاشقی کے تمام تر رنگ محسوس کیے جا سکتے تھے۔ وہ اس کی نازبرداریاں اٹھانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی۔

اس کی میزبان جس کا نام حرا تھا آج کل بہت خوش تھی۔ اس کا شوہر اس کا خیال کرتے نہ تھکتا۔ اس کے دونوں دیور اس کی ایک پکار پر الہ دین کے جن کی طرح لمحوں میں آموجود ہوتے۔ اس کی دونوں نندیں جب بھی اس کے گھر آتیں اس کے آگے پیچھے ہی گھومتی رہتیں۔ یہی حال اس کے ساس سسر کا بھی تھا۔ ساس تو اس کی بلائیں لیتی نہ تھکتی۔ سسر بھی اس کے لیے ہر وقت دعاگو رہتے جب کہ وہ خود اپنے خالق کے حضور سجدہ ریز رہتی کہ اس نے اسے اس لائق سمجھا کہ اس کی جھولی میں اتنی بڑی خوشی ڈال دی۔ زندگی سے حقیقی معنوں میں وہ اب لطف کشید کر رہی تھی۔ اس کے ماں باپ، بہن بھائی خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے۔ وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی اور شادی کے بعد ایک سال تو اس نے عیش و عشرت میں گزارا تھا تاہم اولاد کی شدید خواہش رکھنے کے باوجود قدرت کی طرف سے تاخیر ہوتی گئی۔ وہ بد دل ضرور ہوئی تھی لیکن مایوس قطعی نہیں کیوں کہ یہ بات جانتی تھی کہ مایوسی کفر ہے۔ بالآخر ایک طویل انتظار کے بعد اس سے پہلے کہ حالات اس کے مخالف ہوتے اور اس کے دوست، دشمنوں کے خیر خواہ ہوتے ،قدرت نے اس پہ اپنا انعام کر دیا۔

پانچواں مہینہ تھا، مہمان سانس لیتا تو اسے ایک خوشگوار حیرت کا احساس ہوتا۔ اس احساس میں تفاخر کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا جو اسے یہ یقین دلاتا کہ وہ مکمل ہونے جا رہی تھی وہ جانتی تھی کہ عورت تخلیق کے عمل سے گزرنے کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔ اس کی ایک ایک حرکت کی اسے خبر ہوتی یہاں تک کہ کبھی وہ اس کی بے خبری کے عالم میں کروٹ بدلتا یا ٹانگ آگے پیچھے کرتا تو درد کے مارے اس کے منہ سے سسکاری نکل جاتی۔ وہ چونک کر ادھر اُدھر دیکھتی ؛ کوئی موجود نہ ہوتا تو مسکرا دیتی اور اسے سرزنش کرتی۔ اس بناوٹی غصے میں جوش کھاتا، ابلتا پیار ہی پیار موجزن ہوتا: ”شریر کہیں کا، ابھی سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔“ اور اگر کوئی پاس ہوتا تو اس کا چہرہ

حیا کی لالی سے سرخ ہو جاتا اور وہ شرما کر نگاہیں جھکا دیتی۔

وہ میکے میں ہوتی یا سسرال میں، اس کی آؤ بھگت ہوتی۔ اب اسے کام بھی نہ کرنے دیا جاتا لیکن ایک بات کا دھیان اس نے رکھا تھا۔ گزشتہ پانچ ماہ سے جب سے اسے مہمان کے آنے کی خبر ملی تھی اس نے با وضو رہنا اور قرآن پاک کی تلاوت کو جزوِ زندگی بنا لیا تھا۔ یہ اس کے لاشعور کی کارستانی تھی۔ اس نے کہیں کسی ایسی معتبر اور بزرگ ہستی کے بارے میں پڑھا تھا کہ جب وہ پیدا ہوئے تو ان کو قرآن پاک یاد تھا۔ جب تحقیق کی گئی تو پتا چلا تھا کہ ان کی ماں حمل کے دوران قرآن پاک کی تلاوت بکثرت کرتی تھیں۔ یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھ گئی اور اس نے بھی فوراً عمل شروع کر دیا۔

وقت گزرتا گیا؛ اس کے چہرے سے پھوٹتا نور اس کے پاک باطن ہونے کی گواہی دیتا اس کے سسرال والوں کو اس کا گرویدہ کیے رکھتا۔ وقت آہستہ روی سے گزر رہا تھا اور اس کی بیقراریوں میں اضافہ کر رہا تھا۔

....

اس کو صورت عطا کر دی گئی۔ بنانے والے نے اس کو اپنی صورت پہ بنایا تھا۔ وہ اس بات پر نازاں تھا کہ اسے جس حیثیت میں چند مستعار لمحے گزارنے کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا وہ روپ اس کے نائب کا تھا۔ سو وہ نائب بنا کر بھیجا گیا اور اس کی حمد و ثنا کرتا رہا۔ اس کی میزبان، اس کو دنیا میں لانے کی آدھی ذمہ دار، تخلیق کے پیچیدہ اور اذیت ناک مرحلے سے گزرنے والی؛ اس کی پیاری ماں، اس کی حرکات پہ خندہ زن ہوتی تو اس کو بھی یک گونہ مسرت ہوتی۔ اپنائے جانے کا احساس اس میں لطف و انبساط کے ان چھوئے جھرنے بہا دیتا اور وہ ان لطیف جھرنوں میں بہتا اپنے خالق کی حمد بیان کرتا جس کے لطف و کرم نے اسے خود سے دور کر کے بھی دور نہ ہونے دیا تھا یوں ہجر کا یہ طویل صحرا بھی وہ اطمینانِ قلب سے پار کر رہا تھا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا وہ مسرت کشید کر رہا تھا: ایک نئے جہاں سے متعارف ہو رہا تھا۔ انھی دنوں اس پر ایک اور بھید کا انکشاف ہوا۔ اسے مطلع کیا گیا کہ اس کی میزبان کو تخلیق کے کرب ناک لمحات سے بچا لیا گیا ہے۔ وصل آشنا روح کو قرار تو آ گیا لیکن اپنی میزبان، اپنی ماں سے بچھڑنے کی سوچ نے اس کے دکھ میں اضافہ بھی کر دیا۔

....

ساتواں مہینہ تھا؛ وہ تھکاوٹ سی محسوس کر رہی تھی۔ اس کی نندیں آئی ہوئی تھیں۔ شام کا وقت تھا۔ موسم بھی خوشگوار تھا۔ فیصلہ ہوا کہ سیر کو چلتے ہیں۔ بچے بھی خوش ہو گئے۔ گاڑی آ گئی؛ اس نے گاڑی میں بیٹھنا چاہا تو اس کو ایسے لگا جیسے اس کے جسم کا حصہ بننے والے نے جانے سے انکار کیا ہو۔ اس کا بار بار کروٹ لینے کا

اندازا سے بے چین کر رہا تھا۔ اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اپنے گھر کو دیکھا جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔ پھر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

سب خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے تھے اسے بہت بھلا لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک بارونق اور خوبصورت جھولوں سے مزین ہنستے کھیلتے بچوں کی آوازوں سے بھرپور پارک کے قریب جا رکی۔ باری باری سبھی گاڑی سے اترے۔ وہ بھی اتری۔ تھکاوٹ اس کے انگ انگ سے ظاہر ہو رہی تھی۔ بچوں کی چہکار اور والدین کے ہنستے مسکراتے چہرے آنکھوں کو بھلے لگ رہے تھے۔ اس کا جی چاہا یہ منظر یونہی رک جائے۔ انھوں نے ٹکٹ لیے اور خارجی دروازے سے اندر داخل ہوئے ابھی وہ جھولوں کے پاس پہنچے ہی تھے کہ اس نے ایک باریش نوجوان کو دیکھا۔ وہ جھولوں کے پاس ہی آ رہا تھا۔ اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی حالانکہ موسم خوشگوار تھا۔ چادر کی ضرورت نہیں تھی۔ بس ایک لمحے کو اس کی نگاہیں اس نوجوان کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ اسے وہاں ویرانیوں کا ہجوم نظر آیا۔ اتنی خالی خالی آنکھیں۔۔۔ اگلا لمحہ قیامت کا تھا۔ اس نے نوجوان کو ٹکڑوں میں بٹتے دیکھا لیکن شاید یہ ایک لمحہ ہی تو تھا۔ اتنی خوفناک چنگھاڑ۔ اطمینان سے لیٹا وہ بھی چونکا۔ یہ چنگھاڑ۔۔۔۔ یہ تو اس وقت آئی تھی جب۔۔۔ جب قیامت نے آنا تھا تو کیا قیامت۔۔۔۔۔ بس یہ آخری سوچ تھی۔ ہر طرف چیخ و پکار۔۔۔ آگ و خون میں لتھڑے ہوئے معصوم بچے، ارمانوں سے بھری خواتین اور مرد؛ سبھی ٹکڑوں میں اس طرح بٹ رہے تھے جس طرح وہ قوم بٹی ہوئی تھی جس کا وہ حصہ بنایا گیا تھا۔ یہ قیامت ہی تو تھی۔۔۔ آن کی آن میں جسم کے قفس میں قید وصل کے خواہاں نے اڑان بھری کہ شربت دیدار اسی صورت پیا جا سکتا تھا۔ بس ایک خوشگوار احساس تھا کہ اس کی میزبان، اس کی پیاری ماں اس واپسی کے سفر میں اس کے ہمراہ تھی۔

☆☆☆☆

محمد جمیل اختر

ایک الجھی ہوئی کہانی

"لو آج میں تمھیں ایک کہانی سناتا ہوں یہ کہانی سو سال پرانی ہے"

"سو سال؟"

"ہاں تقریباً سو سال"

"نہیں بھئی ہم نہیں سنتے اتنی پرانی کہانی، دنیا چاند پر پہنچ چکی ہے اور تم ہمیں سو سال پرانی کہانیاں سنا رہے ہو"

"کچھ کہانیاں کبھی پرانی نہیں ہوتیں، وہ وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور سدا جوان رہتی ہیں، جب تک انسان کے دکھ سکھ ایک سے ہیں کہانیاں ایک سی ہی رہیں گی"

"نہیں تم ہمیں کوئی نئی کہانی سناؤ بالکل نئی بلکہ آج کی کہانی سناؤ"

"آج کی کہانی؟"

"ہاں آج کی کہانی، ہمیں کوئی ایسی کہانی سناؤ کہ کچھ وقت گزرے اس ہسپتال میں لگتا ہے وقت ٹھہر گیا ہے سو کوئی قصہ سناؤ دوست لیکن آج کا قصہ"

"آج تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی ہاں بس ایک فون آیا تھا کہ شبیر نے اپنی بیوی سلمیٰ کو طلاق دے دی ہے"

"اوہ اچھا تو تم ہمیں اسی شبیر کی کہانی سناؤ"

"شبیر کی کوئی خاص کہانی نہیں ہے وہ میرا بچپن کا دوست ہے اور ایک ساتھ پڑھتے، اور کھیلتے رہے ہیں جیسا کہ میں نے کہا کہ اُس کی کوئی خاص کہانی نہیں ہے بس یہ کہ جب ہم میٹرک میں تھے تو اُسے سلمیٰ سے محبت ہوگئی اور ہم دونوں گاؤں کے راستوں پر سلمیٰ کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر گھنٹوں انتظار کرتے تھے، تم اس قصے کو چھوڑو میں تمھیں سو سال پہلے کی کہانی سناتا ہوں اور تم دیکھو گے کہ کس طرح ایک دولت مند ایک غریب کی عزتِ نفس کو مجروح کرتا ہے، یہ تب کی بات ہے جب ہمارے گاؤں میں دریائے سندھ پر پُل بن رہا تھا۔"

"نہیں نہیں رکو بھئی ہمیں بتاؤ شبیر کی کہانی میں آگے کیا ہوا؟"

"قصہ مختصر یہ کہ شبیر چوں کہ گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار کا بیٹا تھا سو جب اُس کے گھر والے

اُس کا رشتہ لے کر سلمیٰ کے گھر گئے تو سلمیٰ کے گھر والے انکار نہ کر سکے اور انھوں نے سلمیٰ سے پوچھے بغیر شادی کے لیے ہاں کر دی۔۔۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ جب ہمارے گاؤں میں پُل بن رہا تھا تو بہت سے آفیسر زدور دور سے ہمارے گاؤں آئے تھے جب کہ مزدوروں میں زیادہ تر لوگ مقامی تھے۔ اور ان مزدوروں میں کرمو بھی شامل تھا جو کے گاؤں کا سب سے غریب آدمی تھا۔"

"لیکن جب شبیر کو سلمیٰ سے محبت تھی تو طلاق کیسے ہو گئی، بات کچھ سمجھ نہیں آ رہی"

"اصل میں یہ بات لوگوں میں مشہور ہے کہ شادی کی پہلی ہی رات سلمیٰ نے شبیر کو کہہ دیا تھا کہ مجھے تم سے نفرت ہے اور یہ شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی ہے"

"اوہ اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

"کس کا کرمو کا؟"

"نہیں بھئی شبیر کا؟"

"شبیر زمیندار کا خون تھا بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اُس کی بیوی کسی اور سے محبت کرے سو وہ روز سلمیٰ کو پیٹتا اور کہتا مجھے بتاؤ تمھیں کس سے محبت ہے، پر سلمیٰ عجیب عورت تھی اُس نے چھ ماہ تک شبیر کو نہیں بتایا کہ اُسے کس سے محبت ہے۔"

"اچھا پھر؟"

"پُل پر کام کرنے والے ایک صاحب کے پاس بہت قیمتی گھڑی تھی جو کہ انھوں نے ولایت سے لی تھی، ایک دن کیا ہوا کہ وہ صبح اٹھے تو ان کی گھڑی غائب تھی انھوں نے سارے مزدوروں کو بلایا، مزدور سارے ہی غریب تھے لیکن کرمو کی حالت سب سے زیادہ پتلی تھی اور اُس سے ایک دن پہلے ہی اُس نے صاب سے اپنے حالات کا رونا رو کر تنخواہ بڑھانے کی گزارش کی تھی سو صاحب کو شک ہو گیا کہ چور یقیناً کرمو ہی ہے سو انھوں نے کرمو کو کہا کے وہ انھیں ان کی گھڑی واپس کر دے ورنہ وہ کوڑے مار مار کر گھڑی نکلوا لیں گے"

"لیکن ہم تو شبیر اور سلمیٰ کے بارے پوچھ رہے ہیں"

"ارے بھئی چھوڑو بھی سلمیٰ اور شبیر کو، ہوا کچھ یوں تھا کہ چھ ماہ بعد سلمیٰ نے ایک روز شبیر سے کہا کے اُسے شبیر کے دوست یعنی مجھ سے محبت ہے"

"اوہ یعنی تم بھی اِس کہانی کا حصہ ہو؟"

"نہیں نہیں میں تمھیں دوسرا قصہ سناتا ہوں کہ جب کرمو پر الزام لگا تو اُس نے بہت قسمیں کھائیں اور کہا کہ وہ غریب ضرور ہے لیکن چور نہیں، پر تمھیں تو پتا ہے غریب آدمی کے لیے یہ ثابت کرنا کتنا مشکل ہے کہ وہ

سچ بول رہا ہے۔ سو کسی نے بھی کرمو کی بات کا یقین نہیں کیا اور صاحب نے ایک لمبا کوڑا منگایا اور وہ کرمو کو مارتے جاتے تھے اور کہتے تھے کمبخت چور، بتا دے میری گھڑی کہاں ہے، اردگرد کھڑے باقی مزدور بھی کرمو پر آوازے کسے جا رہے تھے کہ چوری کا انجام برا ہی ہوتا ہے، اب نکال دے گھڑی، کوئی دسویں بار جب صاحب نے کوڑا مارا تو کوڑا ان کے ہاتھ سے گر گیا جسے اٹھانے کے لیے وہ جھکے تو گھڑی ان کی اپنی جیب سے نکل کر نیچے گر گئی، صاحب کبھی کرمو کو اور کبھی گھڑی کو دیکھتے اور کرمو نے صاحب کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ایک غریب کو ایک امیر کو دیکھنا چاہیے لیکن یکدم اُسے خیال آیا کہ کہیں نوکری ہی نہ چلی جائے وہ اُٹھا اور صاحب سے کہا

"صاب مبارک ہو گھڑی مل گئی۔۔۔ رشید، فقیرو، گورو یہ دیکھو صاب کی گھڑی مل گئی۔۔۔۔"

"اوہ ہو یہ تو بہت دکھی کہانی ہے لیکن وہ شبیر کا کیا ہوا؟"

"جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں اس کہانی کا حصہ ہوں اور سلمٰی کو مجھ سے محبت ہے، سو ایک روز میں گھر کے باہر ہی کھڑا تھا کہ شبیر آ گیا اُس نے کہا۔"

"میں تو تمھیں اپنا جگری دوست سمجھتا تھا مجھے کیا معلوم تھا تم ایسے نکلو گے"

"کیا ہوا دوست مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی" میں نے پوچھا

"اب اتنے بھولے نہ بنو مجھے سلمٰی نے سب کچھ بتا دیا ہے"

اور یہ کہہ کر اُس نے مجھ پر گولی چلا دی جو میری ٹانگ پر لگی، سو تب سے میں تم لوگوں کے ساتھ اس وارڈ میں علاج کی غرض سے داخل ہوں۔۔۔"

"اوہ! اچھا تو یہ ہے تمھارے زخم کی کہانی، لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ یہ گولی تمھیں پستول کی صفائی کے دوران لگی تھی"

"تو کیا پہلی ہی ملاقات میں سب کچھ بتا دیتا"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے"

"لیکن پھر شبیر نے سلمٰی کو آج کیوں طلاق دی؟"

"سنا ہے کل رات وہ سارے زیور لے کر انور کے ساتھ بھاگ رہی تھی، لیکن دونوں پکڑے گئے اور شبیر نے سلمٰی کو طلاق دے دی۔۔۔"

"بھئی یہ انور کون ہے اب"

"انور سلمٰی کا پڑوسی۔۔۔۔۔"

☆☆☆☆

معظّمہ تنویر

کون؟

سرسراہٹ کی آہٹ پا کر میں چونکا تھا۔

کون؟ کون ہے؟ گو میں اسے پہچان چکا تھا پھر بھی انجان بن کر پوچھا۔

میں ہوں۔ میں! مجھے اپنی ہی آواز سے مشابہ آواز سنائی دی۔

یہ پھر آدھمکا۔ جنجالی، بلائے بے درماں۔ چھاتی پر جم کر بیٹھے گا۔ بھیجا کھائے گا۔ بھوت بن کر لپٹے گا۔ میری روح اُس سے بھاگنے لگی۔ وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا۔ اگر وہ اس قدر فرسودہ حال نہ ہوتا اور ہر وقت وہی سرسراتا ہوا، بوسیدہ چوغہ نہ پہنتا ہوتا تو دیکھنے میں ہو بہو میرے جیسا لگتا۔ بلکہ میں ہی لگتا۔ وہ ہمیشہ سے میرے ساتھ تھا، ساتھ رہنے کی کوشش کرتا تھا اور اس معاملے میں ڈھیٹ پنے پر اتر آتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر میں اسے چلتی گاڑی سے بھی دھکا دے کر باہر نکال دیتا تو بھی وہ ہانپتا کانپتا گاڑی کے پیچھے بھاگتا رہتا۔ پھر کسی مصروف چوراہے پر ضرور مجھے دکھائی دے جاتا اور اپنے دکھائی دے جانے کو جتلائے بغیر نہ رہتا۔ اس کی ایسی حرکتوں سے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو جایا کرتی، اعتماد کا ستیاناس ہو جاتا۔ اس سے بھی خطرناک بات یہ تھی کہ اس کے پاس ایک ایسا آئینہ تھا جس میں صرف باطن دکھائی دیتا تھا جسے وہ موقع بہ موقع میرے سامنے کر دیتا تھا۔ مجھے اس آئینے سے انتہا کی چڑ تھی۔ بھلا کسے یہ گوارا ہو سکتا ہے کہ وہ خود کو اندر سے دیکھ سکے۔ مجھے بارہا اپنے آپ سے ہی خوف آیا، اپنی اصلیت سے گھن آئی اور کئی بار تو میں خود کو پہچان ہی نہیں پایا۔ اتنا کٹھور، وحشی، ہوس پرست، خود غرض، خود پسند اور پیٹ پالو میں کیسے ہو سکتا تھا؟ مگر اس نے کہا کہ مانو اور منوا کے ہی چھوڑا۔ کمبخت کے پاس ایسا جاگتا جادو تھا کہ میں اُس کے آگے تنکے چننے لگتا۔ ظالم ٹھنڈی مار دیتا تھا۔ بظاہر مجھ سے میلِ خاطر رکھتا، محبت سے بولتا۔

تم بُرے نہیں یار۔ بس دنیا کے بھپارے میں آ گئے ہو۔ اس فریب کی مثال جانو، طلسمی آئینے کی سی ہے جو چکا چوندھی مارتا ہے۔ آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی دیکھ نہیں سکتا۔ ٹیڑھی چلتا ہے اور کھڈے میں جا گرتا ہے۔

وہ جتنا قریب تھا اتنا رقیب تھا۔ اور سویر بغل میں بیٹھتا۔ کبھی یوں آشنائی نبھاتا۔

کیوں جان بوجھ کر کنوئیں میں گرتے ہو۔ اُریب کی چال چلتے ہو۔ اتنی جلدی میں ہو، ایک ہی بار سب کچھ سمیٹ لینا چاہتے ہو۔ وہ ٹھٹھا لگاتا!

کس کی تلاش میں ٹپے ٹوئیے مارتے ہو؟ تمھیں اور کیا چاہیے؟ کتنا چاہیے؟ تمھارے پاس جتنا ہے وہ تمھاری اندازہ لگائی گئی باقی سانسوں سے کہیں زیادہ ہے ---- بہت زیادہ ہے یار ---- اتنا لے کر کیا کرو گے؟ اتنا تو نہیں جینا ہے یار۔

میں اُس کی حد شکنی سے نالاں تھا۔ وہ دوست نما بدخواہ میرے سر کو آجاتا۔ ہنستا چہل جھگڑا اٹھاتا۔ میرا خون جوش کھانے لگتا۔ ہم دونوں کے بیچ میں ٹھن جاتی۔ جھڑ کا جھڑکی ہونے لگتی۔ میں اُسے کہتا۔ سنو! آگ اور پانی ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ کیوں میرے دم کے ساتھ لگے ہو۔ ہمیشہ جائے اعتراض ڈھونڈتے ہو۔ بے وقت آدھمکتے ہو۔ اور میں جو کچھ بھی کر رہا ہوتا ہوں اس میں سے مین میکھ نکالنے لگ پڑتے ہو۔ تلملانے لگتے ہو۔ تم چاہتے ہو میں تنکوں پر گزارا کروں، چکی پیسوں، گاؤخراس بنا رہوں۔ میرا اتھل پیڑا تباہ ہو۔ تمھاری خواہش ہے کہ جل میں کھڑی پیاسوں مرے۔ یہاں سبھی داؤ دیتے ہیں اور میں چڑیا کے چھنالے میں پکڑا جاتا ہوں۔ حد ہو گئی۔ جاؤ۔ کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈو۔ تم ہوتے کون ہو مجھے روک ٹوک کرنے والے، میری ٹوہ میں رہنے والے۔ آخر کون ہو تم؟ میں اسے کھری سناتا، دھکے دیتا مگر وہ بھی بلا کا ہٹیلا تھا۔ جھڑبیری کا کانٹا ٹالے نہ ٹلتا تھا۔ جی چاہتا تھا اسے مار ہی دوں۔

اُس شام بھی اُسے دیکھتے ہی میرے تیور میلے ہو گئے۔ آ گئے تم پھر منطق چھانٹنے ---- روڑے اٹکانے ---- میں زہر کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

وہ ہونٹوں میں مُسکرایا۔ پھر نرم لہجے میں بولا۔ جب بوئے بیج ببول کے تو پھول کہاں سے ہوں۔ پھر وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ کیوں لیک سے بے لیک ہوتے ہو؟ ہتھل کرتے ہو۔

سب کرتے ہیں۔ میں جھٹ سے بول اُٹھا۔

تم اپنی بات کرو۔ وہ بائیں بائیں کرنے لگا۔

فرض کرو اگر دوسروں کو راج پھوڑا نکل آئے تو کیا تم بھی ایسا چاہو گے؟

میرے تلووں سے لگی سر میں جا بجھی۔

ہمارے درمیان تکرار ہونے لگی۔

اُس نے مجھے بھونکایا۔ میں نے اُس دس طرح کی باتیں سنائیں۔

بُودا اور سدِّ راہ تک کہہ ڈالا۔ وہ بھلک بھلک رونے لگا۔

یہ نئی افتاد آپڑی۔ اس کے رونے سے میری جان پر بن جاتی تھی۔ نحوست کا مارا چپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

ٹھیک ہے جیسا تم کہو گے میں ویسا ہی کروں گا۔ میں ابھی تائب ہوتا ہوں۔ میں نے اُس کے آگے کان پکڑے۔ وہ ٹُسکنے لگا۔

سوچ لو! تم توبہ توڑنے کے عادی ہو۔

تو کیا مچلکہ لکھواؤ گے؟ میں زِچ ہو گیا۔

کہہ جو رہا ہوں اب ایسا نہیں ہوگا۔ اعتبار کیوں نہیں کرتے۔ میں نے اُسے جھانسا دیا۔ وہ ایک بچے کی طرح خوش ہو گیا۔

ایک لمبی مدت گزر جانے کے بعد بھی وہ میرے سامنے نہیں آیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ میں سمجھا کہ اس کا تکلے سا بَل نکل گیا۔ اس کے باوجود مجھے اس کے بوسیدہ چوغے کی سرسراہٹ کی منحوس آہٹ سنائی دیتی رہتی تھی۔ میں اُس کے اچانک پلٹ آنے سے خوفزدہ تھا۔ عجلت میں، جو مجھے کرنا تھا میں کر رہا تھا۔ میں نے تلوے گرم کیے۔ چرخ سے ماہتاب توڑ لایا۔ لہر بہر ہو گئی۔ ٹھاٹ بدل گئے۔ جھڑ جھڑ روپیہ برسنے لگا۔

اُس روز میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے موضوع پر بول رہا تھا۔ غریبوں کے حقوق کی بات کر رہا تھا۔ میں یہ ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا کہ مزدور کا استحصال کیا جاتا ہے۔ حق دار کو حق نہیں ملتا اور عام آدمی کی انصاف تک رسائی نہیں ہوتی۔ میری تقریر کا لچھا بندھ گیا تھا۔ غریب غربا مبہوت تھے۔ غریب غربا تالیاں پیٹ رہے تھے۔ جوش میں آ کر نعرے لگا رہے تھے۔ مجھے کاندھوں پر اٹھا رہے تھے۔ غریب غربا مٹھائیاں کھا رہے تھے۔ جشن منا رہے تھے۔

میں کیمروں کے حصار میں تھا۔ مجھے پوری دنیا میں دیکھا اور سنا جا رہا تھا سراہا جا رہا تھا۔ یکا یک میری نظر اُس پر پڑی۔ وہ سب سے آخری نشست پر بیٹھا تمسخرانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر ایک دم اس نے خاص آئینے کا رخ میرے سامنے کر دیا۔ مجھ جیسے خوش بیان کی زبان لڑکھڑا گئی۔ میں بھول گیا کہ مجھے کیا کہنا تھا۔ میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر وہاں سے نکل آیا۔

کچھ دنوں بعد وہ میرے دولت کدے پر آیا۔ بڑی ٹیپ ٹاپ ہے! لگتا ہے سودائی ہو گئے ہو یار۔

مجھ سے فوراً جواب نہ بن پڑا۔ اگرچہ میرا خون کھول گیا۔

نرا اٹگڑ کھنگڑ جمع کر رکھا ہے۔ کتنے دن رہو گے یہاں؟ وہ بیش قیمت ساز و سامان کو گھورتے ہوئے بولا۔

کیا مطلب؟ یہاں کتنے دن رہوں گا۔ میرا گھر ہے بھئی۔ میں اس میں رہوں گا۔ مجھے شدید

اشتعال آ گیا۔

میں دنیا میں رہنے کی بات کر رہا ہوں یار۔ وہ عجیب انداز میں بولا۔ میں لرز گیا۔

سچ ہے جب باڑھ ہی کھیت کو کھائے تو رکھوالی کون کرے؟ سنو! تمھارے اندر ہوس نے سیندھ لگائی ہے۔ تم لٹ جاؤ گے۔ اپنی فکر کرو یار۔

مجھے اُس کی چبھتی نگاہوں سے وحشت ہونے لگی۔ وہ دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔ تم نے مجھے بسار ہی دیا۔ کب سے میری سُدھ نہیں لی۔ کہاں پڑا ہوں؟ کس حال میں ہوں؟ میں تمھیں اتنا برا کیوں لگتا ہوں کہ میرے سائے سے ہی بھاگتے پھرتے ہو۔ بھلا تم مجھ سے بھاگ سکتے ہو یار۔ میں نے گردن جھکالی۔

میں تمھارے دماغ کے کیڑے جھاڑتے تھک گیا ہوں۔ اور تم بھان متی کے سوانگ میں الجھ گئے ہو۔ سچ ہے جتنی لابھ اُتنا لوبھ۔ وہ بدلحاظی پر اتر آیا۔

آج جال مارتے ہو کل خود جال میں پھنسو گے۔ یہ جو تم جاپ کے بہ تے پاپ کرتے ہو، جانتے ہو انجام کیا ہوگا؟ بدتمیز، بے ہودہ چیچڑی ہو کر مجھ سے چمٹ گیا۔

میں دیر سے نکتہ چیں کو برداشت کر رہا تھا۔ اب میرے سر پر جن چڑھ گیا۔ میں نے چاہا کہ اب تو اسے مار ہی دوں ورنہ یہ مجھے جینے نہیں دے گا۔

تم یوں میرے پیچھے پڑے ہو جیسے فقط میں ہی گنہگار ہوں۔ گویا مولی کے چور کو سولی۔ اور طرف بھی نگاہ کرو۔ باقی سب دودھ کے دھلے ہیں کیا؟

تمھیں کسی سے کیا لینا دینا۔ مجھے بگڑتا دیکھ کر وہ نرم پڑ گیا۔ تمھارے سر پر بوجھ بڑھتا جا رہا ہے یار۔ اتنا بھاری گٹھڑ کیسے اٹھاؤ گے؟

میں تم سے ہمدردی رکھتا ہوں۔ تمھیں بچانا چاہتا ہوں یار۔ جاتی دنیا دیکھو۔ جا کر کھنڈرات دیکھو۔ سوچو کیا تم زندوں میں ہو؟

میں بھڑک اٹھا۔ میں تمھیں زندہ دکھائی نہیں دیتا؟ مر گیا ہوں کیا؟

مرے نہیں ہو مگر جی بھی نہیں رہے ہو۔ البتہ میں تمھیں زندہ رکھنے کی سرتوڑ کوشش میں ہوں۔ وہ اور ڈھیٹھ پن سے بولا۔

ایسی تیسی میں جائے تمھاری سرتوڑ کوشش۔ اور بھاڑ میں جاؤ تم۔ میں اُس کی بھونڈی باتوں سے دِق ہو گیا۔ خواہ مخواہ پنج پھیلا رہا تھا۔ کیوں آ جاتے ہو میرے راستے میں۔۔۔ کیوں رکاوٹیں کھڑے کرتے ہو۔ تمھارا کیا خیال ہے میں تمھارے دام میں آ جاؤں گا۔ تم مجھے راہ پر لے آؤ گے۔

اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے گرج کر اسے خاموش کر دیا۔

چُپ۔۔۔ چُپ۔۔۔ بس چُپ۔۔۔ اس نے واقعی چپ سادھ لی۔ خاموشی سے چلا گیا۔

کچھ عرصے بعد وہ پھر لوٹ آیا۔ میرے سامنے پٹاری کھول کر بیٹھ گیا۔ پند و نصائح کے سانپ مجھے ڈسنے لگے۔ زہر میرے رگ و ریشے میں اتر گیا۔ میری نیندیں حرام ہو گئیں۔ تن پھن جاتی رہی۔ منہ لپیٹ کر پڑا رہتا۔ میرے اندر واقعی ہوس نے سیندھ لگائی تھی میں لٹ گیا تھا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ گرچہ میرے پاس دولت کی فراوانی تھی اور وسائل بے حساب تھے۔ پھر بھی میں تہی دامن تھا۔ میرے ہاتھ خالی تھے اس سے بڑھ کر ایک انسان کی بے بسی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ سو نہ سکے۔ اس نے درست کہا تھا کہ مجھے کسی کی بددعا لگی تھی۔ اب میں سر نہوڑائے اسی کی سنتا رہتا۔ وہ مجھے طعنے دیتا، کچوکے لگاتا یہاں تک کہ مجھ پر چلّانے لگتا اور میں اسے پلٹ کر جواب نہ دیتا۔ کئی بار تو وہ مجھے اتنا برا بھلا کہتا کہ میں سہار ہی نہ پاتا۔ میں اس کے آگے گڑگڑاتا، ہاتھ پاؤں پڑتا، لیکن میری پیش نہ جاتی۔ میری حالت روز بروز بگڑنے لگی۔ گٹھڑ بہت بھاری ہو گیا تھا اور میں بوجھ تلے دب چلا تھا۔ ساری دنیا میں کوئی ایسا گوشہ نہ تھا جہاں میں گھڑی بھر کے لیے سو سکتا۔ میں صرف اتنا چاہتا تھا کوئی مجھ سے سب کچھ لے لے اور بدلے میں مجھے نیند دے دے۔ ایسے میں اس نے مجھے جنگل کی راہ دکھائی۔ وہاں کے پرسکوت ماحول اور پرندوں کی چہچہاہٹ کے بارے میں بتایا۔ اس نے گھاس پھونس سے بنی جھونپڑی کا بھی ذکر کیا جس کے اندر ایک کھری چارپائی رکھی تھی اس پر میں میٹھی نیند سو سکتا تھا۔ جتنی دیر چاہتا، سویا رہ سکتا تھا۔ کوئی مخل ہونے والا نہیں تھا۔ جنگل، جھونپڑی، چارپائی، نیند۔۔۔ میں مچل گیا۔ ایک ننھے بچے کی طرح ضد کرنے لگا۔ میں نے بلا سوچے سمجھے اس کی ساری شرائط مان لیں۔ سکھ بھری نیند کے عوض سب کچھ تیاگ دینے پر تیار ہو گیا۔ میرے خاص احباب کو بھنک پڑی تو خبر گیری کے لیے دوڑے چلے آئے۔ پہلے تو وہ میری باتیں سن کر خوب ہنسے۔ دیر تک مخول کرتے رہے۔ لیکن جب انھیں معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا تو انھوں نے مجھے میرے اندرونی دشمن سے چھٹکارا پانے کا مشورہ دیا۔ میرے ہمدردوں نے مجھے اس بھوت بلا سے نجات دلانے میں ہر طرح کی معاونت کی اور مجھے ان تمام حربوں سے آگاہ کیا جو ان کے آزمودہ تھے۔ اس کی مت سنو۔ انھوں نے کہا۔ ہرگز دھیان نہ دو۔ وار کرو، بار بار وار کرو۔ بھرپور ضرب لگاؤ۔ اسے مارو۔ آخر کار مار دو۔ انھوں نے مجھے بڑھاوا دیا، ہمت بندھائی اور میں نے اُسے پراسرار طریقے سے مار ڈالا۔

وہ مر چکا ہے۔ مگر کبھی کبھار اس کے بوسیدہ چوغے کی سرسراہٹ کی آہٹ مجھے اب بھی سنائی دیتی ہے اور میں بیٹھے بٹھائے چونک پڑتا ہوں۔

کون؟ کون ہے؟

عثمان عالم

علامتی موت

مر چکا تھا پھر بھی زندہ تھا۔

وہ دوست تھا۔ قریبی دوست ۔۔۔ ایسا دوست جو دلوں میں بستا ہو۔

اُس پر سکرات کا عالم طاری تھا سب دوست اُس کے گرد جمع تھے۔ ایک نے یٰسین کھول کر تلاوت شروع کی تا کہ وہ جان کنی کے کرب سے بچ جائے۔ سانس کی ڈوری ٹوٹ جائے۔ آنکھیں پتھرا جائیں تا کہ سب کو سکون آ جائے۔

وہ عجیب بیماری میں مبتلا رہا۔ آخری دنوں بیماری نے اتنی شدت اختیار کی کہ وہ ہر چہرے کو وہ نوچنا شروع ہو گیا۔

جو دماغ اُسے دستیاب ہوتا اُس میں باقی کے سب دوستوں کے لیے نفرت کو انڈیلتا جاتا۔ اُس پر خبط طاری تھا۔ دن کے بیشتر لمحوں میں، وہ اپنی عظمت کے گن لڑکھڑاتی زبان سے گنگناتا رہتا وہ تالاب پر بیٹھے اُس شخص کی طرح تھا جس کو اپنے ہی عکس سے محبت ہو گی تھی۔

ابھی تو اُس نے پہلی سیڑھی پر صحیح سے پاؤں نہیں جمائے تھا اور سورج کو ہتھیلی میں قید کرنے کی بات کرنے لگا۔

پھر!

سب کو سکون آ گیا۔ اُس کی کھلی پھٹی آنکھیں بند کر دی گئیں سر پر ڈھاٹا باندھ دیا گیا۔

ایک کی آواز سنائی دی غسل دیا جائے پانی نیم گرم کیا گیا۔ اُس میں بیری کے پتے ڈالے گئے خشک مٹی سے اُس کا بدن صاف کیا گیا۔ کفن کے تین پارچے ایک طرف رکھے گئے۔

ایک دوست پکارا!

”ٹھہر جاؤ، رک جاؤ۔“

”آخری عمر میں وہ مسلمان نہیں رہا۔“

اوہ۔۔ تو پھر

دوسرا دوست رندھی آواز میں بولا۔

آخری دنوں وہ ہندو دھرم کا مطالعہ کر رہا تھا۔

تو ٹھیک ہے!

اُس کا ہندوؤں کے طریقے سے کریا کرم کرتے ہیں۔

زمین پر چت لٹا کر اُس کا سر مونڈنے لگیں۔ ایک دوست بھاگ کر گائے کا گوبر لے آیا جو اُس کے چاروں اطراف حصار کی مانند کھینچ دیا گیا۔ سر شمال کی طرف اور پاؤں جنوب کی طرف کر دیے گئے برہمن اونچی آواز میں منتر جاپنے لگا۔ گنگا جل کا بندوبست کیا جانے لگا سینے پر تلسی کے پتے سجائے گئے۔ پلاس کی لکڑی کی چتا تیار ہونے لگی۔ نعش کو ارتھی پر لیٹا دیا گیا رام رام ست ہیں کے نعرے فضا میں بلند ہونے لگے۔

ایک دوست جواب تک غائب تھا بھاگتا ہوا آیا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آخری دنوں یہ مذہب سے بے گانہ ہو گیا تھا۔ ہندو رہا نہ عیسائی اور نہ مسلمان۔

پھر!

اب کیا کیا جائے؟

کوئی وصیت؟

کچھ بھی تو نہیں

پھر آخری رسومات کیسے ادا کی جائیں

ابھی انھی سوچوں میں تھے کہ ایک شخص آیا اور سب کے گلے لگ کر بین کرنے لگا۔ اُس شخص کی نظر جب سب دوستوں کی کٹی انگلیوں پر پڑی تو وہ بین کرنا بھول گیا اور تفتیش میں پڑ گیا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ ایک دوست اُٹھا اور میت کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ ہم نے اسے اپنی انگلی تھامنے کے لیے دی تا کہ یہ ہمارے ساتھ آسانی سے سفر طے کر سکے مگر اس نے ہماری ہی انگلیاں کاٹ ڈالیں۔

پھر سب نے اس پر اتفاق کیا کہ قدیمی شہر کے مرکز میں پارسیوں کا مردہ گھر ہے وہاں اس نعش کو رکھ چھوڑا جائے۔ وہ میت اُٹھا کر مردہ گھر کی جانب چل پڑے۔ مردہ گھر کی چھت پر نعش رکھ کر واپس پلٹے تو ہوا میں گدھیں اور چیلیں پر پھڑ پھڑانے لگیں۔

☆☆☆☆

سیمیں کرن

پچیس کلو کے اڑھائی سو

وہ جب سے یہاں آئی تھی مسلسل سرمنہ پر کپڑا باندھے صفائی اور بکھراؤں کو سمیٹنے میں مصروف تھی! بکھراوے بھی کیا تھے، ہر طرف کاغذوں کے پلندے بکھرے ہوئے تھے۔

کاغذوں کے اس انبار نے پہلے اس حیران و پریشان کیا اور اب اسے زچ کر دیا تھا!

اس نے اپنے میاں کو بھی بے نقط سنائیں اور غصے سے با آواز بلند کہا: ''یہ کس کاغذی محل میں پھنسا دیا ہے تم نے مجھے، ہر طرف کاغذ، صفحات، مختلف اوراق، کٹی پھٹی کتابیں بکھری ہوئی ہیں...... سمیٹ سمیٹ کر تنگ آ گئی ہوں۔'' اور اب اس کا چڑچڑا پن اور غصہ عروج کو چھو رہا تھا......

وہ صفائی کرتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہی تھی!

''جانے کون خبطی اور پاگل لوگ تھے، کیا بس کاغذوں پر ہی زندہ تھے......اور گر کاغذوں پر زندہ تھے تو صرف ان کو کچرا سمجھ کر کیوں چھوڑ گئے...... سچ میں یہ تو کسی پاگل، دیوانے کا گھر لگتا ہے۔''

اپنے بیان میں گر اس کے غصے کو نظر انداز کر کے پرکھا جاتا تو وہ کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی! بلکہ کافی حد تک اپنے غصے بھری ان بڑبڑاہٹوں میں وہ سچائی ہی بیان کر رہی تھی، اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس صورت حال پر پریشان اور حیران ضرور ہوتا......اور یہی پریشانی غصے میں بدل جاتی!

یہ کیسے لوگ تھے...... کتنے عجیب!

جو ایک زمانہ ان کاغذوں کو......اس ڈھیر ردی کو سینے سے لگائے بیٹھے رہے...... پیار سے سنبھالے رکھا! اور جب مکان چھوڑ کر جانے لگے تو انھیں بے کار ردی سمجھ کر آنے والے مکینوں کو سونپ کر رخصت ہوئے!

وہ جس کمرے میں جاتی! ردی، کاغذوں، نوٹس، کتابوں، ڈائریز، نئے بوسیدہ کاغذ، ایک نئی کہانی اونچی اور بلند آواز میں سنانا شروع کر دیتے!

پہلے پہل تو اس نے کچھ چیزوں کو پُرشوق اور تجسس سے دیکھا!

کتابوں پر نوٹس پر جگہ جگہ جیسے کوئی رک رک کر ٹھٹھک کر......جب دوڑتے دوڑتے وہ تھک جائے، بے حال ہو جائے تو خود ہی خود کو تسلی دینے لگے، مرہم رکھنے لگے، اپنے زخموں پر، خود کو حوصلہ و تسلی دیتے لفظ تھے......

جو آدھی ادھوری کہانی کہتے تھے…… جو ماضی کی کچھ خبر دیتے تھے……

مگر پھر بعد میں کیا ہوا……سوال چھوڑ کر خلفشار میں مبتلا کر دیتے تھے۔

کمرہ نمبر ایک میں ملنے والی ردی میں جو ڈائریز اور نوٹس تھے وہ کسی میڈیکل کی طالبہ کے تھے، جس کے لیے ڈاکٹر بننا اس کا جنون تھا……وہ جنون جو عشق میں ڈھلتا تھا……دن رات کی محنت، تھکا دینے والی لگن کے باوجود وہ اپنی کوششوں میں دو بار ناکام ہو چکی تھی……

یہ ناکامی کی خبر ایک اندوہناک حادثے کی صورت اس کی ڈائریوں میں مٹے مٹے حروف میں جو شاید آنسوؤں سے پھیل گئے تھے، مرقوم تھے……

وہ اپنے بوسیدہ نوٹس میں جہاں اذیت کے بوجھ سے دب کر خود کو ہمت دیتی، حوصلہ بڑھاتی، پڑھنے پر مائل کرتی تھی وہیں اپنی ڈائریوں میں پھر بکھر جاتی۔ یہ جل کر خاک ہونے، خاک سے پھر جنم لینے والا عمل تھا جیسے، اور پھر اپنے ہاتھوں خود ہی اپنی خاک اڑانا!

بہت حیرت سے ثمینہ نے ڈائری پڑھتے ہوئے سوچا، یہ اتنی کمسن سی لڑکی احساس کی کس آنچ پر پک رہی تھی، یوں جیسے ہنڈیا چولہے پہ دھری ہو…… پک پک کر سوختہ ہو گئی ہو……ٹوٹ کر بکھرنے کو تیار ہو جیسے! وہ لکھتی تھی۔

”میں کیا fantacies میں رہنے کی عادی ہو چکی ہوں، یہ آنکھیں اتنی پاگل کیوں ہیں، بس خواہ مخواہ خواب دیکھے چلی جاتی ہیں اور میری تو جاگتی آنکھیں خواب دیکھتی ہیں…… مجھے تو مسیحا ہونا تھا…… یہ خواب دیکھتے چلی جاتی ہوں، تلخ حقیقت ہی سہی مگر خواب وقتی راحت تو دیتے ہیں……مگر کیا خواب صرف دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔“

اور پھر اگلے صفحوں میں…… بہت سارے اگلے صفحوں میں درج تھا……

”میرے خواب میرے احساس اس خواہش کی جڑیں میرے وجود میں اتنی گہری ہیں کہ اگر کوئی نکال کر پھینکنا چاہے تو میری ہستی مٹ جائے۔“

پھر کچھ دنوں کے بعد درج تھا……

”آج کل ردی اکٹھی کرتی ہوں، پرانے نوٹس نکالے، دل پر جو بیتی وہ الگ داستان ہے، اسی ردی میں کچھ افسانے بھی سنبھال کر رکھے ملے، یوں لگا کہ ان مصنفین نے مجھے دیکھا ہے، مجھے مل کر میرے پاگل پن کو اپنی ہیروئنز میں اکٹھا کر دیا ہے، وہی جنوں خیزیاں …… میں نے صرف نارسائیاں ہی یکجا کر رکھی ہیں۔“

پھر چند صفحوں کے بعد جملہ درج تھا:

”میرے حوصلے پست ہو چکے، شکست کا زہر پور پور میں رچ بس گیا ہے...... مجھے زندہ رہنے کے لیے کسی کامیابی کی اشد ضرورت ہے، کیا مجھے سمجھوتے کی زندگی گزارنی ہوگی، یہ سوچ مجھے خوف سے نیلا کر دیتی ہے۔“

اور پھر بہت سے دن خالی صفحے تھے، اس کے بعد اگلی ڈائری میں صرف ایک صفحہ تھا جو لکھا تھا۔

”کل ہمارے کالج میں فاطمیہ ٹرسٹ والے آئے تھے، میں نے دو بوتل خون ڈونیٹ کر دیا...... میرا گروپ یونیورسل ڈونر ہے، خوشی سے لے لیا گیا، میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ تھا کہ میرے خون سے کسی کی زندگی بچ سکے گی......

میری بے کاری زندگی اگر کسی کے کام آجائے تو اس سے بہتر بات اور کیا ہوگی...... اور پھر اب اپنی توانائیوں کو بچا کر بھی کس لیے رکھا جائے...... میں نے سوچ لیا ہے، فیصلہ کر لیا ہے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔“

اس کے بعد اس لڑکی کی کوئی تحریر نظر نہیں آئی تھی، اگلے سالوں کی ڈائریز پڑی تھیں مگر خالی تھیں......

ایک ڈائری میں ایک تصویر بھی ملی تھی جو غالباً اسی ڈائری والی لڑکی کی تھی۔ وہ سیاہ سوٹ میں کسی ویران سی جگہ پر بیٹھی تھی...... جیسے کوئی قبرستان ہو...... کامنی، دلکش صورت، چہرے پر گہری اداسی اور یہی اداسی اور یہی اداسی اس کی آنکھوں میں تھی۔

اُس کے بعد کیا ہوا، وہ لڑکی کہاں گئی...... زندگی نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ وہ زندگی سے سمجھوتا کر پائی یا زندگی کا عفریت اسے نگل گیا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا...... اور یہی وہ موڑ تھا جس نے ثمینہ کو اس ”ردی گھر“ سے وحشت زدہ کر دیا......

یہاں آدھی ادھوری قبروں جیسی کہانیاں ادھ موئی پڑی تھیں۔ جو اس خلفشار میں مبتلا کرتی تھیں کہ کیا زندگی باقی رہ گئی تھی، یا پھر کوئی چنگاری باقی تھی! آگے کیا ہوا...... مگر اس سے آگے کوئی علامت بھی نہ ملتی تھی جو بتاتی کہ اس آدھی ادھوری کہانی نے نیا موڑ لیا تھا......

کمرہ نمبر دو سے جو نوٹس اور ڈائریز ملیں وہ ایک ایسے بچے کی تھیں جو اے لیول کے بعد والدین کی آرزو پر بار ایٹ لا کرنے انگلینڈ روانہ کر دیا گیا تھا......

اس کی ڈائریز میں جہاں ایک ان دیکھے ملک...... جہاں کو چھونے کی خواہش اور آرزو تھی وہیں بچھڑنے کے خوف اور غم بھی لاحق تھے......

اس بچے کی کتابوں، ڈائریز، نوٹس پر آنسو پھیلے ہوئے تھے۔ چومنے کے بے شمار نشان تھے اور آگے وارفتگی سے لکھا ہوا تھا...... ”میرا بیٹا...... میرا بیٹا...... میرا بیٹا۔“

یہاں بھی تجسس آ کر پاگل کرتا کہ کون سے آنسو اس لڑکے کے تھے اور کون سے اس کی ماں کے......

یا پھر باپ کے جانے، وہ لڑکا اب کہاں تھا! واپس آیا یا بدیس ہی رہ گیا ......ایک اور ادھوری کہانی!

ثمینہ جھنجھلاہٹ سے بُڑبڑائی ”پاگل خاندان ......سب ڈائریز لکھنے کے خبط میں مبتلا تھے......“

کمرہ نمبر تین جو کہ ماسٹر بیڈ روم تھا......کوئی مشترکہ کمرا لگتا تھا کیوں کہ وہاں سے دو طرح کی ردی برآمد ہوئی تھی! حساب کتاب کے کھاتے، بینکوں کی رسیدیں، کاروباری لیٹر پیڈز، مختلف انواع و اقوام کی فائلیں......

ثمینہ کو حیرت ہوئی کہ آخر کس قسم کے احمق لوگ تھے جو اس طرح کی دستاویز بھی ردی سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ ڈائریز، پرانے نوٹس، بوسیدہ کتابوں کو چھوڑنا......تلف کیے بغیر اک خالی مکان کے حوالے کر جانا بھی بد احتیاطی کے زمرے میں آتا تھا......ان ڈائریوں میں بڑی ذاتی قسم کی معلومات درج تھیں۔

وہ بڑبڑا رہی تھی ’لو بھلا اگر کوئی مجھ سا بھلا اور شریف النفس نہ ہوتا ......کسی غلط آدمی کے ہتھے یہ سب چڑھ جاتا تو ......یہ لوگ تو ردی سمجھ کر یہ سب چھوڑ کر چلتے بنے، اب یہ کاروباری فائلیں اور کھاتے بھی بے کار سمجھ کر کوئی چھوڑتا ہے بھلا......“

اسی کمرہ نمبر تین ......آخری کمرے میں جہاں کاروباری فائلیں، کھاتے، رسیدیں ملی تھیں ......اسی کمرے سے دو تین ادھورے مُسودے بھی ملے......ثمینہ نے الٹ پلٹ کر دیکھا......یہ ادھورے ناولز تھے......

ایک بار پھر ادھوری کہانیاں......

ثمینہ کا غصہ اپنی انتہا کو چھو کر پھر بے بسی میں ڈھل گیا......اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ ان اتنی ساری ادھوری کہانیوں کا کیا کرے، جنھوں نے اس سے وقتی طور پر سکون چھین لیا تھا! اور اب اس پر مستزاد یہ ادھورے ناولوں کے مسودے بھی نکل آئے تھے!

اسی کمرے میں سے کئی بوسیدہ کتابیں بھی نکلی تھیں، بطور ردی کاغذ جو کافی قدیم و نایاب مسودے تھے!

اسے یاد آیا کہ اس کو اس کے شوہر نے بتایا تھا کہ ایک پک اپ میں گھر کے سابقہ مکینوں نے صرف کتابیں ہی لدوائی تھیں!

اس وقت بھی اس کے شوہر نے کہا تھا کہ لوگ بڑے پڑھے لکھے لگتے تھے، جانے کیا مجبوری آن پڑی جو اتنی عجلت میں گھر بیچ، سودا مکمل کر، گھر کی چابیاں پکڑا گئے تھے! شاید کوئی آفت آ پڑی تھی ......شاید پیسوں کی اشد ضرورت تھی!

اور اب ان کمروں میں ان آدھی، ادھوری ٹوٹی پھوٹی، بکھری کہانیوں سے مل کر اسے پتہ چلا تھا کہ

یہ کسی مصنفہ کا گھر تھا......لکھاری کا مکاں تھا......اسی لیے کہانی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی!

مگر آخر ہوا کیا تھا......ایک بار پھر ثمینہ کے اندر غصے کے ساتھ تجسس عود کر آیا!

مگر کام اتنا تھا کہ اسے اس تجسس کو پس پشت ڈالنا پڑا۔

یہ گھر جو کہ ایک بہت اچھی لوکیشن پر تھا، انھیں بڑی عجلت میں اچھا خاصا سستا مل گیا تھا کیوں کہ وہ مالک مکان کی اس شرط کو ماننے کو تیار ہو گئے تھے کہ وہ ساری رقم یک مشت ادا کر دیں گے۔

ثمینہ کے میاں راحیل نے اپنے مکان کو بیچا، کچھ سیونگ بینک سے نکالی اور گھر خرید لیا۔ اور اب وہ اس گھر میں نئے مکین بن کر داخل ہو رہے تھے۔

اسی سلسلے کی وجہ سے وہ تین دن سے گھر کی صفائی میں مصروف تھی! اور ہاتھ کیا آیا۔ صرف ردی کا ایک ڈھیر......اُس نے کاغذوں کے ایک ڈھیر کو آگ دکھائی تا کہ کوئی معلومات کسی کے ہتھے نہ چڑھ جائیں اور خواہ مخواہ کی کوئی مصیبت گلے نہ پڑ جائے! اس کے باوجود ایک ڈھیر جمع ہو گیا جس کو اس نے ردی والے کے ہاتھ بیچ دیا۔ پچیس کلو ردی کے ڈھائی سو روپے بنے جو اس نے اسی وقت ساتھ کھڑی صفائی والی کو پکڑا دیے!

آنے والے دنوں میں کون جانے ثمینہ ان ادھوری کہانیوں کو ان کمروں کے حوالے سے یاد کرے یا پھر بھول جائے! ان کمروں میں نئی کہانیاں شروع ہو جائیں!

مگر کیا اس کو کبھی خبر ہو گی کہ ان آدھی ادھوری کہانیوں کی مصنفہ کی اچانک موت نے بہت سی کہانیوں کو بھی موت دے دی تھی......! اس کو کون بتائے گا کہ وہ دیوانی لڑکی کیا ہوئی اور ان جانے دیسوں کو جانے والا لڑکا کتنا اکیلا، تنہا اور خوفزدہ تھا جب ماں کی موت کے بعد اچانک باپ بھی برین ہیمبرج کی وجہ سے ہسپتال میں پڑا تھا اور اسے پیسوں کی اشد ضرورت تھی اور اس نے عجلت میں بد دلی کی انتہا پر اس وحشت زدہ گھر کو بیچ دیا جس کے کمروں میں آدھی ادھوری کہانیاں بین ڈالتی پھرتی تھیں!

ہو سکتا ہے کہ ثمینہ کو کبھی وہ آدھی ادھوری کہانیاں اور وہ پچیس کلو ردی کاغذ کی خوشہ چینی کبھی لاؤنج میں یا کسی کمرے میں بیٹھ کر یاد آئے۔

مگر وہ ردی والا جو کل اپنی بیوی کے پکوڑوں کے ٹھیلے کے لیے کاغذ سیدھے کر رہا تھا اور دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اس نے اڑھائی سو میں کافی اچھا اور سستا سودا کر لیا تھا، کبھی نہیں جان سکتا تھا کہ ان اڑھائی سو روپے میں وہ کتنی کہانیاں، حسرتیں اور خواب خرید لایا تھا!۔

☆☆☆☆

عطاءالرحمٰن خاکی

منش، دھرم اور یدھ

گوتم بدھ کہتا ہے ”میں سچ کو ڈھونڈتا تھا حیران ہوتا تھا، جب متلاشی تھا سچ نہ ملا اور جب سچ ملا اور میں نے ادھر اُدھر دیکھا میں نہیں تھا۔“

گوتم بدھ اور وہ بھی شاید ایک ہی ناؤ کے سوار تھے، نہ معلوم منزلوں کے مسافر تو وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کون ہے اور کیوں ہے، اگر وہ آسن جما کر دم سادھ کر بیٹھ جائے تو ممکن ہے پشت سے شگوفہ پھوٹے اور انجیر کا تناور پیڑ بن جائے اور وہ اس زمانے میں جا پہنچے جب منش کو تلاش نہیں ہوتی تھی اور اگر ہوتی بھی تھی تو وہ ”سدارتھ“ کی مانند راج پاٹ چھوڑ سنسار نہیں تیاگ دیتا تھا اور ممکن ہے کہیں کسی پتھر کی آڑ سے بدھ کا چہیتا گھوڑا ”کنتھکا“ ہنہناتا ہوا آ جائے اور اس کے تلوے چاٹ کر اپنی موجودگی کا یقین دلائے اور اسے کہے” تیری تلاش مکمل ہو جائے گی میں اگرچہ ایک معمولی گھوڑا ہوں لیکن تیری سنگت مجھے عزیز ہے اور کبھی جو تیری سوچیں مکڑی کے جال سمان الجھنے لگیں تو پریشان مت ہونا، تجھے نروان کی تلاش ہے اور وہ تجھے مل جائے گا اور وہ واپس آنکھیں بند کر دھیان میں گم ہوا تو اسے لگا کوئی اسے پکارتا ہے...اس نے آنکھیں کھولیں...کوئی کہہ رہا تھا ”ہے بدری ناتھ! بستی میں عجیب گھٹنا ہوئی ہے، منش دھرم کے نام پر یدھ کر رہا ہے، ہری کے سیوک دھن کے غلام ہوئے ہیں، گونگے بولتے ہیں اور زبان والے ان کی شکلیں دیکھتے ہیں، اندھے بہتر دیکھنے کا دعویٰ کرتے اور آنکھ والے ٹٹول کر ٹھوکریں کھاتے چلتے ہیں، گیانی اپنے نرم بستروں کو نہیں چھوڑتے اور کم عقل لوگ علم کی شکشا دیتے ہیں، ناری بازاری عورت کا سروپ بھرکو۔لہے مٹکا کر چلتی ہے آنکھیں مسکاتی ہے اور بازاری عورت پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتی ہے۔ کیسا کل یوگ ہے۔ تب بدری ناتھ نے غور سے اس منش کو دیکھا وہ کمزور کاٹھی کا ایک بھکشو تھا جس کے جسم پر جا بجا زخموں کے نشان تھے۔

بدری ناتھ کا قہقہہ جنگل کے اندھیروں میں گونج اٹھا۔

بندھو، ادھر آ میرے پاس بیٹھ، تو نے بندروں کے راجہ کی جاتک سنی ہے؟

”نہیں“

”تو پھر سن“ بدری ناتھ سنانے لگا۔ ”بیتے سمے کی بات ہے ہمارے گوتم بدھ مہاراج نے گھنے جنگل

میں بندروں کے راجہ ہنومان جی کے روپ میں جنم لیا تھا، اسی ہزار بندروں کے جھنڈ کے راجہ تھے۔ ایک دن انھوں نے سب بندروں کو جمع کیا اور آدیش دیا ''میرے مترو! اس جنگل میں بہت سارے پھل ہیں جو زہریلے ہیں اور ندیاں ہیں جو مگرمچھوں سے اٹی پڑی ہیں اور اگر تم کوئی نیا پھل یا کوئی نئی ندی پاؤ تو پھل کھانے اور جل پینے سے پہلے مجھ سے پوچھ لینا۔'' سب بندروں نے ایک زبان ہو کر ''آگیا کا پالن ہوگا'' کا نعرہ لگایا اور اپنے کاموں میں جت گئے پھر وہ ایک دن ایک گہری اور پراسرار ندی کے کنارے پہنچے، ان کے لیے وہ ندی نئی تھی، حالانکہ وہ تھکے ہوئے اور پیاسے تھے اور پیاس سے ان کے تالوان کے حلقوں سے جا چپکے تھے تب بھی انھوں نے آگیا کا پالن کیا اور اونچے درختوں پر چڑھ راجہ کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔

جب راجہ ان کے پاس پہنچا تو پوچھنے لگا ''کوئی ندی میں تو نہیں اترا'' تب سب نے گردن نفی میں ہلائی، راجہ نے ندی کنارے جانوروں کے قدموں کے نشانات دیکھے اور اس کو یقین ہو گیا کہ یہ ندی مگرمچھوں سے بھری پڑی ہے پھر یوں گویا ہوا ''یہ ندی ہری کائی جیسے وشال مگرمچھوں سے بھری پڑی ہے جو کہ ہماری پرجاتی کے سمے سے جان کا بیری ہے چناں چہ کوئی بھی جل نہیں پیے گا''۔

تب اس ندیا کا سب سے وشال مگرمچھ جو دیودت تھا، جس نے اس سمے مگرمچھ کا جنم لیا تھا سوچا کیوں نہ اس جنم میں گوتم بدھ کا وناش کر دے، تب وہ کنارے آیا اور راجہ کو بولا ''مہاراج جل سے پیاس کیوں نہیں بجھاتے''، تب راجہ بولا ''تم اس ندی کے مالک ہو'' مگرمچھ بولا ''ہاں، میں ہی اس ندی کا مالک ہوں'' راجہ نے سوچتے ہوئے پھر پوچھا ''اور جو بھی اس ندی پر اپنی پیاس بجھانے آتا ہے تم اس کو کھا جاتے ہو'' دیودت نے جواب دیا ''ہاں میں تو یہاں تک کہ معصوم پرندوں تک کو بھی نہیں بخشتا اور جب تم اپنی پیاس سے مجبور ہو کر ندی کنارے آؤ گے میں تمھیں بھی نگل جاؤں گا'' یہ کہہ کر دیودت نے پہلے اپنا سر پانی کے نیچے کیا پھر اس کی آنکھیں ندی کے اندر کھو گئیں اور وہ انتظار کرنے لگا تب راجہ نے جل کی جانب دیکھ شانتی سے بولا ''اے بیوقوف مگرمچھ میں تجھے اپنی پرجا میں سے کسی کو بھی نقصان پہچانے نہ دوں گا'' مگرمچھ پانی سے باہر آیا اور نوکیلے دانتوں والا بڑا سا منہ کھول کر بولا ''یہ ناممکن ہے'' راجہ بولا ''سن مورکھ، کچھ دوری پر بانس کے کھیت ہیں اور ہم بانس کے سرے کو جل کے سروت میں داخل کر دوسری طرف سے کھینچ کر اپنی پیاس بجھا لیں گے'' تب مگرمچھ بہت سٹپٹایا اور اسی ہزار بندروں نے راجہ کے حکم مطابق بانس کی نلکیوں سے باری باری کر خوب سیر ہو کے جل پیا اور اوپر والے کو دھنیے واد کیا اور گھنے جنگلوں میں آگے بڑھ گئے اور پیچھے کچھ رہ گیا تو ندیا کی سطح پر بنتے پھوٹتے بلبلے اور مگرمچھ کا کرودھ۔

جاتک سنا کر بدری ناتھ بولا ''جا بندھو واپس جا میں کچھ نہیں کر سکتا'' پھر وہ اٹھا اور چلتا رہا اور چار

کوس دور ایک برگد کے پیڑ کے نیچے آسن جمایا، وہ تین دن اور تین راتیں وہاں آسن جمائے بیٹھا رہا پر وہ منش دوبارہ اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے آ پہنچا اور اس کے ساتھ اب کی بار ایک اور منش بھی تھا ٹھیک اس جیسا کالا اور سوکھا پر اس کے جسم پر دھوتی اور جسم پر برہمنوں کی طرح ایک دھاگا پڑا ہوا تھا پھر وہ دونوں اس کے سامنے بیٹھ گئے تو بعد میں آنے والا دکھ بھرے لہجے میں بولا ''اے گیانی، کیا رام جی نے کرشن مہاراج کو یہ نہیں کہا تھا کہ ایک سمے آئے گا جب یہ دھرتی ایک اجاڑ اور بے آباد بستیوں کا ویرانہ ہوگی اور کوئی زرخیز اور تناور درخت اس میں نہ اگ سکے گا اور اس وقت منش جاتی کا حال بھی اس اجڑے درخت جیسا ہوگا جتنا وہ سوریا کی روشنی اور آکاش کی بلندی کی طرف بڑھتا ہے اتنی ہی زور سے اس کی جڑیں دھرتی کے اندر دھنستی ہیں نیچے کی طرف تاریکی میں یعنی برائی کی طرف''. یہ کہہ کر وہ خاموش گیا۔

تب بدری ناتھ نے آنکھیں کھولیں اور کہا ''بے شک یہی کہا تھا'' پھر اپنی آنکھوں اور من کی شکتی سے بہار کی کونپلوں اور ہرے بھرے پتوں کی جگہ خزاں کی زردی کو پہن چکے جنگل کے ایک سوکھے درخت پر توجہ دی تو وہ لہلہا اٹھا اور پھل سے ایسے بھر گیا جیسے کسی **بھاگن** عورت کا پیٹ تب وہ دونوں منش اس درخت پر جانوروں کی طرح ٹوٹ پڑے اور پھل توڑ توڑ کر کھانے لگے اور جب سیر ہو کر بھوجن کیا تو واپس اس کے سامنے ادب سے بیٹھ گئے اور وہ درخت خزاں کو اوڑھ کر مرجھا گیا اور اس کی ننگی شاخوں سے وایو شائیں شائیں کر کے گزرنے لگی۔

تب دوجا بولا ''گیانی بدری ناتھ، ہمارے ساتھ چل اور انھیں شکشا دے کہ تو ہی کیول ایسی ہستی ہے جو ہمیں اس دوویدھا سے نکال سکتا ہے''

بدری ناتھ بولا کہ ''بندھووں تم نے شاہی گھوڑے کی جاتک سنی ہے''

''نہیں''

''تو سنو۔ اگلے جنم کی بات ہے بنارس میں راجہ برہمادت براجتا تھا اور ہمارے گوتم بدھ سفید رنگ کے شاہی گھوڑے کے روپ میں جنم گزارتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ راجہ کے نوکر چاکر شاہی گھوڑے کو نہانے لے جا رہے تھے، جب تالاب پر پہنچے تو گھوڑے نے دیکھا کہ ایک جنگلی گھوڑا پہلے ہی تالاب میں نہا رہا تھا جس نے شاید اپنے جیون میں پہلی بار نہانے کی غلطی کی تھی اور اس کی جسم کی غلاظت سے تالاب کا پانی کیچڑ میں تبدیل ہو گیا تھا اور فضا میں عجیب سی باس گھومتی تھی تب نوکروں نے اس جنگلی گھوڑے کو بھگایا اور شاہی گھوڑے کو تالاب کے قریب لے کر چلے تو اسے کراہت ہوئی اور اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا، انھوں نے بڑے جتن کیے پر وہ نہ مانا، نوکر اس کی رسی تھام کر محل کی جانب لے کر چلتے تو چلنے لگتا، تالاب کی جانب رخ

کرتے تو زمین میں گڑ جاتا تب وہ نوکر اسے لے کر واپس ہوئے اور راجہ کے سامنے پہنچ بولے ’’مہاراج یہ گھوڑا بگلا گیا ہے، جنگلی ہو گیا ہے بات نہیں مانتا، تب راجہ کو بہت سندھے ہوا کیوں کہ وہ اس کا سب سے پسندیدہ گھوڑا تھا اور وہ اسے اپنے بچوں کی طرح چاہتا تھا، راجہ کا تھا ایک وزیر با تدبیر وہ جان گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے اور راجہ کو بولا ’’مہاراج اگر آ گیا ہو تو میں معلوم کرتا ہوں کیا معاملہ ہے‘‘ راجہ نے اجازت دی تو گھوڑے کی لگام تھام نوکروں کو ساتھ لیے تالاب کی جانب ہو رہا، وہاں پہنچا تو کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا کیوں کہ وایو میں ہلکی سی گندگی تھی جو بہت بری معلوم ہوتی تھی ، ایک نوکر سے پوچھا ’’جب شاہی گھوڑے کو یہاں لائے تو پہلے سے یہاں کوئی گھوڑا نہا رہا تھا‘‘ تب سارے نوکروں نے گردن زور زور سے آگے پیچھے کر ہاں کر دی، کہنے لگا ’’معاملہ میری سمجھ میں آ گیا ہے واپس چلو‘‘ واپس پہنچ راجہ کے دربار میں پہنچا اور سارا ماجرا راجہ کو سنایا جسے سن کر راجہ بہت خوش ہوا اور وزیر کی عقل مندی سے خوش ہو کر انعام و اکرام سے نوازا اور اس گھوڑے کو مرتے دم تک اپنے ساتھ رکھا۔ اس جاتک کا تت یہ ہے کہ سنسار کی گندگی اور کیچڑ میں نہ لپٹو..... یہ سنسار سپنے کی مانند ہے اور جب ہمارا سمے آ جاتا ہے تو ہنستے ہوئے جیون تیاگ کر اس یوگ سے دوسرے یوگ میں چلے جاتے ہیں... جہاں کبھی کوئی غم نہیں آئے گا. اور بے شک وہی اصل جیون ہے اور میں اپنے آپ میں مگن اور خوش ہوں تمھاری بستی اب ایک کیچڑ بھرے تالاب کی مانند ہے، اگر میں وہاں گیا تو اس کیچڑ میں لت پت ہو جاؤں گا۔

تب پہلا بولا ’’ہے گیانی ، انسان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہو گئے ہیں۔‘‘

بدری ناتھ نے کہا ’’پتا ہے ارجن نے شری کرشن سے کیا کہا تھا۔‘‘

’’نہیں‘‘

بدری ناتھ نے آنسوؤں پونچھتے ہوئے کہا تو سنو ’’دھرت راشٹر نے کہا: ہے سنجے! کروکشیتر کی پاک دھرتی میں یدھ کی خواہش سے جمع ہو کر میرے اور پانڈو کے بیٹوں نے کیا کیا؟ ارجن نے شری کرشن سے یہ کہا: اے اچیت! میرے رتھ کو دونوں فوجوں کے درمیان کھڑا کیجیے تا کہ میں دیکھ سکوں کہ یدھ کے لیے کون کون آئے ہیں اور جب جنگ شروع ہو گی کون کون مجھ سے یدھ کرے گا۔ سنجے نے کہا: ہے دھرت راشٹر! جب ہری کرشن نے ارجن سے یہ کہا تو انھوں نے دونوں فوجوں کے درمیان کھڑا کر دیا۔ بھیشم اور درونا چاریہ کے سامنے رتھ کو کھڑا کر کے کہا۔ اے ارجن! جنگ کے لیے جمع ہوئے ان کوروں کو دیکھ۔ اس کے بعد ارجن نے دونوں فوجوں میں موجود چاچا، دادا، استاد، ماموں، بھائیوں، بیٹوں، پوتوں، دوستوں اور رشتہ داروں کو دیکھا۔ اس طرح دونوں فوجوں میں شریک عزیزوں کو دیکھ کنتی کے بیٹے ارجن کا دل رحم سے بھر آیا اور غمگین ہو کر بولا ’’اے کرشن! یدھ کرنے کی خواہش سے یہاں جمع ہوئے ان رشتہ داروں کو دیکھ کر میرا شریر لرز رہا ہے، منہ سوکھ رہا

ہے اور رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں، غیروں کے مارنے سے بھی پاپ لگتا ہے تب اپنے ہی آدمیوں کے مارنے سے سوائے پاپ کے کیا بھلائی ہوگی اور اپنے ہی بھائی بندوں کے مارنے سے مجھے اسلوک اور پرلوک دونوں میں کچھ لابھ نظر نہیں آتا اگر مان لیا جائے کہ پرلوک کی بات تو کون جانتا ہے اس سنسار میں تو ان کے مارنے سے راج ملے، سکھ بھوگ پراپت ہوں گے اور فتح ہوگی لیکن ہے کرشن نہ مجھے فتح کی خواہش ہے نہ سکھ بھوگ اور راج کی جب مجھے کسی چیز کی اِچھا ہی نہیں ہے تب کیوں لڑکر اپنے ہی آدمیوں کو ماروں اور پاپ کی گٹھری اپنے سر پہ دھروں اور ہے کرشن! میں شوک اور موہ کے کارن یدھ سے منہ نہیں موڑتا میرا اس یدھ سے کنارا کرنا اس غرض سے ہے کہ اس یدھ میں سوائے ادھرم کے دھرم نہیں دیکھتا اور اتنا روئے کہ گنگا اور جمنا میں بوچھال آ گیا، دیوی دیوتا بھی روئے اس زور کی بجلی کڑکی کہ سب کلیجا تھام کر رہ گئے پر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے، یدھ ہوا اور لاشوں پر لاشے گرے اور آج بھی یدھ کے میدان میں ارجن مہاراج کے الفاظ گونجتے ہیں" دھرم کیا ہے دھرم کیا ہے بھیشم کو مارنا یا ان کا پالن پوشن کرنا، راج کرکے پرتھوی پالن کرنا بن باس کرکے بھکشا مانگنا ان میں سے کون سا دھرم کار ہے، دھرم کی خاطر اپنوں کو مارنا یا دل کی مان کر یدھ کو چھوڑ دینا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

یہ سن کر دونوں منش کے من بھر آئے انھوں نے شوک کیا اور دوسرے نے پوچھا" ہے بدری ناتھ کیا کورو اور پانڈو بھائی نہیں تھے کیا ان کے دادا ایک نہیں تھے"

"بے شک تھے"۔

پہلا بولا" کیا گوتم بدھ اور دیودت بھائی بھائی نہیں تھے"؟۔

بدری ناتھ دکھ بھرے لہجے میں بولا" بے شک! وہ بھی بھائی بھائی تھے"۔

تب دونوں ایک زبان ہو کر بولے"تو پھر بھائی بھائی کا دشمن کیوں ہوا، کیوں دولت، کرودھ اور دھرم کے نام پر ایک دوجے سے لڑتا ہے؟"

تب بدری ناتھ ہنسا اور پھر رو دیا۔

"ہے گیانی، تو ہنسا کیوں اور رویا کیوں" دونوں پوچھنے لگے۔

"جب بکری ہنس اور رو سکتی ہے تو میں کہ منش جاتی سے ہوں کیوں ہنس اور رو نہیں سکتا۔"

"بکری کیوں ہنسی اور کیوں روئی"؟

بدری ناتھ نے جواب میں ایک جاتک سنائی۔" ہے بندھووں، گوتم بدھ جیتاونا میں رہتے تھے، بھکشوان کے پاس آئے اور کہا" کیا بکریوں، بھیڑوں اور جانوروں کو بھینٹ دینے کا کوئی لابھ ہوتا ہے" گوتم

بدھ نے کہا ''نہیں میرے بھکشوو، کسی جاندار کی بھینٹ دینے سے کوئی لابھ نہیں ہوتا پھر انھوں نے جاتک کہی'' بیتے سمے کی بات ہے برہمادت براجتا تھا، ایک برہمن نے مردوں کے بھوجن واسطے ایک بکری خریدی وراپنے چیلوں کو دے کر کہا ''اس کو ندیا کنارے لیے جاؤ، اس کو جل سے پوتر کرو، اس کو صاف ستھر کر اس کو ہار پھول پہناؤ اور اس کو کچھ بھوجن دو اور واپس لے آؤ''۔ چیلے اس بکری کو لے کر چلے جب ندیا کنارے پہنچے تو وہ بکری ''ہنسی اور پھر رو دی''۔ یہ دیکھ کر بالک گھبرا گئے اور واپس پہنچ برہمن کو پوری کتھا سنائی۔ برہمن نے بکری سے پوچھا ''تو ہنسی کیوں اور پھر رو کیوں دی۔'' بکری کہنے لگی ''میں بھی پچھلے جنم میں برہمن تھی اور ویدوں کے انوسار جیون گزارتی تھی میں نے بھی ایک بکری نذر واسطے بھینٹ دی تھی اور اس ایک بکری کی ہتھیا کے کارن میرا گلا چار سو ننانوے بار کٹ چکا ہے۔ اور میں اس لیے ہنس دی کہ آج میرے گلے پر پانچسویں بار یعنی آخری بار چھری پھرے گی اور روئی اس لیے کہ میرا گلا کاٹنے کے بدلے تجھے پانچ سو بار گلا کٹوانا پڑے گا۔''

برہمن بولا کہ ''ہے بکری تو ڈر مت۔ تیرا گلا نہیں کٹے گا''۔

بکری بولی ''اے مورکھ تو ابھی بھی نہیں سمجھا، اس پاپ کی سزا تو مل کر رہے گی تیری رکھشا سے کچھ بھی نہ ہوگا''۔

برہمن نے بکری کو آزاد کیا اور چیلوں کو بولا ''اس کی رکھشا کرنا ہی اب تمھارا دھرم ہے''۔

چیلوں نے بہت رکھشا کی پر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ بکری نے ایک اونچے پیڑ کی ٹہنیوں پر منہ مارا تب زوردار کڑاکا ہوا، بجلی اس پیڑ پر گری اور پیڑ بکری پر اور بکری کا سروناش ہوگیا۔ اسی پیڑ کے برابر میں دیوا پیڑ یہ سب دیکھتا تھا اور اس نے بکری کی خریداری سے لے کر اس کی موت تک کی گھٹنا کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ گوتم بدھ نے یہ کہہ کر اس جاتک کو ختم کیا ''اس سمے میں نے دیوا پیڑ کے روپ میں جنم لیا تھا۔''

ہے بندھوو! یہ جاتکیں اور کہانیاں میں نے تمھیں سکشا کے لیے سنائیں اب واپس جاؤ اور لوگوں میں پرچار کرو۔ تب وہ دونوں منش خاموشی سے اٹھے اور بھاری من کے ساتھ جنگل سے نکل کر اپنی بستی میں چلے گئے اور پھر کبھی واپس لوٹ کر نہیں آئے۔

بدری ناتھ دونوں آنکھیں موندے آسن جمائے بیٹھا رہا پر اس کے من بھی ایک پرشن تھا اور آسن میں بھنگ ڈالتا تھا، اس کا دھیان بار بار بھٹکتا اور من کے پرشن کی طرف چلا جاتا، نراش ہو کر وہ اٹھا اور من کی شانتی کے لیے اس جنگل سے نکل کھڑا ہوا اور چلتا رہا چلتے چلتے اس کے تلوے پھٹ گئے اور ان میں سے خون رس رس کر بہنے لگا پر وہ چلتا رہا۔ چلتے چلتے تھک کر ایک ندی کنارے تھوڑی دیر دم لینے رکا، آکاش میں جہاں پونم کا چاند ندی کی سطح پر اپنی چھب دکھلا رہا تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی وایو چل رہی تھی اور جل ندی کی سطح پر دھیرے دھیرے

بہہ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اس وایو کا آنند لیتا رہا پھر ایک شاندار انداز سے کھڑا ہوا اور آکاش کی جانب منہ کر کے بولا" اے پیدا کرنے والے جو بھی تیرا نام اور صفت ہے، تو نے ہی اس سنسار کو بنایا ہے، اے سوریا، چندراما، ستاروں اور اس دھرتی کے پیدا کرنے والے، ہم مٹی کے وہ پتلے ہیں جن کو نچا کر تو آنند لیتا ہے، میں اپنے بان باس سے سکھی تھا پھر تو نے من میں مشکل پرشن کا برچھا کیوں اتارا، میں جانتا ہوں تو مجھے سن رہا ہے، میں نے بھی قسم کھائی ہے کہ جب تک اس راز کو جان نہ لوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔" پھر وہ کچھ دیر تک وہیں کھڑا ہو کر ندی کے پانی کا نظارہ دیکھتا رہا اور ایک نئے جذبے کے ساتھ واپس اٹھ کھڑا ہوا پھر اور قدم اٹھاتا من میں دیپ جلائے خاموشی سے چل پڑا، کئی دن بعد وہ ایک عجیب وغریب گھاٹی میں پہونچا، جہاں حدنگاہ تک پیلی سرسوں جیسے سوکھے گھاس کے میدان تھے اور ان میں صرف ایک تنہا پیڑ تھا جس کی ننگی شاخیں وایو سے جھولتی تھیں اسے لگا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں اسے اس پرشن کا جواب ملے گا تب تو وہ اس پیڑ کے نیچے آنکھیں بند کر گم ہو گیا۔ سمے بیتا وہ سوکھے گھاس کا میدان پھر سے ہرا بھرا ہوا، وہ پیڑ جس پر ایک پتہ بھی نہ تھا پتوں سے اوپر سے نیچے تلک بھر گیا، آس پاس بستیاں آباد ہو گئیں لیکن وہ ویسا کا ویسے آسن جمائے بیٹھا رہا خود میں گم جہانوں کی سیر کرتے سچ کی تلاش میں۔

اس کی سچی لگن کو دیکھ کر پرماتما کو اس پر ترس آ گیا، اس نے اپنے ایک شش بھیجا کہ جاؤ اور اس کے پرشن کا جواب دو۔

اس نے ایک آواز سنی۔ تمھاری تپسیا پوری ہوئی۔ تمھیں سچ کی تلاش تھی اور تم نے اسے پالیا ہے، بے شک تیری سوچیں جو مکڑی کے جالوں کی جیسی پھیلیں تھیں، اب وہ ایک تناور پیڑ بن گئی ہے، ہے بدری ناتھ! آنکھیں کھول اور دیکھ تیرا جواب تیرے سامنے بیٹھا ہے۔

اس نے جب آنکھیں کھولیں، اس کی آنکھوں کے سامنے جہاں ہریالی سے تر گھاس کا میدان تھا، بیل بوٹے اور پرندے تھے اور ان ہریالی اور رنگوں سے نچڑتے اس منظر میں کوئی تھا بے حد مانوس اور وہ وہی تو تھا اس کے سامنے وہ خود تھا جیسے سامنے آئینہ رکھ دیا گیا ہو تب بدری ناتھ بولا "سچ کیا ہے۔"

تم سچ ہو۔

تو پھر تم کون ہو؟

تم بھی میں ہوں اور میں بھی تم ہوں۔

تو سچ کون ہے۔

سچ بھی تم ہو۔

لیکن یہ پیڑ اور پکھیرو ۔
ہریالی سے نچڑتا یہ گھاس کا میدان ۔
نیلاہٹ سے تریہ آکاش کی چادر ۔
بادلوں کے آوارہ جھنڈ ۔
چہرے پر پڑتیں سوریا کی کومل کرنیں ۔
یہ بھی سچ ہیں ۔
گوتم بدھ کا بار بار جنم لینا ۔
مہابھارت کا ہونا ۔
یہ بھی سچ ہے ۔
ایسا ہوا کیوں؟
من میں پرشن ڈالنے والا بھی وہی ہے ۔
اتتر دینے والا بھی وہی ہے ۔
وہی جیون ہے وہی مرتیو ہے ۔
آکاش میں اڑتا پنچھی بھی وہی ہے ۔
ندی میں بہتا جل بھی وہی ہے ۔
وایو کے سنگ اڑتا پتہ بھی وہی ہے ۔
وہی سب کچھ ہے ۔
وہی شروعات ہے، بیچ ہے اور آخر ہے ۔
وہی دھرم ہے وہی آدھرم ہے ۔
وہ تو ممتا ہے، ناری کی لجا ہے، بچے کی مسکان ہے ۔
پر منش دھرم کے نام پر یدھ کیوں کرتا ہے؟

تب دو جا اس کے سامنے سے اٹھا اور گول گول چکر کاٹنے لگا اور دکھ بھری آواز پوچھا'' گوتم بدھ نے یہی شکشا دی تھی؟''۔

''بول جواب دے''..... پہلا سر جھکائے سنتا رہا ۔

بول، بولتا کیوں نہیں'' کیا کرشن اور ارجن نے کہا دھرم کے نام پر منش کو مارو اور یدھ کرو؟''

نروان ملا تو وہ اسی پیڑ میں سما گیا جہاں اس نے آسن جمایا تھا، سال میں ایک بار وہ اس پیڑ سے نکل کر واپس اس دھرتی میں آتا ہے اور منش جاتی کے لیے شوک کرتا ہے اور کرشن مہاراج بولتے ہیں ''دھرم کیا ہے دھرم کیا ہے بھیشم کو مارنا یا ان کا پالن پوشن کرنا، راج کر کے پرتھوی پالن کرنا بن باس کر کے بھکشا مانگنا ان میں سے کون سا دھرم کار ہے، دھرم کی خاطر اپنوں کو مارنا یا دل کی مان کر یدھ کو چھوڑ دینا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، میری سمجھ میں نہیں آتا''، بکری پھر ہنستی اور رو دیتی ہے اور ایک کڑاکا ہوتا ہے، بجلی اس پیڑ پر گرتی ہے اور پیڑ بکری پر اور بکری کا سروناش ہو جاتا ہے اور دور کہیں جنگلوں میں دیودت جو اس سے وشال مگرمچھ کے روپ میں جنما تھا گوتم بدھ کو جو اس سے بندروں کے راجہ ہنومان کے روپ میں جنمے تھے، ان کو کہتا ہے ''جل کیوں نہیں پیتے'' اور کہیں برہمادت براجتا ہے اور اس کا سفید رنگ کا خوبصورت گھوڑا کیچڑ بھرے تالاب کے پاس نہیں جاتا ہے اور گوتم بدھ کہتا ہے ''میں سچ کو ڈھونڈتا تھا حیران ہوتا تھا، جب متلاشی تھا سچ نہ ملا اور جب سچ ملا تو میں نے ادھر اُدھر دیکھا میں نہیں تھا۔''

☆☆☆☆

محمد شعیب

زبان کاٹنے والے

بالفرضِ محال اگر میری زبان بچ جاتی ہے تو!!! یہ بات میں اپنی زبان کٹنے کے آخری لمحے کے ہزارویں حصے سے پہلے سوچتا ہوں!

کچھ بندروں نے مجھے بری طرح دبوچا ہوا ہے اور ایک بوڑھے بندر کے ہاتھ میں تیز دھار اُسترا چمک رہا ہے۔ یہ سب میری زبان کاٹنے کے درپے ہیں۔ مجھے کسی معجزے کی کوئی توقع نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں یہ میری زبان کاٹنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مجھے معلوم ہے، میری زبان کس جگہ سے کاٹی جائے گی؛ ان کی کوشش ہوگی کہ اسے جڑ سے کاٹا جائے۔ زبان کاٹنے والے عموماً جڑ ہی سے زبان کو کاٹتے ہیں اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد وحشیانہ جشن مناتے ہیں۔ بوڑھے بندر کے ساتھ میرے ہم جنس بھی ہیں، یہ میری زبان کٹنے کے بعد اس پر مرہم رکھیں گے، اگر اس موقع پر میرے ہم جنس ذرا سی مزاحمت کریں تو میری زبان بچائی جا سکتی ہے!

زبان کٹنے کا یہ پہلا واقعہ نہیں ہے۔ ہمارے خطے میں یہ رسم صدیوں سے رائج العمل ہے۔ کبھی کبھی اس کے خلاف ہلکا سا احتجاج ہوتا ہے، لیکن یہ کسی کی پروا نہیں کرتے۔ مجھے اس قبیح رسم کی مکمل تاریخ معلوم نہیں ہے، ہاں! جہاں تک یاد پڑتا ہے، سب سے پہلے انھوں نے میرے پردادا کی زبان کاٹی تھی؛ بیان کیا جاتا ہے کہ میرے پردادا کی زبان بڑی میٹھی تھی، اُس کی زبان میں تاثیر بھی بڑی تھی۔ ان ظالموں کے آبا نے جس وقت یلغار کی تو سب سے پہلے میرے پردادا کی زبان پر وار کیا۔ اگرچہ یہ پر کاٹنے میں بھی تاخیر نہیں کرتے، مگر ان کے خیال میں پَر کٹنے کے باوجود زبان کی موجودگی زیادہ نقصان دہ ہے۔ زبان کٹنے سے ہر عضو معطل ہو جاتا ہے، کان سننے سے قاصر ہو جاتے ہیں اور اشاروں سے باتیں کرنی پڑتی ہیں، رفتہ رفتہ بے زبانی کی وجہ سے حرکت محدود ہو جاتی ہے اور اپنوں میں اجنبی ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے، لیکن چند ابتدائی برسوں کے بعد یہ احساس بھی مر جاتا ہے اور آخر کار زمین سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ میری زبان کاٹنے والوں کو اِن سب محسوسات اور جزئیات کا ادراک ہے، اسی لیے یہ میری زبان کاٹ رہے ہیں اور مکروہ شکل والا بوڑھا بندر اب میری جانب قدم بڑھا چکا ہے۔ صرف دو قدم کا فاصلہ ہے۔ دو قدم کا فاصلہ ہوتا ہی کتنا ہے؟ دو قدم کا نہیں کہنا

چاہیے، لمحے دو لمحے کا فاصلہ ہے۔ اس کا تیز دھار اُسترے والا چکیلا ہاتھ اُوپر اٹھ چکا ہے اور دیگر بندروں نے مجھے مزید سختی سے دبوچ لیا ہے۔ میرے ہم جنس مرہم لیے تیار کھڑے ہیں، جیسے ہی مکروہ شکل والا بوڑھا بندر اُسترے کے ایک ہی وار سے میری میٹھی زبان کو جڑ سے کاٹ دے گا اور یہ بندر زبان کو ہمیشہ جڑ ہی سے کاٹتے ہیں، اس کے بعد میرے ہم جنس تیزی سے آگے بڑھ کر اس پر مرہم رکھیں گے، تاکہ مجھے کم سے کم تکلیف ہو۔

میں اپنے پر دادا کا قصہ سنا رہا تھا: میرے پر دادا کو گھیرنے والے دور دراز کی صحرائی سرزمینوں کے باسی تھے۔ پہلے پہل وہ ایک ادھ جتھے کی صورت میں یہاں آتے اور دانا دنکا سمیٹ کر جلد واپسی کی راہ لیتے، پھر ایک بار اُن کو بڑا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ میرے پر دادا کے بادشاہ نے ان کو بھیجا جانے والا سامان قبضے میں کر لیا، بس پھر کیا تھا، انھوں نے اپنے تمام لاؤ لشکر کے ساتھ حملہ کر دیا اور ہمارا بادشاہ مارا گیا۔ اس حملے کے بعد تاریخ بدل گئی اور وہ واپسی کا رستہ بھول گئے۔ میری معلومات کے مطابق زبان کاٹنے کا طریقہ اُس وقت سے شروع ہوا، لیکن اُس وقت زبان جڑ سے نہیں کاٹی جاتی تھی یا انھیں زبان کاٹنے کی اٹکل نہیں آتی تھی، وہ میرے دادا کی زبان جڑ سے نہیں کاٹ سکے، اگرچہ زبان کٹنے کے اس واقعہ نے میرے پر دادا اور اُس کے ہم اثروں کو کافی متاثر کیا، وہ زبان کاٹنے والوں کے زیر اثر آ گئے اور اپنے پُرکھوں کے اطوار کھو بیٹھے۔ اس پہلے واقعے میں زبان کٹنے کے بعد پَر نہیں کاٹے گئے تھے، وہ خود ہی جھڑ گئے تھے اور جب نئے پر نکلے تو وہ اُڑان سے عاری پَر تھے۔

میرے دادا کا زمانہ اتنا پرانا نہیں ہے۔ وقت نے بالکل ہی پرانی چال چلی تھی، لیکن اس بار دادا کے بادشاہ نے کسی کو کوئی بہانہ میسر نہیں آنے دیا تھا اور یہ صحرائی سرزمینوں والے بھی نہیں تھے۔ پہلے والے بہت جنگ جو اور دلیر تھے۔ نئے زبان کاٹنے والے بزدل تھے۔ انھوں نے میرے دادا کے ہم اثروں کو تقسیم کر کے جلد ہی انھیں قابو میں کر لیا۔ اس کے بعد دادا کو جکڑ لیا گیا، اسے جکڑنے والے بندر گورے تھے۔ سوا دو سو سال پہلے انھوں ایسے ہی ایک تیز دھار اُسترے سے اُس کی زبان کاٹی تھی۔ اُس وقت بھی اُس کے اپنے پٹش پٹش تھے، جنھوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ وہ مجبور تھے یا کسی دباؤ کے تحت انھوں نے اپنی زبان کٹوا دی۔

مجھے معلوم ہے، میری زبان کٹنے میں اب زیادہ وقت نہیں ہے، لیکن میں آپ کو اپنے باپ کی زبان بچ جانے کا واقعہ ضرور سنانا چاہتا ہوں۔ یہ واقعہ گذشتہ دونوں کے واقعات سے قدرے مختلف ہے۔ کوئی ستر سال پہلے کا واقعہ ہے، جب گورے بدیسی بندروں نے واپسی کی راہ اختیار کی اور سارا اختیار دیسی بندروں کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس وقت ہر دیسی بندر کے ہاتھ میں تیز دھار اُسترا تھا۔ میرے باپ نے ان دیسی بندروں کے چنگل سے بچنے کے لیے دوڑ لگا دی۔ وہ اپنی زبان بچانا چاہتا تھا، جسے کاٹنے کے لیے بندروں کے کئی گروہ اس

کے پیچھے دوڑے، مگر وہ اپنی جان بچا کر اُن کی پہنچ سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُسے زبان کی بڑی قدر تھی۔ وہ بندروں کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کے پَر بھی سلامت تھے، جس کی وجہ سے وہ چہکتا، اُونچی اُڑانیں بھرتا، اُس کی آنکھوں میں سنہرے خواب تھے۔ وہ میری بھلائی کا متمنی تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں مجھے اپنے سے زیادہ بلندی پر پرواز کرتے دیکھتا اور اس کے لیے وہ زبان کی حفاظت کو سب سے اہم سمجھتا تھا۔ کاش! میں اُس کی بات پر پہلے توجہ دیتا تو آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے مجھے جکڑ کر بے بس کرنے والے وہی بندر ہیں، جنھوں نے میرے باپ کا پیچھا کیا تھا، یا یہ بندر اُن کی اولاد میں سے ہیں۔ شاید ان کے آبا نے انھیں میری زبان کاٹنے پر مامور کیا ہو! انھوں نے اپنے آبا کی بات کا پاس رکھا اور میں اپنے باپ کی نصیحت فراموش کر بیٹھا۔ اب میرے شعور کی آنکھ کھل گئی ہے تو مجھے احساس ہو رہا ہے، یہ سب اچانک نہیں ہوا۔ انھوں نے بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ مجھے گھیرا ہے۔ زبان کاٹنے سے پہلے یہ میرے پروں کی بنیادیں کمزور کرتے رہے۔ انھیں معلوم تھا: میرے باپ کی اُڑان ان کے پُرکھوں سے بہت بلند تھی اور اولاد تو باپ ہی سے قوت حاصل کرتی ہے۔ شاید ان کا یہی خوف میری زبان کی حفاظت کا ضامن رہا لیکن اب میرے پر کمزور ہو چکے ہیں، میری اُڑان میں توانائی نہیں رہی۔ یہ میرے چاروں جانب منڈلاتے رہے اور آخر کار میں ان کے چنگل میں پھنس چکا ہوں۔ مکار بوڑھے بندر اور میرے درمیان اب کسی قسم کا فاصلہ نہیں رہا اور اُس کا تیز دھار اُسترے والا ہاتھ اُوپر اُٹھ چکا ہے، دو قدم یا لمحے دو لمحے کا فاصلہ مٹ چکا ہے، میں اُن کی نیت سے واقف ہو چکا ہوں، بندروں نے مجھے پوری طرح قابو کر لیا ہے اور میرے ہم جنس زبان کٹنے کے بعد اس پر مرہم لگانے کے لیے بالکل تیار کھڑے ہیں، اُن کی آنکھوں میں کسی قسم کی حرارت نہیں ہے، بل کہ وہ اب مزید تاخیر نہیں چاہتے۔ مکار بوڑھے بندر کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جاتی ہے اور اچانک اُس کا اُسترے والا ہاتھ میری زبان پر وار کرنے کے لیے حرکت میں آتا ہے۔

ٹھہریے! ابھی میں نے اپنے بھائی کی زبان کٹنے کا واقعہ آپ کے گوش گزار نہیں کیا۔ ذرا وہ بھی سن لیں تاکہ کوئی تشنگی باقی نہ رہ جائے۔ باپ کے مرنے کے تیئیس سال بعد ہم دونوں نوجوان تھے۔ تیئیس (۲۳) سال کی عمر، زندگی کے تجربات سے ناواقفیت کی وجہ سے لااُبالی ہوتی ہے۔ میرا بھائی اسی لااُبالی پن کا شکار رہا۔ میں ان بندروں کی شکلیں پہچان رہا ہوں، ہاں یاد آیا! بالکل! صدفی صد! یہ وہی بندر ہیں، جب میں نے اپنے جڑواں بھائی سے زبان کی حفاظت کے بارے میں بات کی تھی، تو انھی بندروں نے اُسے ورغلایا تھا۔ میں نے تو صرف باپ کی نصیحت اُس کو یاد دلائی تھی، لیکن وہ میرے اندازے سے زیادہ لااُبالی پن کا مظاہرہ کر بیٹھا۔ وہ

ان بندروں کی باتوں میں آگیا اور باپ کی دی ہوئی زبان سے ہاتھ دھو بیٹھا! یہاں میں یہ ہرگز نہیں کہنا چاہتا کہ اُس نے اپنی زبان کٹوائی، مگر باپ کی نافرمانی نے اُس سے جوانی چھین لی اور وہ دوبارہ جنم کے عذاب سے گزرا۔ نئے جنم کے بعد وہ مجھ سے ہاتھ نہیں ملاتا، دور بھاگتا ہے---میرے باپ کے دشمنوں کی جانب! اور میرے باپ کے دشمن میری غفلت سے فائدہ اُٹھا کر میری زبان کے درپے ہیں۔ مکار بوڑھے بندر کا تیز دھار اُسترے والا ہاتھ میرے منہ سے باہر لٹکی ہوئی زبان کی جانب لپکتا ہے، میں جانتا ہوں، اس کا یہ وار بہت کاری ہے، میری زبان ایک ہی وار سے کٹ جائے گی اور اس حادثے کے فوراً بعد میں نیم جاں ہو جاؤں گا، درد کی ٹیسیں میرے حواس معطل کر دیں گی، میری تہذیب گونگی زبان تلے دم توڑ دے گی اور میرے بچے کسی نئی زبان میں باتیں کرنے لگیں گے اور---اور---میرے ہم جنس ابھی تک زبان کٹنے کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ پتا نہیں وہ بندر کا اُسترے والا ہاتھ پکڑ کیوں نہیں لیتے---کہیں یہ بھی اس کے ساتھ مل تو نہیں گئے! آہ! انھیں کب شعور آئے گا کہ زبان کٹنے سے شناخت ہی گم ہو جایا کرتی ہے۔

زبان کٹنے سے پہلے کے اس آخری لمحے کے ہزارویں حصے میں، میں آیندہ کے بارے میں سوچتا ہوں---اس لمحے کے بعد اشاروں کی زبان میں باتیں کیا کروں گا---میرے ہم جنس، میری بات سمجھنے میں مشکل محسوس کریں گے---رفتہ رفتہ میرے کان اُن کی آوازیں سننے سے قاصر ہوتے جائیں گے---کچھ برسوں بعد ہم اپنی پہچان کھو دیں گے، اپنے ماضی سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جائے گا اور---پھر ہم سب اجنبی منزلوں کے راہی بن کر رہ جائیں گے اور اجنبی منزلوں کے مسافروں کی قسمت میں ہمیشہ کے لیے سراب لکھ دیے جاتے ہیں!

بالفرض محال اگر میری زبان بچ جاتی ہے تو!!! یہ بات میں اپنی زبان کٹنے کے آخری لمحے کے ہزارویں حصے سے پہلے سوچتا ہوں!

اسی وقت میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوتا ہے---ہاں! میری ماں کی زبان آج تک سلامت ہے! میں اپنے بچوں کی زبان، اُس کی حفاظت میں دوں گا---کاش! میں بھی مادری زبان اختیار کرتا تو آج میں بندروں کے حصار میں نہ ہوتا---مگر اب ایسا نہیں ہوگا---میرے بچے مادری زبان ہی اختیار کریں گے اور اس کے بعد شاید زبان کاٹنے کی یہ قبیح رسم ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے!

☆☆☆☆

نازیہ خلیل

مٹی کا سفر

میں نجانے کب سے اس اندھیری نگری میں بیٹھی تھی اپنے وجود، جنس، شکل وصورت، گرد وپیش اور موسم کی کروٹوں سے بالکل بے خبر اچانک تیز ہوا کے مجھے پے در پے تھپیڑوں نے جھنجھوڑا میں گھبرا کران تاریک راستوں میں چھوٹے چھوٹے متواتر قدم اٹھانے لگی۔ باریک پگڈنڈی پر میرے اٹھائے جانے والے قدم مجھے کس منزل کی سمت لے جا رہے تھے۔ میں قطعاً نہیں جانتی تھی۔ اچانک اس تیرگی میں مجھے دور سے آتی روشنی کی لکیر محسوس ہوئی۔ میرا وجود اس روشنی کی لکیر کی طرف اک طلسماتی طاقت کے تحت کھنچنے لگا اچانک ایک مٹی کی ریل گاڑی میرے قریب آ کر رکی پگڈنڈی نے میرے قدم چھوڑ دیے میں نے محسوس کیا کہ اب میرے قدم ریل گاڑی کے فرش کی سطح پر تھے۔ ریل گاڑی میں داخل ہوتے ہی تیز روشنی سے میری آنکھیں چندھیانے لگیں اور اس چبھن سے چند قطرے میرے چہرے کو نم کر گئے۔ مجھے رونے کے سوا کچھ سمجھ نہ آیا آنسوؤں نے گاڑی کے اندر کے منظر کو دھندلا دیا۔ آنکھیں بار بار جھپکنے کے بعد مجھے گاڑی میں ایک اور وجود دکھائی دیا۔ میری آنکھوں کی طرح اس وجود کی آنکھیں بھی نم تھیں میں گھبرا کر اس دوسرے وجود کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس وجود کے قریب جاتے ہی تیز ہوائیں تھمنے سی لگیں اور گہری طمانیت کے احساس نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اندھیرا چھٹنے لگا دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت تھی۔ ہر منظر نیا تھا مسلسل ریل گاڑی کے ڈبے کے ہر منظر سے مجھے انسیت سی ہونے لگی۔ کچھ عرصہ گزرا تو مجھے احساس ہوا کہ اس ریل گاڑی میں اور بھی بہت سے وجود ہیں میں دھیرے دھیرے سب سے مانوس ہونے لگی۔ کچھ وجود تو میرے جیسے ہی تھے اور کچھ یکسر مختلف۔ کچھ میں گہری اپنائیت اور کشش کا احساس تھا جب کہ کچھ ساتھ سفر کرنے کے باوجود بھی بیگانہ ہی رہے۔ گاڑی ایک ہی رفتار کے ساتھ ان دیکھی منزل کی جانب رواں تھی۔ گاڑی کی ہر کھڑکی سے جھانکنے والے مسافر کے لیے باہر کا منظر جدا تھا۔ کسی کھڑکی کے باہر ڈھلتی شام کا منظر تھا اور کسی کھڑکی کے باہر اجلا چمکدا رون، کہیں کالی گھٹائیں اور کہیں گہری دھند کوئی مسافر ان مناظر سے محظوظ ہوتا اور کوئی پریشان حال جب کہ کوئی مطمئن اور کوئی بے چین اور مضطرب دکھائی دیتا۔ کوئی مسافر ایسا تھا جو تھک کر ان مناظر سے لاتعلق ہو کر اپنی ہی گود میں سر جھکائے بیٹھا تھا مگر جو لاتعلق ہو گیا تھا وہ پھر سے ان اندھیروں میں ڈوبنے لگا تھا جس سے اس کا تعلق اس ریل گاڑی میں

سوار ہونے سے پہلے تھا۔ ریل گاڑی اپنی پٹڑی بدلتی، ہچکولے کھاتی راستے کے نشیب وفراز طے کرتی بہر حال آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنا عکس سب سے پہلے اس وجود کی آنکھوں میں دیکھا جس نے مجھے اس ریل گاڑی میں سوار ہوتے ہی اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ مجھ پر اپنی جنس کا انکشاف ہوا ریل گاڑی کے آگے بڑھنے کے انداز میں تبدیلی آتی رہی اور میرا وجود ساتھ اپنی ساخت بدلتا رہا۔ کھڑکی سے باہر کے مناظر بھی جلد جلد بدلتے رہے۔ اور ریل گاڑی میں بیٹھے مسافر بھی گھٹتے بڑھتے اور اترتے چڑھتے رہے۔ اب مجھ سے میری ملاقات اکثر رہنے لگی میں خود کو دریافت کرنے لگی۔ اور خود سے مانوس بھی ہونے لگی۔ ایک دن کھڑکی کے باہر کا منظر دھند میں لپٹا تھا۔ میں نے نیم تاریک ریل کے ڈبے میں جھانکا وہ مہرباں وجود مجھے کہیں دکھائی نہ دیا میں وحشت زدہ ہو کر ادھر اُدھر اس وجود کو تلاشنے لگی۔ میں نے دھند میں لپٹے اس منظر کو دیکھنے کے لیے کھڑکی سے ایک بار پھر سے جھانکا وہ مہرباں وجود نجانے کب چپکے سے ریل گاڑی سے اتر چکا تھا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ خاکی وجود ریل گاڑی کے خاکی پہیوں تلے روندا گیا اور اس کی خاک ریل گاڑی کے پہیوں سے اٹھتی گرد میں تحلیل ہونے لگی۔ یک لخت میرا جی چاہا کہ میں اس رواں دواں ریل گاڑی سے کود جاؤں مگر میں زیادہ دیر تک پیچھے نہیں دیکھ پائی کہ بہر حال مجھے آگے دیکھنا تھا۔ اب پھر سے مجھے کچھ چھوٹے بڑے وجود اپنے آس پاس سفر کرتے دکھائی دینے لگے۔ میں نے ایک پھر کھڑکی سے جھانکا گویا رنگ و بو اور تتلیوں کا اک شہر آباد تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ گاڑی نے اک بار پھر پٹڑی بدلی ہے۔ مجھے ایک ننھا وجود ریل گاڑی کے داخلی دروازے پر اشکبار آنکھوں کے ساتھ اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر حیراں پریشاں کھڑا دکھائی دیا پھر وہ اک طلسماتی طاقت کے تحت میری جانب کھنچتا چلا گیا اور میں نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ وہ ننھا وجود میری گود میں تھا اور وہ تمام مناظر میری کھڑکی ہی سے دیکھتا تھا۔ وہ میری آنکھوں میں اپنا عکس دیکھا کرتا اور میں اس کے وجود میں سایہ۔ کھڑکی کے باہر کا منظر ڈھلنے لگا شام پھیلنے لگی۔ میرا وجود چھوٹا اور میرا سایہ بڑا ہو کر مجھ سے جدا ہونے لگا۔ میں ایک بار پھر سے ویسی ہی طلسماتی طاقت کے نرغے میں تھی۔ کب میرے قدموں کو ریل گاڑی کے فرش کی سطح نے ڈھکیل کر پھر سے ایک پگڈنڈی پر جا دھکیلا۔ میں نے اچٹتی سی اک الوداعی نگاہ ریل گاڑی میں بیٹھے مسافروں پر ڈالی۔ مگر میرا خاکی وجود ریل گاڑی کے پہیوں تلے روندا جانے لگا۔ اور مٹی کا یہ سفر مٹی کے ساتھ ہی ملنے لگا۔ اب میرا احساس پھر سے انجانے راستوں پر حیران کسی انجانی روشنی کا منتظر ہے۔

☆☆☆☆

حمزہ حیدر

حسِ مشترک

ہمیشہ کی طرح وہ گمنامی کو خود پر طاری کیے انھی گلیوں کے حصار میں تھا جن کی بوسیدہ خاک اسے اپنی داستانیں سناتی۔ گلیوں کوچوں اور شاہراہوں پر موجود رواں دواں زندگی کے درمیاں عمارات، زمین۔ مکاں سے باتیں کرنا اس کی مجبوری تھی۔ دھیرے دھیرے یہ مجبوری پھر اس کے شوق میں تبدیل ہو گئی۔ مٹی سے رفاقت کا سلسلہ اسے تب اور شدت سے محسوس ہوا جب مختلف علاقوں کی بہت سی گلیاں اسے مستقل پکارنے لگیں۔ گلیوں میں داخل ہوتے ہی بوسیدگی سے چور عمارتوں کو وہ اپنا میزبان پاتا۔ مکانوں کے شیشے اسے طرح طرح سے بجتے محسوس ہوتے۔ کسی گھر سے جھانکتی روشنیاں اسے یک دم مسکرا کر دیکھتیں اور کبھی انھی روشنیوں کو وہ خاموش سسکیاں بھرتا دیکھتا۔ قدیم عمارتوں کے اکھڑے پیلے رنگ اور ان رنگوں کے احاطے میں لٹکے کپڑے اُسے عجب تخمینے میں مبتلا رکھتے۔ کسی گھر کے کسی کمرے میں اس کو دیواروں سے مس پردے راہ چلتے ارباب سخن محسوس ہوتے۔ وہ ادراک میں مگن مختلف کیفیات میں خود کو ڈھالنے کا عادی ہو چکا تھا۔ یہ اجنبی کیفیات اس کے ساتھ باہمی تعلق رکھنے لگیں اور اس کا دل ان کو خوشی خوشی جگہ فراہم کرتا گیا۔

اس کا دل دراصل ہجرت کرتے ماضی کو سفیرِ حال سمجھ کے ملتا۔ اِس اَدق صفت سے وہ ماضی کے جیتے مرتے لمحات کو سہارا دیتا مگر اب اس رشتے کی جھنجھناہٹ اس کے وجود کو مستقل مضطرب رکھتی۔ اکثر گلیوں میں موجود مکاں اپنے اکھڑے پیلے رنگوں سے اس کو اپنی عمر بتاتے۔ وہ معمول کے مطابق زمین و مکاں سے گفتگو کرتا رہتا اور یہی وجہ تھی ماضی اس کے حال کے آگے کسی تن آور وجود کی مانند کھڑا ہو جاتا۔ وہ حال میں اپنے ماضی کو خود سے مس کرتا رہتا تا کہ ماضی کا کچھ حصہ اس کے مستقبل میں پھر جگہ بنا لے۔ اِس ذہنی سرگرمی کے باعث وہ کشمکش کی سیڑھیاں چڑھتا چلا جا رہا تھا، وہ وقت کو ہی اپنا ساتھی قرار دے چکا تھا۔

بعد ایک صبح پھر گھر سے نکلنے پر اِس کیفیت نے اس کو حسبِ معمول گرفت میں لے لیا۔ زمین و مکاں سے باتیں کرتا شخص پھر کہیں دور نکل گیا۔ ایک نیا علاقہ اور عمارات پر بنی اناریاں بڑی تعداد میں اس کی آنکھوں سے ملیں۔ وہ علاقے کی عمارتوں میں کھوتا چلا گیا۔ یہ کیفیت اس کے لیے نئی نہیں بلکہ خاک سے وابستہ جذبات واحساسات اکثر اس کے اندر سرائیت کر جاتے اور وہ انھی کی زبان بولنے لگتا۔

ایک قدیم چار منزلہ عمارت نے پھر اس کو اتنی ذور سے جکڑا کے پوری طاقت اور جرات کے باعث بھی وہ خود کو عمارت کے ملبے سے علاحدہ نہیں کر پایا۔ اِس عمارت کے جے اکھڑے رنگ اُسے نہایت ساکن نظر آئے۔ عمارت کی کھڑکیوں میں جھانک کر اُسے اندازہ ہوا کہ کئی منزلوں پر تو بیروزگاری بال کھولے رقص میں مصروف ہے۔ وہ اپنے دل سے کہتا ہے، یا اس کا دل اس سے، یہ نہایت قدیم عمارت ہے جو ان گنت تجربوں کے باعث تھوڑی خوش تھوڑی ملول ہے۔ ان دیواروں کے پیچھے کئی جذبات ہوں گے اور وہ آج تک ان میں گردش کرتے ہوں گے۔ بہت سے جذبات تو پرانے کرایہ دار کے محسوس ہو رہے ہیں۔ جواب فقط احساس ہیں۔ ہر منزل پر ایک گھر ہے جس کے رہنے والے اس کو چھوڑتے وقت اپنا ارتسام یہیں محفوظ کر جاتے ہیں بعد میں اور رہنے والے ضرور ارتسام کی حدت سے گرانی محسوس کرتے ہوں گے۔ اس کا دل کہتا ہے یا اس کا ذہن خیال سے دو چار تھا کہ، کتنے لوگ اِس عمارت میں رہ کر جا چکے ہوں گے مگر نئے آنے والوں کے نئے جذبات ان میں اپنی جوانی کا رنگ کر دیتے ہوں گے۔ گزشتہ رہنے والوں کے جذبات نئے آنے والوں کے جذبات سے ٹکرا کر احساسات کو پامال کرتے ہوں گے مگر پھر برداشت کا مادہ ان میں ٹھہراؤ پیدا کر دیتا ہوگا۔

اس کا دل کہتا ہے، پھر کتنے آئے اور گئے ہوں گے، اب تو اس عمارت کا رقبہ ماضی کے لاتعداد جذبات کو احسن طریقے سے جگہ بھی نہیں دے پا رہا ہوگا۔ عمارتوں کو پڑھتا سمجھتا شخص پھر اپنے ذہن کو سمجھاتا ہے کہ کچھ قدیم جذبات کو نئے جذبات نکال باہر کرتے ہوں گے، ہم شاید دیکھ نہیں پا رہے مگر قدیم جذبات اور ضعیف احساسات عمارت کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہون گے، اِس عمارت سے چڑھتے اُترتے لوگ ماضی کے کتنے احساسات کو روندتے ہوں گے۔ عمارت کی ایک خالی منزل پر رکھی چھوٹی سی سائیکل بتا رہی ہے، کہ کسی بچے کا اِس منزل سے تعلق رہا ہوگا۔ سائیکل اتنی پرانی نہیں، بچہ اپنی عمر سے چار، پانچ سال کم کر چکا ہوگا۔

ذہن اور دل کی ہم آہنگی کے باعث اس کا آپ خود سے کہتا ہے کہ، نئے جذبات اب مگر اپنی قدر میں اضافہ کر چکے ہیں، ان کو آخوری بھرتی نہ سمجھا جائے۔ نئے جذبات بھی کسی گھروندے سے نسبت رکھتے ہیں اور ضخامت سے بھرپور ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر ان نئے جذبات کو اگلی صدی محسوس کرے گی جب یہ بھی ضعیفی کی حالت گلیوں کوچوں میں قصے کی صورت منڈلاتے ہوں گے اس کا دل کہتا ہے، ''احساساتِ خاک میں شوریدگی کو حاوی نہ کیا جائے، کسی کو بھی حال سے اصلی نسبت پر اطمینان نہیں۔ مستقبل کے حال ہو جانے پر ماضی کا احساس ہو جانا ہی جذبے کو اس کا اصل مرتبہ عطا کرتا ہے۔

اس کا معمول ہی یہ بن گیا تھا، پھر قدیم عمارت میں رچے بسے یادوں کے ملبے سے خود کو علیحدہ کر وہ اور عمارتوں سے رفاقت اختیار کرتا رہا۔ بلاشبہ وہ گلیوں سے بنتے راستوں کو خود میں حلول دیکھتا۔ اپنے رہائشی

مقام پر آتے ہی اس کو اپنے گھر میں بھی انجان زندگیاں منڈلاتے دیکھتیں۔ وہ اپنی زندگی کے ساتھ کئی اور زندگیوں کو بھی رقص کرتا دیکھتا، جن کا اس سے خونی نہیں مگر احساسات کا رشتہ تھا۔

اُسے محسوس ہوا ایک زندگی وہ جسمانی طور پر گزار رہا تھا، مگر ایک اور زندگی وہ جسمانی حدود سے دراز زمین۔ مکان کی قید سے باہر محسوس کرتا۔ لیکن یہ دوسری زندگی بھی مقامات کو خود پر پابند کر چکی تھی۔ وہ زندگی ان جانے رشتوں کو اپنا حصہ ماننے لگی تھا۔ کبھی وہ جسمانی زندگی کو بے جسمانی زندگی پر حاوی کرتا اور کبھی بے جسمانی زندگی کو جسمانی قید کے محروسہ کرنا چاہتا۔ عمارتوں میں کھو جانے کے لیے اس کو اپنی جسم کی قید محسوس نہ ہوتی۔ جسمانی حدود سے بچتی بچاتی زندگی ہی اس کو اصل ارمغان محسوس ہوتی جو قدیم عمارتوں میں بسے واقعات پر ششدر رہتی۔ اس کی جسمانی زندگی تھکاوٹ میں چور آتش افسردہ کی مانند تھی جو اپنے آپ کو بجھا بجھا محسوس کرتی۔ ماضی میں گزرے لمحات اس کو پھر اور شدت سے محسوس ہونے لگے۔ وہ بے جسمانی زندگی کو ماضی کی ان زندگیوں کے ساتھ گزارنے میں مصروف تھا، جن کی اموات اُس کی پیدائش سے پہلے ہوئیں تھیں۔ بھرپور احساسات نے اس کی زندگی کو ماضی کا حصہ دے دیا تھا۔ وہ اپنے آپ میں ہوتے ہوئے، اتنے روپ بدل رہا تھا، کہ اس کا اصل روپ خود اس کی گرفت سے باہر تھا۔ قدیم عمارتوں کے اندر جسمانی طور پر داخل ہوتے ہی بے جسمانی گردش اپنی رفتار تیز کرتی اور ان گنت رشتے، انداز سے اپنا شریک ٹھہرانے لگتے۔ وہ کمزور حال میں موجود ماضی کے اندر دوڑتا چلا جاتا، مگر ماضی سے واپس آتے ہی بدلا ہوا حال اس کے سامنے ہوتا۔

پھر اس کو اپنے جسمانی خد و خال بھی کسی بوسیدہ عمارت کی طرح لگنے لگے۔ جس سے کئی لوگوں کی وابستگی رہی، کئی کئی سال سے لوگ اس کا حصہ رہے تھے۔ اکثر لوگ اس کی جسمانی عمارت کو چھوڑ کر جا چکے ان سے وابستہ احساسات اور جذبات اس کے اندر مچلتے رہتے ہیں۔ اس کی جسمانی عمارت نہایت کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے۔ جو عمر کے ساتھ ساتھ اپنے ملبے کو اکھڑتا اور ڈھلتا محسوس کرتی ہے، اور پھر اس کی جسمانی اور بے جسمانی عمارت چلتے چلتے لڑکھڑانا بھی شروع ہو گئی۔ یا داشت اس کے گھیرے سے باہر ہو چکی۔ اس کی جسمانی ساخت بکھرتے بکھرتے اب کسی اختتام کی منتظر ہے۔ اس کی بے جسمانی زندگی از ہر کے بجائے تاریکی کی طرف گامزن ہے۔ لڑکھڑاتی جسمانی اور بے جسمانی عمارت اپنے ہونے کے احساس سے محروم ہوتی جا رہی ہے اور اب یہ اپنے گرنے پر ماضی کے کئی وجود کی موت کا سبب ہوگی۔

☆☆☆☆

نیاز محمود

پیوند

پوری دنیا گھومنے کی خواہش لیے میں ایک ایسے ملک میں پہنچ گیا جس کا نام غیر آباد تھا۔ یہ ایک انوکھا ملک تھا۔ یہاں کے لوگ بھی عجیب ہی طرح کے تھے۔ آپ سن کر حیران ہوں گے کہ اس ملک کے باشندے اپنی اصلی ناک سے محروم تھے کیوں کہ ان کے ناک کاٹ دیے گئے تھے۔ اور ان کی جگہ انھوں نے مصنوعی ناک لگا رکھے تھے۔ یہی نہیں ان کی ٹانگیں بھی لکڑی کی تھیں کیوں کہ ان کے پیر بھی کاٹ لیے گئے تھے۔ مزید حیرانی کی بات یہ کہ ہر پانچ سال سے زائد عمر کے بچے اور بچی کی زبان بھی کاٹ دی گئی تھی اور ان کی جگہ مصنوعی زبان نے لے لی تھی۔

میں جب بھی ان لوگوں کو دیکھتا ایک عجیب قسم کی کیفیت سے دوچار ہوتا۔ حیرانی کی بات تو تھی لیکن مجھے ان پر ترس بھی بہت آتا، ساتھ ہی ایک انجانا خوف بھی میرا پیچھا کر رہا تھا جس کی وجہ سے میں نے چپ چاپ یہ ملک چھوڑ دینے میں ہی عافیت جانی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس طرح تو تمام عمر اک خلش سی دل میں رہے گی۔ ناک کیوں کاٹی گئی؟ لکڑی کی ٹانگوں کی کیا کہانی ہے؟ بچوں کی زبانیں کاٹ کر یہ ظلم کیوں کیا جا رہا ہے؟ یہ وہ سوالات تھے جو متواتر مجھے پریشان کیے جا رہے تھے، میری تشنگی روز بڑھتی جا رہی تھی لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک اس راز کو نہ پا لوں، کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا کیوں کہ جب بھی میں اس بابت کسی سے کچھ پوچھتا، انتہائی کرخت لہجے میں مجھے زبان بند رکھنے کو کہا جاتا --- چپ --- نہیں تو --- گویا میں نے کوئی بہت ہی ناگوار بات چھیڑ دی ہو --- ان کا یہ رویہ مجھے حیرت کے عمیق سمندر میں دھکیل دیتا، --- میرا تجسس بڑھتا گیا یوں اک دن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ غیر آباد کے بجز خان نامی ایک نوجوان کے ساتھ میری دوستی ہو گئی۔ اس نے اپنے حجرے میں میری رہائش کا بندوبست کیا، کہا" جب تک تمہارا جی چاہے یہاں رہو، تمھیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ "

بجز خان نہایت نفیس انسان تھا لیکن افسوس کہ اس کے چہرے پر مصنوعی ناک بالکل نہیں جچ رہی تھی، جسمانی لحاظ سے وہ کافی مضبوط تھا لیکن اس کے پیر لکڑی کے تھے، اس کی زبان بھی بدلی ہوئی تھی جو کسی طور اس کی شخصیت کی آئینہ دار نہیں تھی۔ میری اس سے خوب بنتی تھی ہم تقریباً ہر موضوع پر بات کر لیتے تھے لیکن

جب بھی میں مصنوعی ناک اور قلمی زبانوں کی بات چھیڑتا تو فوراً ہاتھ رکھ کر میرا منہ بند کر دیتے۔ یوں میں بھی احتیاط برتنے لگتا لیکن پھر بھی مجھے بات کی تہہ تک پہنچنے کی جستجو تھی۔

سردیوں کی اک یخ بستہ رات جب ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ سب لوگ سو رہے تھے، نیند ہم سے ناراض ہو کے کوسوں دور چلی گئی تھی اور ہم کافی دیر سے اسے منانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حجرے میں ہم دو ہی تھے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ یہی اچھا موقع ہے، ہو سکتا ہے آج مجھے اپنے سوال کا جواب مل جائے۔ میں نے اپنا مقصد بیان کیا تو بیجڑ خان سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پہلے ارد گرد کا جائزہ لیا پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے اور خوب اطمینان کر کے، کہ باہر کوئی نہیں اندر آ کر بیٹھ گئے۔ چند ساعت کی خاموشی کے بعد اپنا منہ میرے کان کے قریب لے آئے اور سرگوشی کرتے ہوئے گویا ہوئے---

"قصہ یوں ہے" بیجڑ خان بولے

"کافی عرصہ پہلے ہمارے ملک پر غیروں نے قبضہ کیا ہوا تھا، اور ہمارے آبا و اجداد کو غلام بنا لیا تھا۔ انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں ایک قانون بنایا کہ غیر آباد کے کسی بھی باشندے کے ہاں جب بھی کوئی اولاد ہو خواہ وہ بیٹا ہو یا بیٹی اس کے پیر کاٹ دیے جائیں۔"

"اور ناک بھی------؟ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"ہمم------!" بولے--- "لیکن قانون یہ تھا کہ کوئی بھی لڑکا یا لڑکی سن بلوغت کو پہنچے تو اس کی ناک کاٹ دی جائے۔"

"لیکن کیوں-----؟؟؟" میں بیچ میں بول پڑا----

"وہ ایسا کیوں کرتے تھے---؟ میں نے سوال کیا۔

" کیوں انجان بن رہے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے ؟ بیجڑ خان نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ارے یار! کمال کرتے ہو تم بھی۔ اگر میں جانتا، تو پوچھتا کیوں؟؟"-----میں نے جواب دیا۔

"واقعی تمھیں نہیں پتہ---؟؟؟" اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بالکل!-----قسم اللہ پاک کی مجھے نہیں پتہ--" میں نے اسے یقین دلایا۔

"اچھا تو غور سے سنو۔" بیجڑ خان بولے۔

"سیدھی سی بات ہے وہ چاہتے تھے کہ اس ملک کے باشندے تا قیامت اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہو سکیں اور تمام عمر اپاہج رہیں۔"

"اچھا۔۔۔!!تو اسی مقصد کے لیے انھوں نے یہ قانون بنایا۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ناک کیوں کٹوائے جاتے تھے؟؟؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"ایسا ہے۔" بچڑ خان بولے۔

"اس سے ان کا مقصد یہی تھا کہ غیر آباد کا کوئی بھی نوجوان لڑکا یا لڑکی کبھی بھی ان کے سامنے سر اٹھا کر نہ چل سکے اور ہمیشہ کے لیے دبا دبا سا اور شرمندہ رہے۔"

یہ سنتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، کافی دیر ہم بت بنے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ بالآخر میں نے چپ کا روزہ کھولا اور بولا۔

"یار! اک اور بات بھی ہے۔۔۔؟"

"کون سی بات۔۔۔۔؟" اس نے پوچھا۔

"یہی۔۔۔۔۔۔" میں بولا۔ "کہ آپ لوگ ان ضابطوں اور قوانین کو آخر ختم کیوں نہیں کرتے؟؟" میں بولا۔۔

"وہ لوگ تو اب چلے گئے ہیں۔"

اس بات پہ بچڑ خان کا رنگ یک دم فق ہو گیا۔۔۔ جیسے اس میں خون ہی نہ ہو۔۔۔۔ کچھ دیر بعد جب اس کے چہرے پر خون کے آثار دکھائی دینے لگے تو بولے۔۔

"چپ کر یار چپ کر۔۔۔۔۔ نہیں تو دونوں مارے جائیں گے۔۔۔"

ڈر، خوف اور دہشت اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ وہ اب بھی کانپ رہا تھا۔

"تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو۔۔۔۔؟" میں نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں میرے اور آپ کے سوا ہے ہی کون؟؟ میں اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولا۔

بولے۔

"تم کیا جانو۔۔۔ یہاں ہر طرف ان کے جاسوس پھر رہے ہیں۔۔۔۔ یہ دیواریں۔۔۔ یہ پتھر، یہ درخت، یہ ہر طرف بکھری چیزیں، یہ سب ان کے جاسوس ہیں۔ یہ بتاتے ہیں انھیں۔۔۔ ہماری ہر حرکت، ہر ادا، ہر فعل کی خبر ہو جاتی ہے انھیں۔ ہم آج بھی ان کی گرفت میں ہیں۔۔۔۔ نہیں نہیں تم نہیں جان سکتے۔۔۔۔ تم جان ہی نہیں سکتے۔۔۔۔"

"ہاہا۔۔۔ اب کیا ڈرنا ان سے؟۔۔۔ چلے گئے ہیں وہ۔۔۔۔ یہی حقیقت ہے۔۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔ حقیقت کو پرکھو۔۔۔ نہیں ہیں وہ اب یہاں۔۔۔ جا چکے ہیں۔۔۔۔" میں نے اسے باور

کرانے کی کوشش کی۔

ہاں تو بھی ٹھیک کہتا ہے۔۔۔لیکن ایسا ہے نہیں۔۔۔۔اب بھی ان کے بندے پورے ملک میں موجود ہیں اور ہماری ہر حرکت، ہر فعل کی خبر رکھتے ہیں۔ طاقت ور ہیں وہ۔۔۔۔بچڑ خان نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"دیکھ یار!۔۔۔انھوں نے اتنی مضبوط، منظم اور مستحکم قانون سازی کی ہوئی ہے کہ کسی کی ہمت ہی نہیں ہو رہی اسے بدلنے یا ختم کرنے کی۔۔۔اب میں کیسے سمجھاؤں تمھیں۔۔۔؟؟؟

"اگر یہی آپ کی سوچ ہے۔۔۔تو آپ کی یہ سوچ غلط ہے۔۔۔۔میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔۔۔

"خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔۔۔۔کیوں اپنی جان کے دشمن بنتے ہو؟؟؟ اپنی فکر اگر نہیں تو میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کا ہی کچھ خیال کرو۔۔۔انتہائی غصے کے باوجود اس کی نظریں رحم کی بھیک مانگ رہی تھیں۔

اس کی بیچارگی دیکھتے ہوئے میری بھی ہمت جواب دے گئی اور چپ سادھ لی۔

ایسے ہی ایک رات جب آسمان گرج چمک کے ساتھ پانی برسا رہا تھا، سردی زوروں پر تھی۔ میں اور بچڑ خان پہلے کی طرح اکیلے ہی حجرے میں بیٹھے تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"بچڑ خان! یار باقی باتیں تو میری سمجھ میں آ گئی ہیں لیکن یہ زبان کاٹنے اور دوسری زبان کی پیوندکاری والی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی۔ کیا راز ہے اس میں۔۔۔۔؟؟؟

بچڑ خان نے خلافِ معمول مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے پتہ تھا تم ایک دن یہ سوال ضرور کرو گے۔۔۔۔۔"

"لیکن اگر میں اس راز سے پردہ نہ اٹھاؤں تو۔۔۔۔۔؟؟؟"

"تو۔۔۔۔۔تو میں انتہائی ناراض ہو جاؤں گا تم سے۔۔۔۔۔۔میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ایسی بات ہے؟؟؟ تو ٹھیک ہے کل سب بتا دوں گا۔۔۔اب سو جاؤ۔۔۔۔بچڑ خان نے مجھے مناتے ہوئے کہا۔"

لیکن ایک عجیب بات کہ بچڑ خان نے اس رات دیگیں پکوانے کا انتظام بھی کیا ہوا تھا، جس پر میں کافی حیران تھا، طرح طرح کے خیالات میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ مجھے لگا، شاید اپنے چھوٹے بیٹے کا ختنہ

کروا رہا ہے اسی لیے یہ سب انتظامات ہو رہے ہیں، لیکن اگر ایسا ہے تو اس نے مجھ سے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا۔۔۔ کیوں چھپایا مجھ سے؟؟؟؟

خیر۔۔۔۔ اگلی صبح، بجڑ خان نے دوستوں کی دعوت کی تھی۔ وہاں جو بھی مجھے دیکھتا، زیرِ لب مسکراتا۔۔۔ میں ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے، کیا ہو رہا ہے؟ میرا دماغ شل ہو گیا تھا۔ میرے دماغ کی شریانیں پھٹ رہی تھیں۔۔۔۔ بینڈ باجے والے بھی موجود تھے اور اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے لیکن مجھے ان سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میں اپنی سوچوں میں مگن حیرت کے عمیق سمندر میں غرق ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ آخر قرار نہ پا کر بجڑ خان سے پوچھ بیٹھا۔

"خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟۔ شادی ہے؟ ختنہ ہے یا ختم القرآن؟ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔۔۔۔ میری یہ الجھن دور کیوں نہیں کر دیتے؟؟؟؟ کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔۔۔؟؟؟؟؟"

"صبر کرو میرے دوست صبر۔۔۔۔ ابھی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھو گے نا، تو سمجھ جاؤ گے۔۔۔"

گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے مجھے تسلی دی۔

کچھ دیر بعد اپنے پانچ سال کے بچے کو کندھے پر بٹھائے وہ گھر سے نمودار ہوا۔۔ بچے نے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پیروں میں جوتے بھی نئے تھے۔ آنکھوں میں کاجل اور بالوں میں لگے تیل سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس کی ماں نے خاص اہتمام کے ساتھ اسے تیار کرایا ہے۔ بچے سے مسحور کن خوشبو بھی آ رہی تھی۔۔۔۔

بجڑ خان نے مجھے مطلع کرتے ہوئے کہا کہ آج اس کا بیٹا پورے پانچ سال کا ہو گیا ہے۔ اب یہ اس قابل ہو گیا ہے کہ اس کی زبان کاٹ دی جائے لہذا آج اس کی زبان کاٹنے کی رسم ادا کی جا رہی ہے۔۔۔۔

اچانک مجھے چکر آنے لگے۔۔۔ میں بے وزنی کی کیفیت اور خود کو خلاؤں میں گم ہوتا ہوا محسوس کرنے لگا۔۔۔ میں نے گرتے گرتے خود کو سنبھالا۔۔۔۔ میرا انگ انگ چلا اٹھا۔۔۔۔ میں بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن میری زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔۔۔ میں نے لب ہلانے کی کوشش کی تو بجڑ خان نے حسبِ عادت مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"خبردار۔۔۔۔ چپ چاپ میرے پیچھے آؤ۔۔۔۔"

:حقیقت یہی ہے کہ مجھ سے کچھ کہا بھی نہیں جا رہا تھا۔۔۔ میری زبان تو جیسے شل ہو گئی تھی۔۔"

وہ تیز تیز چل رہا تھا۔ شاید اسے دیر ہو رہی تھی۔ اسے جلدی پہنچنا تھا۔۔ ایک زندہ لاش کی مانند میں

اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔۔۔بجر خان خاموش تھا۔۔۔میں بھی خاموش تھا۔۔۔۔وہ بچہ۔۔۔جو دودھ کی طرح سفید اور پھولوں جیسا نازک اور معصوم تھا۔۔۔وہ بھی خاموش تھا۔۔۔پتہ نہیں کب اور کیسے بجر خان لال اینٹوں سے بنے ایک پختہ عمارت میں داخل ہوئے۔ قریب ہی کمرے میں ایک شخص کرسی پر بیٹھا تھا، وہ سیدھا اسی کے پاس چلا گیا۔ بجر خان نے انتہائی ادب سے سلام کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو اس شخص کے حوالے کیا اور اچانک میری طرف منہ کر کے مخاطب ہوئے۔

"مبارک ہو۔۔۔آؤ۔۔۔اب چلیں۔۔۔!"

لیکن۔۔۔لیکن۔۔۔یہ بچہ۔۔۔؟؟؟ گھبراہٹ اور حیرت کے ملے جلے جذبات میں میرے منہ سے بس یہی نکلا۔

"بچے کی فکر مت کرو اب۔۔۔آج دوپہر تک سب جان جاؤ گے۔"

واپسی کا راستہ ناپتے ہوئے بجر خان بولے۔

اب میں دوپہر کے انتظار میں تھا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ میں کس کرب سے گزر رہا تھا۔ یہ وقت کیسے گزرا یہ میں ہی جانتا ہوں۔۔۔دوپہر کو جب وہ معصوم صورت گھر پہنچا تو میں یہ دیکھ کے تلملا اٹھا کہ اس کی زبان کٹی ہوئی تھی اور اس کی جگہ اک مصنوعی زبان ٹانکنے کی کوشش کی گئی تھی۔۔۔میں اس پیوند کاری پر چلا اٹھا اور بجر خان کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے ظالم و سفاک انسان! خدا کے لیے بتاؤ کہ اس بچے کے ساتھ وہاں یہ ظلم کیوں ہوا؟؟؟ کیا راز ہے اس پاگل پن کے پیچھے۔۔۔؟؟؟"

ہاہاہا۔۔۔ہاہاہا۔۔۔ہاہاہا۔۔۔بجر خان قہقہے پہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔

"سرخ اینٹوں کی وہ عمارت سکول ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارے بچوں سے مادری زبان چھین کر پرائی زبان کی پیوند کاری کی جاتی ہے۔"

☆☆☆☆

وقار سپرا

قصہ حسرت

میں نے چالیس سال پہلے فتح گنج چھوڑا تو گمان میں بھی نہ تھا کہ واپس نہ آسکوں گا۔ فتح گنج لکھنؤ سے 20 میل باہر ایک دیہی قصبہ ہے اور یہی وہ جگہ تھی جہاں میں پیدا ہوا۔ میرا آبائی گھر اس وقت بھی نہایت خستہ تھا اور فتح گنج کی گوالمنڈی میں تھا۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ مجھے رام پرشاد نے بتایا کہ الحاج شیخ مسافر خانہ کے تمام کمرے کانگریسی ممبروں سے بھرے پڑے ہیں اور ابوالکلام آزاد ندھے والی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھ کر باغ میں ایک جلسہ سے خطاب کریں گے۔ میں نہا دھو کر 12 بجے ہی مسجد پہنچ گیا۔ مولانا نے چند منٹ اسلامی فقہ پر بات کی پھر جمعہ کی جماعت کروا کے دفتر میں خاصہ تناول فرمانے چلے گئے۔ دوپہر 4 بجے جانا نہ باغ عوام الناس سے بھر چکا تھا۔ لوگ مولانا کو دیکھنے کے لیے جمع تھے۔ جلسہ کی کارروائی کے بعد جب مَیں جا رہا تھا تو میرے ساتھ رام پرشاد تھا۔ میں نے رام پرشاد کو بتایا کہ میں آزاد ہو گیا ہوں۔ میں نے زندگی میں دو دفعہ مولانا کو براہ راست دیکھا اور دونوں دفعہ مصافحہ کی جرات نہ کر سکا تھا۔

لیکن تیسری بار جب وہ وزیرِ تعلیم بن چکے تھے اور روزانہ دہلی کناٹ پیلس کے قریب ایک گراونڈ میں چہل قدمی کرتے تھے۔ میں کئی دن سے مولانا کی تاک میں تھا۔ سارا سارا دن پُرانی دہلی اور مہرولی کے کھنڈرات میں آوارہ گردی کرتا اور رات کے وقت کسی کھنڈر میں سو رہتا، اُس دن ہمت کر کے اور بھاگ کے مَیں نے مولانا کو سامنے سے جا لیا تھا جب وہ قاضی کے حوض کی طرف پیدل ہی جا رہے تھے، اگرچہ دو گارڈ بھی ساتھ تھے لیکن کسی نے مجھ سے پُرسش نہیں کی اور میں مولانا کے برابر ہو کر ساتھ چلنے لگا۔ مولانا نے مجھے ایک نظر تعجب سے دیکھا، پھر آنکھ کے اشارے ہی سے بولنے کو کہا لیکن کوشش کے باوجود کچھ بھی نہ کہہ سکا تھا بس چلتا رہا۔ اتنے میں مولانا کی موٹر سامنے آ کر رُک گئی اور وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے اُس میں داخل ہو گئے مگر نہ جانے کیونکر جاتے ہوئے وزٹنگ کارڈ میرے ہاتھ میں تھما گئے، اُس دن کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا جس میں میرے دیکھنے کے لیے ایک ایسی دنیا سامنے تھی کہ اُس کا اندازہ پہلے کبھی نہ ہو سکا تھا۔ مجھے مولانا آزاد نے اپنے دفتر میں ہی دوسرے درجے کے کلرک میں رکھ لیا تھا۔ وزارت کے تمام اختیارات مولانا ہی کے پاس

تھے۔ لیکن عملی طور پر نہ صرف مولانا ہی بلکہ گورنمنٹ کے سبھی اختیارات سردار پٹیل ہی کے پاس تھے۔ جس کا احساس مولانا کو تو شاید پہلے ہی ہو چکا تھا مگر مجھے اُسی دن ہوا۔ میرا ڈیسک ریسپشن کے ساتھ ہی تھا جہاں سے عمارت کی مین انٹرنس شروع ہوتی تھی، صبح دس بجے تھے میں ایک منشی کے ساتھ بیٹھا معمول کی ٹائپنگ میں مصروف تھا کہ ایک دم دفتر میں جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ سپاہی اور دو چار پیادے ہشیار باش کی شکل میں آگے دوڑے آئے اور کہا، دیکھو بھائی سردار صاحب آ رہے ہیں، مولانا کو خبر کر دو۔ میں نے اٹھ کر پی اے کے کمرے میں جھانکا اور یہی جملہ دہرا دیا۔ پی اے نے جیسے ناک پکڑ لی ہو۔ خیر میں یہ کہہ کر واپس ہوا ہی تھا کہ سردار پٹیل کمرے میں داخل بھی ہو گئے۔ اتنے میں مولانا اپنی کرسی سے اُٹھ چکے تھے مگر سردار پٹیل مولانا سے سلام لے کر فوراً کرسی پر بیٹھ گئے جب کہ مولانا ابھی کھڑے ہی تھے۔ میرے لیے یہ لمحہ بالکل اچانک اور نیا تھا۔ مولانا کے چہرے کی ناگواری صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ وہ طوہاً خود بھی بیٹھ گئے اور کہا، جی کوئی خدمت، سردار پٹیل نے فوراً کہا مولانا خدمت تو ہم آپ کی کرنا چاہتے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے کریں۔ خیر مطلب پہ آتے ہیں، آپ کی عینک کے شیشے میرا خیال ہے اب دھندلا چکے ہیں۔ اور میں چاہتا ہوں آپ ہمارے ساتھ ہیں تو ہماری عینک استعمال کر لیا کریں، مولانا نے گھبرا کر کہا، سردار صاحب، عینک تو میری بالکل صاف ہے مگر آپ کو شاید احساس نہیں، تعصبات کے دائرے اِس بے ضرر تعلیم کے محکمے میں کیوں پھیلانا چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں مولانا، آپ کو انکار کرنا میرے بس میں نہیں تھا، سمجھا درخواست کر لوں کہ فی الحال آپ کے محکمے میں اتنے فنڈ دینے کی گنجائش اِس لیے نہیں کہ ابھی کشمیر اور حیدر آباد کی لشکر کشی روکنا ہے جو آپ کے بھائی بندوں نے کراچی سے کر رکھی ہے۔ مولانا آزاد کو سردار پٹیل کا یہ جملہ سن کر ایک دھچکا سا لگا اور وہ پٹیل کا منہ دیکھنے لگے۔ دراصل مہاتما کے قتل کے بعد حالات اِس قدر تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی کو احساس تک نہ ہو سکا اور یہ حالات نہیں بدل رہے تھے لوگوں کی فطرت بدل رہی تھی۔ ایسی جرات اور دیدہ دلیری واقعی مہاتما بھی نہیں کر سکتا تھا مگر مولانا کو یہ احساس اُسی وقت ہو گیا تھا جب ایک دفعہ کابینہ کی میٹنگ میں ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ نہرو پٹیل کے سامنے جوابدہ ہے اور آج یہی بے بسی مولانا کے لیے مقدر محسوس ہو رہی تھی مگر مولانا شاید اِس وقت مسلم لیگ سے اتنے فاصلے پر تھے، جتنے فاصلے پر دلی کراچی سے۔ میں وہاں کچھ دیر کھڑا پٹیل کی بات سُنتا رہا جس میں سردار مولانا کو آخری حد تک احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ دراصل ایک مسلمان پہلے ہے اور کانگریسی بعد میں۔ یہ وہ پہلی ڈور تھی جو مولانا کے ہاتھ سے چھوٹنے لگی تھی۔ پھر دو چار سال میں ہی میرے دیکھتے دیکھتے مولانا تائی جی کے ہم پایہ ہو گئے تھے اور اب پتا نہیں۔ یہ تائی جی کون ہے؟

میں نے موڑ پر کھڑے ہوئے تانگوں اور رکشا کھینچنے والے لوگوں پر نظر ڈالی۔ مریل رکشہ کھینچنے

والے بنگالی پہلے صرف کلکتہ، مرشد آباد، چٹاگانگ اور ڈھاکہ میں تھے۔ اب خیر سے لکھنؤ کے مضافاتی شہروں تک بھی پھیل چکے تھے۔ چالیس برس قبل مجھے اکثر تانگے والے پہچانتے تھے لیکن اب کوئی میرا شناسا نہ تھا۔ قصبہ کی طرف جانے والے راستہ پر گزشتہ سے کچھ کم ویرانی تھی۔ نواب صاحب بلم پور کا باغ، جسے میں ہرا بھرا چھوڑ کر گیا تھا، اب اُجڑ چکا تھا۔ نواب کی حویلی تو سنبھال سرکار میں تھی لیکن ان کا یہ وسیع باغ فتح گنج میں تھا۔ اس لیے نواب صاحب کو باغ کی دیکھ بھال اور دیگر امور میں کوئی پریشانی نہ تھی مگر نواب صاحب کو اس وقت کی نوقیام شدہ حکومت میں وزارت کی پیشکش ہوئی تو وہ چلے گئے اور پیچھے سے باغ زرعی اصلاحات میں ضبط ہو گیا اور کچھ بنگالی پناہ گیروں کو الاٹ کر دیا گیا، جن کو نہ تو آم کھانے کا ذوق تھا اور آم اُگانے کا۔ اس باغ میں اب بنگالیوں کی جھونپڑیاں تھیں، ساتھ ہی کچھ چوہڑوں نے بھی جھونپڑیاں بنالی تھیں۔ یہ مقامی بے زمین چوہڑے مسلی تھے، جن کو صرف فصل کی فصل یا گھروں کی تعمیرات کی سخت مزدوری کا کام ملتا تھا۔ فتح گنج کی تین چوتھائی آبادی تقسیم سے پہلے بھی مسلمان تھی اور اب بھی اکثریتی آبادی مسلمانوں کی ہی تھی۔ اس قصبہ میں مولانا آزاد اور مولانا مدنی کی عقیدت مندی اور نیاز مندی بہت تھی۔ اس لیے زیادہ لوگوں نے ہجرت نہیں کی۔ میں بھی تقسیم کے دنوں میں محض اتفاق سے مغربی پاکستان چلا گیا تھا، پھر اُدھر ہی پھنستا چلا گیا۔

فتح گنج کا قدیم محرابی باب لکھنؤ جسے روہیلہ گردی کے بعد اس وقت کے نواب آف بلم پور ہی نے تعمیر کروایا تھا۔ ابھی تک مع تختی کے موجود تھا لیکن نہایت خستہ حال ہو چکا تھا۔ میں شہر میں داخل ہوا تو قصبہ میں کوئی بھی ایسا گھر نہ تھا جسے اپنا گھر کہہ سکوں لیکن میرے کچھ رشتہ دار یقینی طور پر اسی حویلی میں موجود تھے، جو میرے پردادا کی ملکیت تھی، جس میں آنکھ کھولی تھی۔ حویلی میرے ہوش سنبھالنے کے وقت سے ہی دادا کے بھائیوں اور اس کے باپ کے بھائیوں میں تقسیم تھی اور خاصی گنجان آباد تھی۔ اُس کے مختلف کمرے ہی گھر تھے اور درمیان میں راستہ تھا۔ اسی طرح یہ حویلی ایک طرح کی گلی بھی تھی اور محلّہ بھی لیکن اس گلی یا محلّہ کو ہی مَیں گھر کہتا تھا۔

میں حویلی کے سامنے پہنچا تو مرکزی دروازہ کھلا تھا لیکن اس کا رنگ گردوغبار کی تہہ در تہہ چڑھنے کی وجہ سے سیاہ مائل ہو چکا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی سیڑھیاں تھیں۔ اس کے طاق میں پتہ نہیں کب کا بجھا ہوا چراغ پڑا تھا اور اترتے چڑھتے ہووں کے ہاتھوں سے درودیوار بھی دب سے گئے تھے۔

میرے اوائل سالوں میں، جب زمیندار دادا زندہ تھا تو جمعہ کے دن حویلی کے باہر فقرا اسی دروازے اور سیڑھیوں کے نیچے کھڑے ہو کر صدا لگاتے تھے اور دادا کے بلانے پر صرف ایک فقیر ہی اوپر جاتا تھا۔ یہ تماشہ ہر جمعہ نماز کے بعد عصر تک چلتا اور جتنے فقرا ہوتے ہتو تماشا دیکھنے کے لیے فقرا سے زیادہ قصبہ کے

بانکے جمع ہوتے تھے۔ مجھے اس وقت یہ محسوس ہوا کہ دادا کو ساری زندگی سماجی رتبہ کی تلاش رہی، جو اُن کو نہ مل سکا۔ وہ معمولی سے کاشتکار ہی رہے۔ یہ واحد طریقہ تھا اُن کے کچلے ہوئے نفس اور انا کی تسکین کا۔

دادا جی کے علاوہ حویلی کی دوسری معروف ہستی تائی اماں تھی۔ وہ سب سے بڑے بیٹے کی بیگم تھی جو گھر کے واحد کمانے والے بھی تھے۔ حویلی کے گھریلو منظر پر چھائی ہوئی تھی۔ بڑی تائی کو سب بہو بیگم یا بہو بی بی ہی کہتے۔ اسی پس منظر میں مَیں نے اپنا بچپن اور نوجوانی گزاری۔ اس سیڑھی کے ہر قدم پر یادوں کی بارات تھی۔ در و دیوار کو دیکھ کر لگتا تھا کہ کسی نے بھی عشروں سے ان کی مرمت کی طرف توجہ نہیں کی۔ مَیں نے جب آخری سیڑھی پر قدم رکھا اور اوپر والی منزل کے برآمدہ میں جھانکا تو سہ پہر کی دھوپ کا وقت تھا۔ جیسے ہر جاتی ہوئی شے میں ایک اداسی ہوتی ہے۔

تائی بیگم حسب سابق عشروں بعد بھی اِسی پیڑھی پر بیٹھی دال صاف کر رہی تھی، جس پر گزرے وقت میں بیٹھا کرتی اور پورے کنبے پر حکم چلاتی تھی لیکن اب عمر گزر گئی اور وہ بہت بوڑھی نظر آ رہی تھی۔ دال صاف کرنے کا مصرف وقت گزارنے کا بہانہ تھا۔ وہ نہایت توجہ سے دال میں سے کنکر ڈھونڈ رہی تھی اور ان کی شاہی میں بھی صرف وہی عمر رسیدہ افرادِ خانہ اور بچے بچ گئے تھے۔ جن کو مدراس اور حیدرآباد اور ممبئی میں کسی بھی شعبہ میں کوئی کھپت نہ ہوئی تھی۔ عجب سکوت تھا۔ پتہ نہیں کتنے ہی لمحے یوں گزر گئے۔

میرے سینے میں اس منظر کا سکوت اور اداسی اُتر رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے آگے جھک کر ایک جھٹکا سا لیا اور سیدھا تائی بیگم کے پاس گیا: تائی جی سلام۔

تائی بی بی اجنبیت سے بولی ”ہائے“ یہ تو ذاکر کی آواز معلوم پڑے ہے پھر پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے ہی چشمہ درست کیا اور میری جانب دیکھتے ہوئے کہا ”ہائے یہ تو ذاکر ہی ہے۔“

پیڑھی پر سے آواز دی ’اے کمالے! اے کمالے‘ ”میں صدقے، دیکھ تو سہی، ہمارے ازلوں کا گم ہوا بچہ حویلی واپس آ گیا۔ ہائے کیسے کیسے معجزے ہوتے ہیں۔ اس دوران اندر سے 50 برس کے بیٹے کا کمال حسین نکلا اور اس نے مجھے دیکھ کر چپ چاپ ہی گلے سے لگا لیا۔ اُسی لمحے دونوں کی آنکھیں تر ہو گئیں۔

☆☆☆☆

محمد عارف

کیہ جاناں میں کون؟

''میں کون ہوں؟''

''پتا نہیں کون ہوں!''

''وہی ہوں جو کچھ دیر پہلے تھا؟''

''نہیں تو، تم وہ نہیں ہو جو کچھ دیر پہلے تھے۔''(یہ آواز کہیں میرے اندر سے آئی)

تو پھر کون ہوں! میں اپنے آپ کو نہیں پہچان پا رہا تھا---میں! بدلا بدلا، انوکھا انوکھا سا!

زندگی میں ہر انسان کی طرح میں نے بھی کئی بہروپ بھرے لیکن یہ عجب بہروپ تھا، اتنا عجب کہ میں یہ بہروپ بھرنے کے بعد اپنی اصل کھو چکا تھا یا شاید میری اصل ہے ہی یہی---

''نہ میں بھیت مذہب دا پایا
نہ میں آدم، حوا جایا
نہ میں اپنا نام دھرایا
نہ میں بیٹھن، نہ وچ بھون
بلھا کیہ جاناں میں کون''

میں پہلے تو ایسا نہیں تھا، اسی دنیا کا باشندہ تھا لیکن اب یہ دنیا مجھے بیگانی سی لگ رہی ہے، ابھی کچھ دیر پہلے میں نے نماز پڑھی ہے، نمازِ عصر---بالکل عام لوگوں کی طرح---نماز پڑھ کر میں نے دو سفید براق چادریں کیا اوڑھیں، سب بندھنوں سے آزاد ہو کر ایک بندھن میں بندھ گیا:

''نہ میں عربی نہ لاہوری
نہ میں ہندی شہر نگوری
نہ ہندو نہ ترک پشوری
نہ میں رہندا وچ ندون''

لیکن مسئلہ ابھی غور طلب تو یہ ہے---کیہ جاناں میں کون؟

اب جو غور کرتا ہوں تو ایک برس پیچھے چلا جاتا ہوں۔۔۔۔ ہمارے ادارے میں عمرہ سکیم کی قرعہ اندازی تھی، ڈیپارٹمنٹ سے بہت سے لوگ دعائیں کرتے، خوش خوش گئے اور منہ لٹکائے واپس آ گئے کہ ”ان کا بلاوا نہیں آیا“ اب کافی دیر سے یہی موضوع زیرِ بحث تھا اور کئی دن تک رہے گا کہ ہم سرکاری ادارے کے ملازم ہیں۔ پہلے ان خوش نصیبوں کو مبارک دی جائے گی جن کا بلاوا آیا، پھر انھیں الوداع کیا جائے گا، واپسی پر پھر مبارک سلامت کا سلسلہ چل نکلے گا، یوں کئی دن تک دفتر کا بیشتر وقت اسی کارِ خیر کی نذر ہو جائے گا اور کسی کو وقت کے زیاں کا احساس تک نہیں ہو گا۔ اس بحث میں سب بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔۔۔۔

”میں نے تو کبھی اپنا نام قرعہ اندازی کے لیے نہیں بھجوایا!“

”کیوں؟“

”مجھے اچھا نہیں لگتا، شرم آتی ہے!“

”کس سے شرم آتی ہے؟“

”اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے!“

”میں کچھ سمجھا نہیں؟“ (سوال کرنے والے کے لہجے میں حیرانی تھی)

وہ اس لیے میرے بھائی کہ میں نے گاڑی لینی تھی تو بینک سے قرض لیا، مکان بنانے کے لیے دوست احباب اور بہن بھائیوں سے ادھار پکڑا، گھر میں اچھا بھلا ٹی وی تھا، بیگم اور بچوں نے ایل۔ ای۔ ڈی کی فرمائش کی تو میں اسی دن قسطوں پر لے آیا، اسی طرح کئی چھوٹے بڑے کام میں نے کمیٹی ڈال کر مکمل کیے اور جب باری آئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تو میں ایک لاٹری ڈال کر سرخرو ہو جاؤں، ناں بابا ناں، میں محمد عاصم اعوان یہ فراڈ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ نہیں کر سکتا، میں یہ کام ایسے ہی کروں گا جیسے میں نے اپنے دیگر کام نبٹائے، محفل پہ سکوت چھا گیا اور بھیڑ آہستہ آہستہ چھٹنے لگی۔

میں اس محفل کا حصہ تو نہ تھا لیکن دور کھڑا یہ سب سنتا اور سر دھنتا تھا۔ میں نے بھی ایسی ہی نیت کی، ایک سال کا ٹارگٹ رکھا، میرے ساتھ عمران صفدر نے بھی لبیک کہا اور ہم ”لبیک اللھم لبیک“ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ وہ بہار کے دن تھے، یہ بھی بہار کے دن ہیں جب ہم نے سفر آغاز کیا، اتنی جلدی سب کچھ کیسے ممکن ہوا، کچھ پتا نہیں کہ ان دو بہاروں کے درمیان کوئی اور بہار بھی نہ آئی اور ہم سوئے سفر تھے۔۔۔

آج صبح سے گھر کی فضا بدلی بدلی تھی، ایک ہل چل سی تھی، میں اپنے کمرے میں پچھلے کئی مہینوں سے فرش پر ڈھیر کی گئی کتابیں الماری میں ترتیب دے رہا تھا جب کہ میرا سامانِ سفر بھائی محمد فاضل ترتیب دے رہے تھے۔ دن دو بجے کے قریب تمام کام مکمل ہوئے، کچھ دیر بعد عمران اور مسز عمران یعنی ہماری بھابھی

شائستہ بی بی جو اسکول ٹیچر بھی ہیں اور جنھیں استانی کہتے ہوئے ہم زیادہ سہولت اور اپنائیت محسوس کرتے ہیں، مع سازوسامان تشریف لے آئے، میں اور اماں اپنا زادِ راہ لیے ان کے ہمراہ ہو گئے۔

عمران سے میرا تعارف ایک کتاب کی معرفت ہوا، بے شک کتاب کے رشتے مضبوط اور دیرپا ہوتے ہیں اور اب تو یہ رشتہ دیرینہ بھی ہو چکا ہے، دفتر کے بعد بھی ہم دونوں کا کچھ وقت ایک ساتھ گزرتا ہے۔ اگر کبھی شام کو گھر پہ چکر لگ جائے تو استانی کے ہاتھ کی چائے بھی میسر آ جاتی ہے اور صوبیہ اور نور (صاحبزادیاں) سے نوک جھونک بھی۔ پہلے کھانا بھی مل جاتا تھا اور حلوہ، پکوڑے بھی۔ بے نمک مرچ کے کھانوں، پکوڑوں اور بے چینی حلوہ پر نکتہ چینی اور تبصرے، عمران نمک مرچ لگا کر استانی کے گوش گزار کرتا اور آخر پتھر میں دراڑ پڑ گئی، اب چائے ملتی ہے اور بسکٹ ملتے ہیں۔۔۔

آج چین کے صدر پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔ حسبِ دستور شاہراہِ دستور کے ساتھ ساتھ شاہراہِ غیر دستور بھی بند تھی، ٹیکسلا سے ترنول تک سڑک کی ایک رو بند کر کے دونوں اطراف کی ٹریفک ایک سڑک پر ڈال دی گئی تھی، ہماری توقع کے برعکس ٹریفک ہلکی ہلکی ہی سہی لیکن رواں دواں تھی۔ ہم فلائٹ کے وقت سے تین گھنٹے قبل ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ اُترتے ہی پیٹ میں کچھ گڑگڑاہٹ ہوئی تو باتھ روم کی راہ لی، باتھ روم کی حالت غیر تھی، خیر جانا پڑا کہ اگر نہ جاتے تو ہماری حالت غیر ہو جاتی۔ باتھ کے فرش پر پانی کھڑا تھا جس پر ایک بے پیندے کا لوٹا سرنگوں تھا، حالاں کہ بے پیندے کے لوٹے کا یہ مقام ہرگز نہیں ہے۔۔۔ لوٹے کو ٹوٹی کے نیچے حالتِ توازن میں رکھنے کی کوشش شروع ہوئی، لیکن لوٹا ہر بار ایک ٹُن شرابی کی طرح لڑکھڑا جاتا۔ اب ایک ہاتھ سے لوٹے کو پکڑ کے ٹوٹی کے نیچے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ٹوٹی کھولی تو ٹوٹی کھل کر ہاتھ میں آ گئی، پانی کا ایک فوارہ آیا اور سامنے کی دیوار سے ٹکرا کر باتھ روم سمیت ہمیں بھی پانی پانی کر گیا۔ ایک تو میں خود انتہائی نازک حالت میں بیٹھا تھا اس پر ''ایک ہاتھ میں ٹوٹی تھی ایک ہاتھ میں تھا لوٹا'' چند ثانیے تو کچھ سمجھ ہی نہ آیا کہ ہو کیا رہا ہے، پھر کچھ حواس بحال ہوئے تو مزید سوچ بچار کو ترک کر کے ٹوٹی کو اپنی جگہ پہ گھسیڑ کر پانی کو روکنے کی کوشش کی، دوسرا ہاتھ بدستور لوٹا تھامے ہوئے تھا، پہلا ہاتھ ہٹایا تو ٹوٹی پھر نکل آئی، اب لوٹے کو چھوڑ ٹوٹی کے درپے ہوئے اور اسے بہلا پھسلا کے اپنی جگہ پہ رکھنے کی کوشش کی، لوٹے میں موجود چلو بھر پانی سے گزارا کیا اور ڈرتے ڈرتے لیکن کسی قدر تیزی سے اُٹھے اور اس سے پہلے کہ ٹوٹی باہر نکلتی ہم باہر نکل آئے۔

بھائی جان اللہ دتہ، بھائی حافظ سہیل اقبال، مجید صاحب اور مسز مجید نے ہمیں الوداع کہا، ہم ٹرالی دھکیلتے ائیر پورٹ داخل ہوئے اور یہ لوگ ہاتھ ہلاتے باہر چل دیے۔ سامان ''کارگو'' ہوا اور ہم ہینڈ کیری لیے ''امیگریشن ڈیسک'' پر لگی قطار میں لگ گئے۔ میں، اماں اور عمران تو کلیئر ہو گئے لیکن استانی کو روک لیا گیا،

آپ فلائی نہیں کرسکتیں، آپ کے پاس محکمے کا ''این۔او۔سی'' نہیں ہے۔ ہم نے باجماعت فریاد کرنے کی کوشش کی تو وہ کندھے اچکا کر بے زاری کا اظہار کر کے اگلے مسافر کی طرف متوجہ ہوگیا، ہم نے دوبارہ عرض گزاری تو اُس نے ''امیگریشن آفیسر'' کی طرف اشارہ کردیا، بحث کا وقت نہیں تھا، میں اور اماں ایک طرف ہو گئے، عمران اور استانی مرے مرے قدموں سے چلتے ''امیگریشن آفیسر'' کے روبرو ہو گئے۔ اس نے مُسکراتے ہوئے پوچھا: ''آپ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سے ہیں؟''

''جی ہاں!''

''آپ کے پاس 'ایکس پاکستان لیو' کی کاپی ہے؟''

''جی ہے''، پیش کی تو اس بندۂ خدا نے اس پر ''نوٹ'' لکھ کر پروانہ دے دیا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ پاکستان میں اس قدر اہم سرکاری عہدوں پر ایسے مددگار انسان بھی موجود ہیں، بے شک موجود ہیں۔

سامان اور جامہ تلاشی مل کہ پاجامہ تلاشی کے بعد اگلا ٹھکانہ لاؤنج تھا لیکن لاؤنج اور ہمارے درمیان متحرک اور عام سیڑھیاں حائل تھیں۔ اماں کو ایک ڈیمو دینے کے بعد ''متحرک برقی زینوں'' پر چڑھے تو اماں گرتے گرتے بچیں، ایک تو جوڑوں کے درد کے باعث ان کی آزادانہ حرکت کم ہے دوسرا عمر اور بینائی کا مسئلہ اور تیسرا ان زینوں پر ان کا پہلا تجربہ ناکام ترین اور آخری ثابت ہوا، آئندہ اماں کے ساتھ ساتھ میں نے بھی اس سے توبہ کرلی۔

لاؤنج پہنچے تو ابھی فلائٹ میں دو گھنٹے باقی تھے، چائے کی طلب ہوئی، ''ٹک شاپ'' پر آرڈر کیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک جواں سال بوڑھا ویٹر (جو دُور سے جوان اور قریب آنے پر بوڑھا لگا) چائے سرو کرنے آیا، چائے میز پر رکھ کر ہماری سمت بغور دیکھتے اور ٹرے میں پڑے پیکٹ الگ الگ کرتے ہوئے بولا، یہ دودھ ہے اور چینی اس میں ہے۔ شاید اسے بھی پتا چل گیا تھا کہ پینڈو ہیں اور پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ چائے کا بل آیا تو عمران بلبلا اُٹھا ''یار انھیں بتاؤ کہ بسکٹ ہمارے اپنے تھے۔''

وضو کے لیے اُٹھے، وضو کیا، بیگ سے احرام نکالا تو ''قینچی چپل'' ندارد، یاد آیا وہ تو بڑے بیگ میں تھے اور بڑا بیگ کارگو ہو چکا تھا، سخت پریشانی ہوئی کہ احرام کے بعد مخصوص پاپوش ہی پہنے جاسکتے ہیں، اب تین صورتیں ہیں: چپل تلاش کیے جائیں، پیدل جایا جائے یا یہی شوز پہن کر ''دم''* دیا جائے۔ لاؤنج میں ایک گفٹ شاپ سے ڈرتے ڈرتے چپل پوچھے تو اس کا جواب اثبات میں پاکر حیرانی ہوئی، مل کہ یوں لگا کہ جیسے

---

* وہ قربانی جو احرام کی پابندیوں سے صرفِ نظر ہونے پر کی جاتی ہے ''دم'' کہلاتی ہے۔

یہ مذاق کر رہا ہو، خیر اس کا ہمارا مذاق تو تھا نہیں، وہ نیچے جھکا اور ”ریک“ میں سامان الٹ پلٹ کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد وہ اوپر اٹھا تو اس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک بیگ تھا جس میں مختلف سائز کے قینچی چپل تھے، جنھیں دیکھ کر دل خوش ہوگیا، جی کڑا کر کے قیمت دریافت کی۔

”۷۵۰ روپے!“

”ہیں!“

ایک منٹ، میں ریٹ لسٹ دیکھ کر کنفرم کرتا ہوں، وہ صاحب پھر ریک میں غوطہ زن ہو گئے، ایک لسٹ کے ہمراہ باہر نکلے تو مسکرا کر بولے ”سوری! ۱۵۰ روپے!“

ہم نے ان کا چہرہ بہ غور دیکھا لیکن چہرے مہرے اور لہجے سے کسی صورت کابلی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ہم چپل پہنے، شوز ہاتھ میں لیے خوش خوش جانبِ مسجد ہوئے۔ بے نظیر انٹرنیشنل ائیرپورٹ، اسلام آباد میں لاؤنج کی ایک چھوٹی سی مسجد، جس کا ایک حصہ عورتوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا، اس کے دوسرے حصے میں اکثریت سفید براق، کھڑکھڑاتے لٹھے یا ڈھیلے ڈھالے نرم نرم تولیے کے احرام میں ملبوس اور بعض ملبوس ہوتے حاجی صاحبان تھے۔ بیش تر نے پہلی بار یہ لباس زیبِ تن کیا تھا، جو پہلے تو لباس بننے کو تیار نہیں تھا اور اب جو لباس ہوا تو ہر لحظہ کھل جانے کا خوف دامن گیر تھا۔ کیسا لباس تھا؟ سلائی نہ کڑھائی، کالر نہ بین، جیب نہ دامن و گریبان، ازار بند نہ بنیان، پھر بھی ایسا لباس پہلے کب پہنا، اب پہنا اور شاید تب پہنیں ”جب لاد چلے گا بنجارا“، کسی نے کہا تھا نچلی چادر زیبِ تن کرتے ہوئے ٹانگیں پھیلا کر رکھیے گا، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ چادر جمانے کے بعد میں با آسانی حرکت کرتا تھا، جب کہ عمران چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا کہ اس کی چادر میں گنجائش ہی اتنی تھی۔ دوسری چادر کی بکل ماری اور ”منہ ول کعبے شریف“ کہہ کر احرام کی دو رکعت نماز کی نیت کر لی، ابھی ہاتھ باندھے ہی تھے کہ کسی نے اوپری چادر کھینچ کر میرا سر ڈھانپ دیا، تب یاد آیا کہ یہ دو رکعت نفل سر ڈھانپ کر پڑھنے تھے اور سلام پھیرنے کے بعد سر ننگا کر کے عمرہ کے آخری رکن یعنی ”حلق“ تک ننگے سر ہی رہنا تھا، اس نماز کا اپنا مزا اور احساس تھا، عجیب سی لذت تھی۔ حیرانی تھی کہ مجھ جیسا گناہ گار اس سفر پر ہے، پشیمانی تھی کہ میں نے ساری زندگی غفلت میں گزاری لیکن اُس ذات نے مجھے یاد رکھا جس کے گھر کی جانب میں منہ کیے کھڑا ہوں۔ احرام میں آنے سے قبل متعدد حصے ایک ہی جسم کے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے لاتعلق تھے، لیکن اب اس لباس میں ایک دوسرے سے مَس ہوتے ہیں تو عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ سارا جسم کتنا پرسکون ہے، یہ اس لباس کی کرامت ہے یا سفر کی؟ ویسے فطرت کے قریب لباس تو یہی ہے، سلام پھیر کر سر ننگا کیا، عمرہ کی نیت کی اور تلبیہ پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے، آنکھوں سے رم جھم شروع

ہوئی، ندامت اور پشیمانی کے اس پانی سے من کی میل دھلنے لگی، کچھ یاد نہیں کیا کیا مانگا لیکن اتنا یاد ہے کہ دعا کا اختتام ان اشعار پر ہوا:

غریبم یا رسولؐ اللہ غریبم
ندارم در جہاں جز تو حبیبم

ترجمہ: یا رسول ﷺ میں انتہائی غریب ہوں، اس دنیا میں میرا آپ کے سوا کوئی حبیب نہیں۔

مرض دارم زعصیاں لادوائے
مگر الطاف تو باشد طبیبم

ترجمہ: میں گناہوں کے ایسے مرض میں مبتلا ہوں جس کا کوئی علاج نہیں مگر آپ کی مہربانیاں میری طبیب ہیں۔

بریں نازم کہ ہستم امتِ تو
گنہگارم ولیکن خوش نصیبم

ترجمہ: بے شک میں گناہ گار ہوں، لیکن آپؐ کا امتی ہونے کے باعث خوش نصیب ہوں۔

میں جو سر جھکائے نہ جانے کتنے قرنوں سے سوچ رہا تھا "کیہ جاناں میں کون؟"

"بریں نازم کہ ہستم امتِ تو" کا ورد کرتے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر اقبال آفاقی

کروچے: جمالیات کی تخلیقی فعلیت

فلسفی، نقاد اور مؤرخ بینے ڈیٹو کروچے اٹلی کے علاقے ابروزو کے قصبے پیس کیسرولی میں 25 فروری 1866 کو پیدا ہوا۔ اس کی تاریخ وفات 20 نومبر 1952 ہے۔ اس کا تعلق متمول اور بارسوخ خاندان سے تھا۔ والدین کیتھولک مذہب پر عمل پیرا تھے۔ کروچے نے کٹر مذہبی ماحول میں زندگی کا آغاز کیا۔ ابتدائی تعلیم نیپلز کے کیتھولک سکول سے حاصل کی۔ سولہ سال کی عمر میں وہ کیتھولک مذہب سے بیزار ہو کر لاادریت اختیار کر چکا تھا۔ اس نے روحانی زندگی کا ایک اپنا تصور تشکیل دیا جس میں مذہب کی تاریخی ورثے کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں تھی۔ 1883 میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ نیپلز کے قریب ایک جزیرے میں تعطیلات منانے کے لیے گیا ہوا تھا کہ وہاں شدید زلزلہ آیا جس میں اس کے تمام افرادِ خانہ ہلاک ہو گئے۔ وہ خود بھی کئی گھنٹے تک ملبے کے نیچے دبا رہا۔ سخت چوٹیں آئیں لیکن قضا و قدر نے اسے بچا لیا۔ زلزلے کے بعد خاندان کی وراثت اسے منتقل ہوئی جس کے نتیجے میں اس نے شوپنہار کی طرح بقیہ زندگی عشرت میں بسر کی۔ اس کی زندگی اب فلسفے کے لیے وقف ہو چکی تھی۔ نیپلز کے ایک عالی شان گھر (Palazzo) میں رہ کر ایک آزاد مفکر کی حیثیت سے اس نے علم و ادب کی خدمت کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ (1)

کروچے نے نیپلز یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ قانون کی تعلیم حاصل کی لیکن امتحان میں بیٹھنے سے اجتناب کیا۔ اسی دوران اسے تاریخی مادیت کا سیر حاصل مطالعہ کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ اس کے افکار کو 1890 کے اواخر میں پروفیسر انتونیو لابریولا نے نیپلز یونی ورسٹی میں پیش کیا۔ کروچے نے یورپ میں سوشلسٹ فلسفہ کے ارتقا میں گہری دل چسپی لی اور اس سے ہمدردی اور لگن کا اظہار کیا۔ اسے نیپلز نژاد فلسفی گیان باتستا کے آرٹ اور تاریخ کے بارے میں افکار نے بہت متاثر کیا جس کے نتیجے میں اس نے فلسفے کا عمیق مطالعہ شروع کیا۔ فلسفہ سے محبت کا یہ عالم تھا کہ اس نے وہ گھر بھی خرید لیا جس میں کبھی معروف فلسفی ویکو رہا کرتا تھا۔ فلسفی دوست گیووانی جینٹائل نے اس کو ہیگل کا فلسفہ پڑھنے کی طرف متوجہ کیا۔ کروچے نے 1907 میں ہیگل پر کتاب What is Living and What is dead in the Philosophy ? of Hegel کے نام سے شائع کی۔ اس سے پہلے 1903 میں ناقد (لاکریٹیکا) کے نام سے ادب و فلسفہ کی

ترویج کے لیے ایک رسالہ جاری کر چکا تھا جس نے اس کی عزت اور مقام کو بلند کرنے میں یہاں تک کردار ادا کیا کہ جب اٹلی میں فاشزم کی تحریک عروج پر تھی اور کروچے نے اس کے خلاف آواز اٹھائی تو فاشسٹ حکومت اس پر ہاتھ نہ ڈال سکی۔ (2)

مبصرین کے مطابق کروچے کا بیسویں صدی کے پہلے نصف میں خوب چرچا رہا۔ جمالیات اور ادبی تنقید میں بالخصوص اور فلسفہ میں بالعموم اس کے افکار کو خوب شہرت حاصل ہوئی لیکن بعد میں اس کا ستارہ تیزی سے غروب ہوتا چلا گیا۔ اگر ایک جانب یورپ میں ہائیڈیگر اور رد تشکیل والوں نے اسے مسترد کیا تو دوسری طرف انگلینڈ اور امریکہ کے علمی حلقوں میں اس کے افکار کو برٹرنڈ رسل، مور، اے۔ جے ایر اور دوسرے تجزیاتی فلسفیوں کی بے رخی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بے رخی کی انتہا یہ ہے کہ فادر کوپل سٹون جو کہ انگلستانی مفکرین کا ہم عصر ہے نے اپنی نو جلدوں پر مشتمل معروف کتاب 'تاریخ فلسفہ' میں کروچے پر باب لکھنا تو کجا اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

دراصل اس کے فلسفیانہ افکار انیسویں صدی کی تصوریت کا ہی تسلسل تھے جن میں مزید آگے چلنے کی سکت شاید نہیں تھی۔ یہاں حیرانی کی بات یہ ہے کہ آکسفورڈ کا فلسفی کولنگ ووڈ جو اسی کی طرح تصوریت پسند تھا، جس نے اپنی جمالیات کے بنیادی نکات کروچے سے اخذ کیے تھے آج بھی جمالیات میں اس کی اہمیت اسی طرح قائم ہے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ یورپ اور امریکہ کے فلسفہ و حکمت سے متعلق اکادمیاتی دانش وروں کی داخلی سیاست یا اس کے افکار کی کمزوریاں یا داخلی تضادات۔ ایک وجہ تو اس کی بے پناہ خود اعتمادی اور تیقن تھا جو دنیائے فلسفہ میں احسن نہیں سمجھا جاتا۔ کچھ بھی ہو کروچے کا مطالعہ حیرت انگیز تھا۔ اس کے الفاظ کی گہرائی میں جائیں تو اس سے کہیں زیادہ بصیرت موجود پاتے ہیں جس سے ہم پہلی نظر میں آشنا ہوتے ہیں۔ تاہم وہ اس قدر باوثوق انداز سے بات کرتا ہے کہ قاری یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے آخرِ کار صداقت ہے۔ کروچے کا طریق کار اور افکار کی شدت قاری کے اندر منفی ردِ عمل کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

بہر کیف کروچے نے اپنے افکار کو تین کتابوں جمالیات (1902)، منطق (1908) اور فلسفۂ عمل (1908) شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا۔ اس کا پورا کام اسی جلدوں پر مشتمل ہے۔ پندرہ روزہ ناقد (لا کریٹیکہ) جس کا وہ مدیر تھا، میں چالیس سال کے دوران شائع ہونے والی اس کی تحریریں اس کے علاوہ ہیں۔ کروچے فلسفیانی نقطۂ نظر سے وحدت الوجودی تھا لیکن مذہبی لحاظ سے لاادری اور متشکک تھا۔ فلسفے کو روح کی سائنس قرار دیتا تھا۔ اس کے نزدیک صرف فلسفہ ہی اصلی اور حقیقی سائنس ہے۔ روح کا فلسفہ اس کا بنیادی نظریہ ہے جس میں وہ ہیگل اور دوسرے جرمن تصوریت پسند مفکرین جن میں شیلنگ سرفہرست ہے سے

بہت زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ اس کے پسندیدہ عنوانات مطلق تصوریت اور مطلق تاریخیت ہیں۔ کروچے کانٹ کے بعد دوسرا فلسفی ہے جس نے عقلیت اور تجربیت (ماورائیت اور حسیت) کے مابین اختلافات وتضادات کو حل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے راستے کو تشبیہیت کا نام دیتا ہے اور انسان کے زندہ تجربے پر توجہ مرکوز کرتا ہے جو مخصوص جگہوں اور اوقات میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ چوں کہ حقیقت کی جڑیں تشبیہی وجود جو کہ کنکریٹ تجربے میں جنم لیتا ہے میں موجود ہیں اس لیے وہ جمالیات کو فلسفے کی بنیاد میں جگہ دیتا ہے۔

1912 میں رائس یونی ورسٹی کے افتتاح کے موقع پر اسے دعوت دی گئی کہ وہ افتتاحی اجلاس میں شرکت کرے اور جمالیات پر خطبہ پڑھے۔ اس نے اجلاس میں شرکت سے تو انکار کر دیا لیکن اس نے خطبہ لکھ بھیجا جس میں اس نے جمالیات پر اپنے کام (The Essence of Aesthetics) کو چار اسباق میں تقسیم کیا۔ اس مختصر مگر پیچیدہ تحریر میں اس نے اپنے نظریۂ آرٹ کو بیان کیا اور دعویٰ کیا کہ آرٹ سائنس اور مابعدالطبیعات سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ آرٹ ہمیں سربلند کرتی ہے۔ اس نے لکھا کہ جو کچھ بھی ہم جانتے ہیں اس کو منطقی اور تخیلی علم میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ آرٹ تخیل کے قلب سے جنم لیتا ہے اور خالص محاکات پر مبنی ہے۔ تمام فکر کا اس پر انحصار ہے۔ یہ تمام دوسرے افکار سے ماقبل ہے۔ آرٹسٹ کا یہ کام ہے کہ وہ مکمل تمثال تشکیل دے جس کا اس کے ناظرین نظارہ کر سکیں۔ یہی وہ چیز ہے جو بنیادی طور پر حسن اور خوبصورتی ہے اور جو ذہنی، داخلی تمثالوں کو آئیڈیل حالت میں ترتیب دیتی ہے۔ ہمارا وجدان ہی ان تمثالوں کی تشکیل کا سبب بنتا ہے۔

کروچے کی جمالیات میں نہایت اہم اور اصل کنٹری بیوشن اس کا یہ دعویٰ ہے کہ آرٹ اظہار کا دوسرا نام ہے۔ یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس دعوے کی اس کے فلسفیانہ نظام میں کیا حیثیت اور مقام ہے۔ اگرچہ یہاں ہم جمالیات کے موضوع پر مرتکز رہیں گے لیکن ذہن نشین رہے کہ اس کے فلسفیانہ نظام پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا اس کے تصورِ جمال وفن کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ اس کے نظام فکر کی تشکیل ابتدائی قسم کی تجربی اثباتیت جو کامٹے کے تصورات کی مرہون منت تھی اور مابعد ہیگلیائی خیالات کے ملاپ سے رونما ہوئی۔ ہیگل کے بارے میں اس کا رویہ رد وقبول کا تھا۔ وہ جہاں تجربی اثباتیت کی میکانیکت اور مادیت پسندی کو رد کرتا تھا وہاں وہ ہیگل کی ماورائیت (ranscendalism) کو بھی ناپسند کرتا تھا۔ اگر ایک طرف عقلیت حسی دنیا کو غیر حقیقی اور اس کے نتائج کو کنفیوزڈ اور دوسرے درجے کی حقیقت قرار دیتی ہے تو دوسری طرف تجربیت پسندی عقلی فلسفے کو قبل تجربی فلسفیوں کا ذہنی کھیل کہہ کر مسترد کر دیتی ہے۔ عقلیت پسند فلسفی آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر دنیا سے ماورا حقائق کو جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کروچے ان دونوں انتہاؤں کے درمیان

راستے کا متلاشی تھا۔ وہ راستہ جو عقلیت اور تجربی حسیت کے بین بین حقیقت کی نشاندہی کرنے میں مدد ہوتا۔

کانٹ کے زمانے سے ہی فلاسفہ وجدان یا استحضار کو تعقلات یا کلیات سے الگ کرتے آرہے ہیں۔ ایک لحاظ سے کروچے نے بھی اس روایت کا اتباع کیا ہے لیکن وہ اس روایت سے اختلاف بھی کرتا ہے کیوں کہ اس کے نزدیک وجدان اندھا نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے تعقل سے عاری قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی وجدانی پیش کش سامنے آتی ہے تو وہ مکمل طور پر شعوری انکشاف کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس کا ایک انفرادی کردار ہوتا ہے جو تعقلات سے پہلے کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ تعقلات سے پہلے کی یہ کیفیت زمان و مکان کے اندر نہیں ہوتی۔ یوں وہ کانٹ سے متضاد نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے جس کی وضاحت کے لیے وہ فرض کرتا ہے کہ ذہنی فعلیت کے طریقوں کو مختلف سطحوں پر مرتب کیا جا سکتا ہے۔ عقل وجدانی طریق کو پہلے سے فرض کرتی ہے کہ یہ جمال کی ایک صورت ہے لیکن وجدانی طریق عقل کو پہلے سے فرض نہیں کرتا۔ عقل محاکموں کا روپ اختیار کرتی ہے، اس لیے عمل اسے پہلے سے فرض کرتا ہے اور تجربی سطح پر اظہار کرتا ہے اور چیزوں کو تجربی اصولوں کے مطابق ڈھالتا ہے۔ اخلاقیات عملی علوم کی رہنمائی کرتی ہے کہ ان علوم کو کس مقصد کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ کروچے اس کو بنیادی بصیرت کا نام دیتا ہے۔ تمام ذہنی فعلیت (مراد کلی حقیقت) جمالیات پر استوار ہے جس کا اپنا کوئی مقصد یا منتہا نہیں۔ اس میں وجود یا حقیقت کا تعقل بعد میں شامل ہوتا ہے۔ یعنی وجدان جمع زندگی۔ اس محاکے کو کروچے ادراک کا نام دیتا ہے جو خود اس سے مستثنا ہوتا ہے۔

آرٹ اور جمالیات

جمالیات کے بارے میں اِن خیالات کو پیش نظر رکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کروچے بھی کانٹ کی عقلی جمالیات کے طریق کار کو اپنا رہا ہے اور اسی کی طرح وہ بھی آرٹ کو مقابلتاً محدود قرار دے رہا ہے لیکن وہ کانٹ کے برعکس راستہ اختیار کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کانٹ کی تھیوری اس مقام پر ناکامی کا شکار ہو جاتی ہے۔ کروچے کے نزدیک آرٹ ہر جگہ موجود ہے۔ عام قسم کے وجدان میں اور اُس وجدان میں بھی جو آرٹ میں استعمال ہوتا ہے فرق صرف کمیت کا ہے۔ یہ اصول کروچے کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ”ہمیں اپنی شناخت سے مضبوطی سے جڑے رہنا چاہیے کیوں کہ جن وجوہات نے جمالیات کو آرٹ کی اصل نوعیت کو ظاہر ہونے سے روکا ہے۔ وہ اس کا عام روحانی زندگی سے فاصلے پر رہنا ہے۔ اس کے ساتھ ایک خاص مقصد وابستہ کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے اشرافیہ سے مخصوص کر دینا ہے۔ پتھروں کی کوئی خاص کیمیائی تھیوری نہیں جو انھیں پہاڑوں سے ممیز کرتی ہو۔ نچلے درجے کے

> وجدان کی کوئی خاص سائنس نہیں جو اسے اعلیٰ وجدان کی سائنس سے مختلف کرے نہ ہی عام قسم کے وجدان کو فنکارانہ وجدان سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ ''(3)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر چیز کو ایک لحاظ سے آرٹ کا نمونہ قرار دے رہا ہے۔ کہنا وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر قسم کے وجدان میں وہ خصائص موجود ہوتے ہیں جو آرٹ کے نمونوں کے وجدان میں بروئے کار آتے ہیں۔

وجدان اور اظہار

اب ہم کروچے کے معروف اور بدنام زمانہ دعوے کی طرف آتے ہیں جس کا محور و مرکز یہ جملہ ہے: وجدان کا مطلب ہی اظہار ہے۔ (To intuite is to express)(4) دوسرے الفاظ میں وہ کہہ رہا ہے کہ وجدانی علم اظہاری علم ہے۔ کروچے کے اس بیان کو مناسب انداز میں سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل چند نکات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کیوں کہ اس کا یہ بیان ابتدأ درست نظر نہیں آتا۔

1) آرٹ کے کام کی دوہری شناخت

اس سلسلے میں یہ ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ کروچے بنیادی طور پر تصوریت پسند ہے۔ اس کے یہاں ذہن کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اس کی تصوریت پسندی کے مطابق آرٹ کا کوئی بھی نمونہ درحقیقت دوسری تمام اشیا کی مانند ذہن کی شے ہوتا ہے۔ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں اور نہ ہی اس میں دل چسپی کا کوئی عمل دخل ہوتا ہے۔ تضاد یہ ہے کہ اس کے باوجود وہ ذہنی چیزوں (مثلاً فکر، امید اور خواب وغیرہ) اور جسمی چیزوں (مثلاً درخت، میز، کرسی وغیرہ) کے درمیان معمولی قسم کے امتیاز کا قائل ہے۔ اس فرق و امتیاز کو سامنے رکھ کروچے آرٹ کے نمونوں کو ذہنی اشیا قرار دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آرٹ دہرے انداز میں مثالی یا آئیڈیل ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اگر ہم کہہ دیں کہ کروچے ثنویت پسند تھا جو جسمی اور ذہنی امتیاز کو قبول کرتا تھا۔ اب ظاہر ہے آرٹ کا کام بہرحال ایک ذہنی تشکیل ہوتا ہے جو جب وجود میں آتا ہے تو جسم میں ڈھل جاتا ہے۔ اگر اس پراسس کو سامنے رکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کروچے تصوریت، ثنویت اور جسمیت تینوں کے بارے میں تشکیک کا شکار تھا۔ (5)

آرٹ کے کام کی وجودیاتی حیثیت سے مراد یہ ہے کہ آرٹ کا سامع و ناظر دراصل موسیقی، نظم یا مصوری کو اپنے ذہن میں پھر سے تخلیق کر رہا ہے۔ کروچے کا اس سلسلے میں مرکزی استدلال وہی ہے جو رسل نے ادراک کی حسیات سے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے دیا تھا جو یوں ہے۔ کسی بھی چیز کی مدرکہ خصوصیات ادراک کرنے والے کی کیفیاتی صورت حال کے مطابق تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم اوّل الذکر کی بات کرتے ہیں تو دراصل ہم ثانی الذکر کے بارے میں بات کر رہے ہوتے ہیں۔ (6) اس طرح وہ

یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ادراک کرنے والا کسی Previlged حالت میں بھی ہو سکتا ہے۔

2)احساس کا کردار

کروچے کے نزدیک احساس ہر قسم کی ذہنی فعلیت میں لازمی طور پر شامل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ادراکِ محض بھی اس کی شمولیت کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ کوئی بھی چیز جو ادراک کا حصہ بنتی ہے مفعول نہیں ہوتی۔ کسی بھی فنی اظہار کو مخصوص جذبات کے ساتھ سوچنے کی ہمیں عادت ہوتی ہے۔ یہ جذبات ذہنی زندگی کے دوسرے معاملات میں نسبتاً کم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ہم کمیت کے فرق کو کیفیت کے فرق کی صورت میں لیتے ہیں۔ دراصل احساس ایک طرح کی ذہنی فعلیت ہی ہے۔ اس میں سوچ کی مختلف اقسام شامل ہوتی ہیں۔ جیسے آرزو اور عمل وغیرہ جس میں محرومی اور تسکین کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ آرٹ کا ایک ہی معیار ہے جسے وہ اظہار کی ہم آہنگی کا نام دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اظہار کی ہم آہنگی ارادے کا تحرک ہے۔ اس وجہ سے کروچے فارم اور مواد میں فرق قائم کرنے والے جمالیاتی امتیازات کو کنفیوژن کا شکار قرار دیتا ہے۔ یہ امتیازات صرف ماقبل ترکیب پوزیشن لینے کے لیے تھیوری کی سطح پر موجود ہوتے ہیں۔ (7) اس سطح پر وجدان کا بروئے کار آنا فارم کے ظہور کا باعث بنتا ہے۔ یوں وجدان ایک تشکیل میں ڈھل جاتا ہے۔ اس کی ایک شکل و صورت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

جمالیاتی سطح کے ساتھ ساتھ مظہری سطح پر بھی ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مواد کی ہیئت سے الگ کوئی شناخت نہیں ہوتی اور نہ ہی مواد کے علاوہ ہیئت کی کوئی شناخت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا فضول ہوگا کہ فن پارہ ہیئت کے حوالے سے تو خوبصورت ہے لیکن مواد کے حوالے سے کمزور ہے۔ اس کے برعکس بات کرنا بھی بعینہٖ فضول ہوگا۔

3)احساس، اظہار اور معمولیت

جب کروچے یہ کہتا ہے کہ وجدان اور اظہار دونوں ایک ہی مظہر ہیں تو ہم سوچ سکتے ہیں کہ اس شخص کے یہاں وجدان کی کیا حیثیت ہوگی جو مصوری نہیں کر سکتا۔ اگر ہم احساس کے بارے میں کروچے کے وسیع تصور کو قبول بھی کر لیں تو اس مسئلے کا حل نہیں نکلتا۔ مثلاً وہ شخص جس کے سامنے پھلوں کا طشت رکھا ہوا ور وہ تمام تر وجدان کے باوجود اس کو مصور کرنے کے قابل نہ ہو اس شخص کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے جو وجدان سے بھی لیس ہو اور اظہار کا ملکہ بھی اسے حاصل ہو۔ کروچے ان دونوں معاملات پر اپنا نقطۂ نظر تشکیل دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک طرف تعصب یا ذہنی فریب ہوتا ہے کہ ہمیں حقیقت کا مکمل وجدان حاصل ہے۔ حالاں کہ یہ وجدان اکثر اوقات عملی زندگی کے جھمیلوں میں عارضی نوعیت کا حامل ہوتا ہے اور جس دنیا کے بارے میں ہم وجدان

کے ہونے کا دعویٰ کرتے وہ کوئی مختصر سی حقیقت ہوتی ہے۔ اس کا اظہار بھی مختصر ہوتا ہے۔ اسے ہم روشنی اور رنگ کی پھلجھڑی قرار دے سکتے ہیں (8)۔ دوسری طرف اگر ہمارا ممدوح سنجیدگی سے پھل کے طشت پر توجہ مرکوز کرے تو یہ تسلیم نہ کرنا تعصب ہوگا کہ وہ اس حد تک اظہار کر رہا ہے۔ اگرچہ کروچے کے مطابق عام طور براہ راست چیزوں کا ادراک فوٹوگرافک ہوتا ہے۔ اس میں وہ غنائی کیفیت عنقا ہوتی ہے جو فن کار کا خاصا ہے۔

قدرتی اظہار، حسن اور لذتیت کا نظریہ

یہاں کروچے کے نظریۂ اظہار کی ایک نئی جہت سامنے آتی ہے جو اظہار کے بارے میں ہماری روزمرہ سوچ سے مختلف ہے۔ بطور مثال ہم بے سوچے سمجھے کہہ سکتے ہیں کہ رونا دکھ یا صدمے کا نتیجہ ہے۔ یعنی اظہاری کردار یا رویے کو اندرونی جذبے یا احساسات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن کروچے اُن ماہرین جمالیات کی ایک لمبی فہرست کا حوالہ دیتا ہے جو اس مظہر اور آرٹ میں اظہاری عمل میں فرق پر زور دیتے ہیں۔ مثلاً ڈارون نے انسانوں اور جانوروں کے احساسی رویوں میں اظہاری عمل کا تجزیہ کیا ہے۔ اپنے ایک مضمون مشمولہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں کروچے نے اس قسم کے نفسیاتی مظہر (Phenomenon) پر بحث کی ہے:

> ”اس طرح کا اظہار شعوری ہونے کے باوجود استعاراتی سطح کا ہوتا ہے، اس وقت جب اس کا تقابل روحانی یا جمالیاتی اظہار سے کیا جائے جس کا مقصد صرف اظہار ہوتا ہے یعنی جو احساس کو نظریاتی صورت دے سکتا ہے اور اسے زبان، نغمے اور صورت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ فرق دو چیزوں کے درمیان ہے ایک جو احساس متفکر یعنی شاعری ہے اور دوسرا جو عملی احساس ہے اور کتھارسس کا سبب بنتا ہے۔ یہ پریشانیوں سے نجات اور تسکین دینے والی خصوصیات آرٹ سے وابستہ کی جاتی ہیں۔ اگر ان میں فوری احساس داخل ہو جائے یا ان کو احساس کے اخراج کا ذریعہ بنا لیا جائے تو آرٹ سے آرٹ کے کام کی جمالیاتی مذمت (Condemnation) واجب آتی ہے۔“ (9)

ان چیزوں میں فرق و امتیاز کرنا کروچے کا حق ہے لیکن اس کا یہ دعویٰ کہ اظہار وجدان کے عین ہے ایسا کرنے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ یہاں مسئلہ درپیش یہ ہے کہ وہ اس فنامنا کا صحیح طور پر تجزیہ اس وجہ سے نہیں کر پایا کہ نتیجتاً اظہار کی تشریح سے برآمد ہوتا ہے۔

وہ فنی اظہار کو فطری اظہار سے مکمل طور پر الگ کرنے کا خواہش مند ہے۔ اس کی ایک وجہ آرٹ کے فطری نظریات سے اس کا خوفزدہ ہونا ہے۔ یہی چیز اس کے یہاں مسرت کو بطور مقصد قبول کرنے میں بھی مانع ہے۔ وہ آرٹ کی مقصدیت کا قائل نہیں۔ (Aes. 82-6)(10) یہ نہیں کہ وہ مسرت کی حقیقت سے انکار

کرتا ہے ۔ مسرت اور درد کا وجود اپنی جگہ پر ہے لیکن جب ان کا ذکر کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم جمالیات کی قدر یا ناقدری کی بات کر رہے ہیں ۔ (11) دراصل ان کی حیثیت عملی فلسفہ کے حوالے سے متعین ہوتی ہے ۔ مراد یہ کہ ہم ان کو ارادیت کے معیار پر پرکھ رہے ہیں، آرٹ کی تھیوری اور معیار ہمارے پیش نظر نہیں ۔ یعنی اگر جمالیات کی تعریفی قدر حسن ہے تو عملیت کی تعریفی قدر افادیت ہے ۔ کروچے Essence of Aesthetics میں واضح کر چکا ہے کہ مسرت کا دائرہ آرٹ کے دائرے سے بڑا ہے ۔ اس لیے آرٹ کی یہ تعریف کرنا کہ آرٹ مسرت کی علت ہے، بے کار ہے ۔ کروچے اصل جمالیاتی تجربے کی بات کرتا ہے ۔ جمالیاتی حقیقت کے مشاہدے کے حوالے سے شاید یہ اندازہ درست ہے ۔ جمالیاتی حقیقت کے مشاہدے میں منتج مسرت عارضی طور پر بجا نظر آتی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسرت ہمیشہ مشاہدے سے ہی بیدار ہوتی ہے ۔ اب ظاہر ہے وجدان ذہنی فعلیت کی ایک صورت ہے ۔ اگر وجدان ذہنی فعلیت ہے تو اس میں ارادے کا عمل دخل ضروری ہے ۔

محاکمہ، تنقید اور ذوق

نقاد کا پہلا کام کروچے کے نزدیک یہ ہے کہ وہ اپنے وجدان کو بیدار کرے اور اس وجدانی کیفیت کو گرفت میں لے آئے جو کہ آرٹ کے کام کی اساس ہے ۔ اس میں آدمی ناکام بھی ہو سکتا ہے ۔ غلطی کا ارتکاب بھی ممکن ہے ۔ ناکامی کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں ۔ جلد بازی، نخوت، تدبر کی کمی، نظریاتی تعصبات کی بنیاد پر نقاد اس چیز کو خوبصورت قرار دے سکتا ہے جو کہ دراصل خوبصورت نہیں ہوتی ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نقاد یہ جاننے میں ناکام ہو جائے کہ خوبصورتی کیا ہے ۔ لیکن تکنیک اور فنکارانہ فعلیت کے درمیان مندرجہ بالا امتیاز کو سامنے رکھیں تو نقاد کا کام آرٹسٹ کے جیسا ہی نظر آتا ہے :

> ”ہم اس چیز کا جسے ایک خاص فعلیت نے پیدا کیا محاکمہ ایک دوسری فعلیت کے حوالے سے کر سکتے ہیں ۔ نقاد کم تر درجے کا فطین ہو سکتا ہے ۔ آرٹسٹ اس سے بڑا فطین ہو سکتا ہے لیکن دونوں کی فطرت تو ایک جیسی ہی ہوتی ہے ۔ دانتے کا محاکمہ کرنے کے لیے اس کے درجے تک خود کو بلند کرنا ضروری ہے ۔ یہ تجربی طور پر اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ ہم دانتے نہیں ہیں اور نہ ہی دانتے ہم جیسا ہے ۔ لیکن اس لمحے جب ہم تفکر اور محاکمہ کرتے ہیں ہماری روح شاعر کی روح کا عین ہو جاتی ہے ۔ اس لمحے ہم اور وہ ایک ہی ذات میں ڈھل جاتے ہیں ۔“(12)

یہ دعوی کہ ہم شاعر کا عین ہو جاتے ہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے ۔ تاہم اگر ذوق سے مراد ہمارے

اندر جمالیاتی محاکے کا ظرف ہے اور اگر اس ظرف کا مطلب ہماری وہ صلاحیت ہے جو حسن کی یافت کرتی ہے۔ اور نبوغ سے مراد وہ صلاحیت ہے جو حسن کی تخلیق کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب صلاحیتیں ایک دوسرے کی مماثل ہیں۔ وجدان کے حصول کی استعداد کی حیثیت سے۔

عام طور پر کروچے کے فلسفہ میں جمالیات کی الگ تھلگ حیثیت ہے۔ جب ہم وجدان کو پا لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جمالیاتی قدر کو مکمل طور پر جاننے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اس لیے یہ سوال نہیں اٹھایا جا سکتا کہ حسن کا معیار کیا ہے۔ حسن کا معیار کہ جس کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے کوئی چیز خوبصورت ہے یا نہیں۔ کروچے کے مطابق:

> ''ذوق کا معیار ہی مطلق معیار ہے۔ لفظ مطلق کو مختلف معنوں میں لیا جا سکتا ہے۔ یہ حسابی عقل سے مختلف ہے۔ ذوق کا معیار تخیلہ کی وجدانی مطلقیت کے ساتھ مطلق ہے۔'' (13)

بے شک حقیقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو تنقیدی محاکموں میں بہت زیادہ تنوع نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں کروچے کا جواب یہ ہے کہ اس تنوع کی وجہ نفسیاتی لوازمات میں تبدیلیاں ہیں۔ اس میں ناظر کے جسمی حالات کا بھی عمل دخل ہو سکتا ہے۔ (14) اس سلسلے میں تاریخ کی تشریح سے بھی بہت کچھ تبدیل ہو سکتا ہے۔ تنوع ان تبدیلیوں کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے جو جلد بازی تدبر کی کمی اور نظریاتی تعصّبات سے جنم لیتی ہیں۔ (15)

آرٹ کی شناخت اور زبان

کروچے کی پہلی معرکتہ الآرا کتاب کا عنوان تھا Aesthetic as a Science of Expression and general Linguistc. ۔ اس کتاب کی بہت سی باہمی طور پر مربوط جہات ہیں۔ اس میں کروچے نے دعویٰ کیا ہے کہ سنگ تراشی، موسیقاری اور دوسرے فنون کے اظہاری طریقے سب زبان کی ہی مختلف صورتیں ہیں۔ صرف شاعری کی زبان ہی شاعرانہ نہیں ہوتی بلکہ کروچے کے نزدیک تمام زبان ہی شاعری ہے۔ اس لیے زبان کا فلسفہ اور آرٹ کا فلسفہ دونوں ایک ہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کو اظہار کے مفہوم میں لینا چاہیے۔ اصوات کا سلسلہ جو کسی چیز کا اظہار نہ کرے زبان کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ (16)

اس تناظر میں کروچے کا استدلال یہ ہے کہ اوّل حوالہ جاتی معنویات لازمی طور پر گفتار کے حصوں کو شامل کرتی ہے۔ دوم:

> ''یہ کہنا غلط ہوگا کہ اسم یا فعل کو معینہ لفظوں میں پیش کیا جائے تو وہ دوسروں سے واضح طور پر ممتاز ہو سکتا ہے۔ اظہار ایک انفرادی کل ہے۔ جس میں اسم اور فعل کا وجود نہیں ہوتا۔ ان کی حیثیت محض مجرد ہوتی ہے جس کی ساخت ہم خود کرتے ہیں۔ اس قسم کی

تجرید اس واحد لسانی حقیقت کو ٹھیس پہنچاتی ہے جسے جملے کا نام دیا جاتا ہے۔"

اگر اس سے مراد جملے کی معنویت کا تفوق ہے تو اس سے نحوی ترکیب کا انکار لازم آتا ہے جس کا مطلب نحوی اور اظہاری معنوں میں فرق کا انکار ہے۔ اس نحوی اور اظہاری فرق کو فریگیین اصلاح میں مفہوم اور آواز کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو زبان کی حاصل شدہ تصویر کو ڈرائینگ پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورت حال میں جس طرح ڈرائنگ کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح لسانی ترجمہ بھی ناممکن ہو گا۔ بعض مقاصد کے تحت ہم اضافی اور نسبتی انداز میں ترجمہ کرنے کے قائل ہوتے ہیں۔ کروچے کے نزدیک تمام نشانات فطری نشانات نہیں ہوتے جس طرح آسمانی بجلی گرج کا نشان ہوتی ہے۔ اس طرح مصوری، شاعری اور آرٹ کے نمونوں کو فطری نشانات کے حوالے سے پرکھا نہیں جا سکتا۔ یہ سب تاریخ سے مشروط ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ اپنے عظیم پیش رو نیو پولی تان گیام بیٹسا سے متاثر تھا۔ کروچے کے مطابق (17) ویکو وہ پہلا شخص تھا جس نے تسلیم کیا کہ جمالیات خود مکتفی ہے، ایک ایسی قسم کا علم جو تعقلات پر استوار نہیں۔ اس نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ تمام زبان اصل میں شاعری ہی ہے۔

آخری عمر میں فکری تبدیلیاں

کروچے کے یہاں عمر کے اواخر میں فکری تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ اس کی جمالیات پر پہلی کتاب 1901 میں Aesthetic کے نام سے چھپی تھی۔ دوسری کتاب Essence of Aesthetic کے زیر عنوان 1913 میں منظر عام پر آئی۔ ان دونوں کتابوں میں وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ آرٹ کا کوئی اخلاقی مقصد نہیں ہوتا۔ آرٹ کا معیار قدر صرف حسن ہے اور کچھ نہیں لیکن 1917 میں اس نے جب The Totality of Artistic Expression کے نام سے مضمون تحریر کیا تو محولہ نقطۂ نظر سے زیادہ عمیق سوچ کو اپنایا۔ یہ ایک طرح سے تاکید کا فرق تھا۔ یا ممکن ہے کہ وہ اپنی فکر میں پہلے سے موجود مگر نظر انداز کردہ مضمرات کو بروئے کار لایا ہو۔ اگر اخلاقی اصول آفاقی قوت ہے جیسا کہ یہ لازماً ہے۔ دنیا کی ملکہ کی حیثیت سے وہ آزادی کی دنیا ہے۔ وہ دنیا پر اپنے حق سے راج کرتی ہے۔ جب کہ آرٹ طہارت کے تناسب سے حقیقت کے تحرک کا اظہار کرتا ہے۔ اسے تفاعل میں لاتا ہے۔ یوں اس کا دعویٰ ہے کہ آرٹ کے اخلاقی کام کا مطلب جمالیات سے متجاوز ہونا نہیں۔ اسی طرح غیر اخلاقی کام کے بارے میں بات کرنا غلط نہیں کیوں کہ جمالیات اور اخلاق کی حدیں مطلقاً غیر متعادل ہیں۔ یہ صرف دعویٰ ہی نہیں کہ خالص وجدان کی سرحدوں میں یہ تعقل بروئے کار نہیں آتا۔ یہ دعویٰ التماس سوال (To beg the question) کے مساوی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آرٹ کے خالص کام کو اخلاقی بنیادوں پر نہ قبول کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی مسترد۔ اس کی تعریف

کی جا سکتی ہے نہ ہی تادیب کیوں کہ جمالیات کی حدود میں اخلاقیات کے قوانین لاگو نہیں ہوتے۔

بہر کیف 1928 میں انسائیکلوپیڈیا میں چھپنے والے مضمون میں اس نے مثبت انداز میں اصرار کیا ہے کہ اخلاقی حسیت آرٹسٹ ہونے کی لازمی شرط ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ”تمام شاعری کی بنیاد انسان کی شخصیت ہے۔ اور چوں کہ انسانی شخصیت اپنی تکمیل اخلاق سے کرتی ہے اس لیے تمام شاعری کی اساس اخلاقی ضمیر ہے۔“(18)

اس بیان کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنے دعوے کو تبدیل نہیں کیا۔ مثلاً شیکسپیئر اس وقت تک شیکسپیئر نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ انسان کے اخلاقی قلب میں جھانکنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو کیوں کہ اخلاق روح کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ تاہم یہاں ہم پر لازم ہے کہ اخلاقی حسیت اور اخلاقی صلاحیت جو اخلاقی عمل کا باعث بنتی ہے میں فرق کریں۔ کروچے کے نزدیک آرٹ کے لیے صرف اخلاقی حسیت ہی کافی ہے۔

اس کی ابتدائی تحریروں میں جو حسن کو اہمیت و فوقیت حاصل تھی وہ بعد کی تحریروں میں کم ہوتی چلی گئی۔ اس نے کامیاب آرٹ اسے کہنا شروع کر دیا جس میں اظہار کی فراوانی ہو جو وجدان کی غنائیت پر مبنی ہو۔ اپنی کتاب جمالیات کی روح (The Essence of Aesthetic) میں اس نے لکھا:

> ”جو چیز وجدان کو وحدت اور ہم آہنگی عطا کرتی ہے وہ احساس ہے۔ وجدان درحقیقت احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی سے برآمد ہوتا ہے اور اسی پر صادر ہوتا ہے۔ تصور کی بجائے احساس ہی وہ چیز ہے جو آرٹ کو علامت کی ملائمت اور سبک ساری فراہم کرتا ہے۔ ایک ایسی آرزو جو استحضاریت میں ملفوف ہوتی ہے آرٹ کہلاتی ہے۔ دراصل آرزو ہی استحضاریت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسی طرح استحضاریت آرزو کی نمائندہ ہوتی ہے۔“(19)

بایں ہمہ کروچے کا دعویٰ اب بھی وہی ہے یعنی آرٹ وجدان کا دوسرا نام ہے۔ غیر منطقی ہے اور غیر تعقلاتی۔ یہ احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ آرٹ کے جمالیاتی ورتارے میں تعقل کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ آرٹ سے مراد یہ نہیں کہ اسے علامتی ہونا چاہیے کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آرٹ کی تفہیم کے لیے عقلی کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ دونوں کا مطلب یہ ہو گا کہ جمالیاتی کارکردگی جمالیات سے کوئی الگ چیز ہے۔ جمالیات تو ہمیشہ وجدانی صلاحیت ہوتی ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ ہمارا وجدانی صورت کا وقوف کچھ نہیں سوائے اس وقوف کے جو احساس کی لہروں کو وحدت میں ڈھال دیتا ہے اور پھر اس وحدت میں متحرک ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو وجدان کو وحدت عطا کرتی ہے۔ اسے اپنے گردوپیش یا غیر مسلسل اور کنفیوزڈ وجدان سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ چیز ہے حسن۔ وہ کہتا ہے:

> ''ایک مناسب اظہار اگر وہ واقعی مناسب ہو تو خوبصورت بھی ہوتا ہے۔ حسن کیا ہے؟ حسن سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ تمثال کی موزونیت کا دوسرا نام ہے جس سے مراد اظہار کی موزونیت ہے۔''(20)

کروچے کے بقول:

> ''اظہار اور حسن دو مختلف تعقلات نہیں۔ یہ ایک ہی تعقل کے دو پہلو ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔''(21)

ایک صدی پہلے یعنی 1917 میں یہ بات بالکل نئی اور پر کشش تھی لیکن اس کے باوجود یہ بہر حال ایک معماتی دعویٰ تھا کہ آرٹ کی آفاقیت کلیت سے منسلک ہے۔

> ''احساس کے مواد کو آرٹ کی ہیئت دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسے کلیت کا کردار سونپ دیا ہے یعنی اس میں کائنات کے سانس پھونک دیے ہیں۔ اگر اس کی اس نقطۂ نظر سے تفہیم کی جائے تو استخراج یہ ہوگا کہ آفاقیت اور آرٹ فارم دونوں ایک ہی چیز ہے۔''(22)

وہ مزید لکھتا ہے:

> ''وجدان میں واحد کلیت کی زندگی کے ساتھ دھڑکتا ہے اور اسی طرح کلیت واحد میں موجود ہے۔ ہر خالص فنکارانہ استحضاریت اپنی ذات میں کائنات ہے۔ انفرادی ہیئت بھی کائنات ہے اور یوں انفرادی ہیئت کائنات کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاعر کی ہر گفتار میں، ہر تخیلاتی تخلیق میں پوری انسانیت کی تقدیر جھلکتی ہے۔ تمام انسانی اُمید، التباس، دُکھ، خوشیاں، انسان کا شکوہ اور اس کے مصائب، حقیقت کا تمام قوعہ مسلسل ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ دکھ اور سکھ کے بیچ اپنی ذات سے بر آمد ہوتا ہے۔''(23)

اٹلی کی 1917 میں صورت حال ہی کچھ ایسی تھی کہ کروچے کو انسانی حوالے سے آرٹ کی اہمیت کو اتنی آرزومندی سے جتانا پڑا۔ اس کا یہ آرزومندانہ دعویٰ احساس کلیت سے لبریز ہے۔ تاہم یہ دعویٰ اسے اپنے سابقہ دعووں سے کاٹ دیتا ہے۔ اب اس کے یہاں ہیئت جزوی احساس سے مربوط ہونے کی بجائے آفاقیت سے منسلک ہو جاتی ہے۔ یہ تعلق اس نے کس طرح قائم کیا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ حتیٰ کہ اس کی اپنی منطق سے بھی اسے سمجھنا دشوار ہے۔ یہاں کانٹ کا قول یاد آتا ہے کہ جمالیات کے محاکموں میں ہم آفاقیت طلب کرتے ہیں۔ لیکن اس قول کے حوالے سے کوئی بات کروچے کے دعوے میں کھل کر سامنے نہیں آئی۔ اس کے عقب میں کروچے کے فلسفے کا ایک جز کارفرما نظر آتا ہے۔ چوں کہ آرٹ دانش سے پہلے وقوع پذیر ہوتی ہے اس لیے موضوع اور معروض کی تقسیم اس میں معدوم ہو جاتی ہے۔ یوں گویا آرٹ کی آفاقیت کے بارے میں

بات کرنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں رہتی لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کا مثبت مطلب کیا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ اگر ہم بیتھوون کی موسیقی (یا مائیکل اینجلو کی مصوری) کے آفاقی کردار کی بات کرتے ہیں تو یہ بات اس وقت درست ہوگی جب ہم اس کا تقابل کسی گروہ کے پاپ بینڈ سے کرتے ہیں۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ کروچے ہمیں کچھ نہیں بتاتا کہ اس آفاقیت کی توجیہ اور جواز کیا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ اس قسم کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب نہیں۔ اس کے ساتھ یہ استخراج کرنا بھی غلط ہوگا کہ اس کے قارئین کو اس سے اختلاف کا حق حاصل نہیں۔

کروچے کی جمالیات کا تنقیدی جائزہ

کروچے کا دعویٰ کہ وجدان اظہار کے مساوی ہے آخر کار نا قابل عمل ہے۔ سی۔ جے ڈکاسے نے اس کی نشاندہی سب سے پہلے کی جب ہم گلدان کو پھولوں سے بھرا ہوا دیکھتے ہیں تو یہ اہم نہیں ہوتا کہ کتنا قریب سے ہم نے اسے دیکھا ہے یا کس طریق سے دیکھا ہے۔ اس وقت تک آرٹ کی تخلیق نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم اس کی صورت گری نہ کر لیں۔ کروچے نے منفعل انداز میں کچھ سوچنے اور اسے عمل میں لانے کے درمیان فرق کو فراموش کر دیا ہے۔ یہ فرق وہی ہے جو پڑھنے اور لکھنے، دیکھنے اور مصور کرنے، سننے اور کھیلنے، رقص کرنے اور رقص دیکھنے کے مابین موجود ہوتا ہے۔ ان جوڑوں کے پہلے ارکین کا تعلق صرف ذہنی فعلیت سے ہے۔ یہ درست ہے کہ ان تمام جوڑوں کے ارکین میں اہم تعلق ہوتا ہے اس تعلق کو برینس نے Ideated Sensations کا نام دیا ہے لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ ان میں فلسفیانہ لحاظ سے سخت قسم کا اختلاف نہیں ہوتا۔

اگر وجدان اور اظہار کی مساوات کو تسلیم کر لیا جائے تو تنقید و تشریح کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کمیونٹی کا تصور بھی ختم ہو جاتا ہے جسے ہم جمالیات کے ناظرین اور سامعین پر مشتمل قرار دیتے ہیں۔ یہ کہنا کہ آرٹ وجدان کے عین ہے دراصل یہ دعویٰ کرنے کے مترادف ہے کہ آرٹ کا کام لازمی طور پر ایک ذاتی یعنی پرائیویٹ سوچ کی چیز ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص جب باٹی سیلی وینس سے متعلق وجدان کی کیفیت سے گزرتا ہے تو اس کا وجدان لازمی طور پر باٹی سیلی سے متعلق دوسرے شخص کے وجدان سے مختلف ہوگا۔ باٹی سیلی وینس کی تفہیم ایک مادی پینٹنگ کے طور پر نہیں ہو رہی ہوتی۔ یہ تو ذاتی قسم کا احساس ہے جس میں باٹی سیلی وینس الف کے لیے الگ ہے اور ب کے لیے الگ یعنی دونوں کی اپنی اپنی باٹی سیلی وینس ہے یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ ان وجدانی کیفیات کا کوئی تقابل نہیں ہو سکتا۔ کوئی اعلیٰ معیار قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اتفاق اور اختلاف کرنا ناممکن ہوگا کیوں کہ ان موضوعی آرا کا تقابل منطقی طور پر ناممکن ہوتا ہے۔ سوچ کا یہ انداز متضاد نہیں لیکن بے انتہا غیر دل چسپ ہے۔ یہ آرٹ کو حقیقت سے بہت دور لے جاتا ہے۔ جیسا کہ فرائیڈ نے زور دے کر بتایا ہے کہ آرٹسٹ کی میڈیم کے ساتھ اس جدوجہد کا مطلب یہ ہے کہ آرٹسٹ حقیقت کو فتح کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگرچہ کروچے اس نتیجے کو قبول نہیں کرتا لیکن ہم استخراج کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ

اس کے نقطۂ نظر کے مطابق آرٹ فینٹسی کی دنیا ہے۔ (منفی معنوں میں) جس میں vanity کی کوئی حد نہیں۔

کروچے کا یہ دعویٰ کہ ساری زبان شاعری ہے لا ریب اس کی ادب سے عمر بھر کی وابستگی کا آئینہ دار ہے۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ساری زبان میں شعری خصوصیات موجود ہوتی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ زبان اپنی حقیقت میں جمالیاتی آوازوں یا تخاطبات پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ بوسنکے نے 1919 میں کہا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ زبان صرف شاعری ہے یا زبان کی حوالہ جاتی جہت موجود نہیں۔ اس میں وہ خصوصیت بھی موجود ہے جو سائنسی زبان کو صوت (Tune) سے ممیز کرتی ہے۔ یہ دراصل وہی کچھ ہے جسے ہم حوالہ جاتی زبان کا نام دے چکے ہیں۔ جو شاعری کو اس آواز سے مختلف کرتی ہے جس میں آواز اور معنی شامل ہوتے ہیں۔ کروچے نے یقیناً زبان کی حوالا جاتی جہت سے انکار کر دیا ہوتا۔ یا اسے محض تجرید کہہ کر رد کر دیا ہوتا لیکن اس کے عام فلسفیانہ نظریات اسے ایک ایسے طریق کا پابند بنا رہے ہیں جو کہ نا قابل عمل ہے۔ بالفرض کروچے آرٹ وجدان ہے کہ نظریے سے دستبردار ہو جاتا ہے اور اتفاق کر لیتا ہے کہ آرٹ کا کام مادی کام کے عین ہے تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ وہ تصوریت کے فلسفے سے بھی دست بردار ہو گیا۔ اسی طرح اگر وہ یہ بھی تسلیم کر لیتا ہے کہ اس کا زبان کا نظریہ درست نہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی تھیوری میں سے کیا بچے گا۔ اس صورت میں یہ طے ہے کہ اس کا جوہر ضرور قائم رہے گا۔ وہ یہ کہ آرٹ اظہار ہے جس کو ہم وجدانی صلاحیت سے بروئے کار لاتے ہیں۔

اس بحث کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم کروچے اور اس کے پیرو کار کولنگ ووڈ کے مابین بنیادی اختلافات کا خلاصہ بیان کر دیں۔ اوّل یہ کہ کروچے کی تھیوری میں آرٹ کا اظہاری مواد کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو صرف آرٹسٹ کے اندر موجود ہو۔ وہ اس کی ہیئت اور آفاقیت پر زور دیتا ہے۔ کولنگ ووڈ نے اظہاری مواد کا جذبات کی تفصیلی تھیوری کے ذریعے جائزہ پیش کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کروچے نے آرٹ کی ٹیکنیکل تھیوری کو نامعتبر ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے تو کولنگ ووڈ نے زیادہ منظّم اور مفصل انداز میں اس کا تجزیہ کیا ہے کہ آرٹ ہنر مندی سے آگے کی چیز ہے۔ تاہم استدلال یہ کہتا ہے کہ اس کے اصل نکات کروچے سے اخذ کردہ ہیں۔ کولنگ ووڈ نے اپنی کتاب کے آخری باب کو اس موضوع پر بحث کے لیے مختص کیا ہے جسے کروچے نے نظر انداز کر دیا۔ موضوع یہ ہے کہ سامعین کا ردِّعمل کیسے اور کیوں کر اس شے کو رد کر سکتا ہے جسے آرٹسٹ پیش کرتا ہے۔

کروچے پر اس بحث کا اختتام ہم معروف پاکستانی مفکر ایم ایم شریف کے درج ذیل ریمارکس سے کرتے ہیں:

> ”کروچے کے تفکر کی قدر و قیمت اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ اس نے ماہرین جمالیات کی توجہ فن کارانہ تجربے کی نسبتاً فراموش کردہ جہت پر مرکوز کی۔ وہ جہت جو

اظہار کے نام سے معروف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ‘تاثر’ کی اہمیت کو نظر انداز کیا لیکن اس کے لیے وہ قصور وار نہیں۔ ہر نیا نظریہ ساز ان جہات کو زیادہ اُجاگر کرتا ہے جو اس کے پیش روؤں کی نظروں سے اوجھل رہ جاتی ہیں۔ اس کا مناسب جواز بھی موجود ہوتا ہے۔ جب تک نئی نسل کی توجہ ڈھول پیٹ کر حقیقت کے کسی نئے پہلو کی طرف نہ دلائی جائے، توجہ کا حصول خاصا مشکل ہوتا ہے۔ لوگ ایک کان سے سنتے ہیں، دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ آنکھوں کو منظر نامے کی کسی ایک سمت میں مرتکز کیا جائے تو دوسری سمت وقتی طور پر ہی سہی نظر انداز ہو جاتی ہے۔ کروچے نے ہمیں فلڈ لائٹ میں وہ کچھ دیکھنے پر مجبور کیا ہے جو اس سے پہلے واضح انداز میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس طرح کروچے نے ہمیں کوئی مصدقہ تھیوری نہیں دی، تاہم اس نے یقیناً مصدقہ اور حقیقی تھیوری کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔‘‘(24)

حوالہ جات

(1) History as the story of liberty: English translation of Croce's 1938 collection of essays originally in Italian; translation, published by Liberty Fund Inc. in the USA in 2000 with a foreword by Claes G. Ryn., See Croce 1938.

(2) ڈاکٹر جمیل جالبی، ارسطو سے ایلیٹ تک، صفحہ 401

(3) Aesthetic: As science of expression and general linguistic translated by Douglas Ainslie, New York: Noonday.,1909, 14[1922] cited as Aes.

(4) Aes., 11

(5) Philosophy, Poetry, History: An Anthology of Essays227 translated and introduced by Cecil Sprigge, London: Oxford University Press,1966.

(6) Aesthetic, 106.

(7) The Essence of Aesthetic, translated by Douglas Ainslie, London: Heinemann. Noted as EA, 39-10, 1921.

(8) Aes. 9

(9) PPH 219

(10) Aes. 82-6

(11)Aes. 94

(12)Aes.121)

(13)Aes.122)

(14)Aes. 124

(15)Aes.120

(16)Aes. 143

(17)Aes. 220

(18)PPH 221

(19)EA30

(20)EA48

(21)EA 49

(22)PPH 263

(23)PPH 262

(24)M. M. Sharif, Studies in Aesthetic, Institute of Islalmic Culture, Lahore, p. 165, 1964.

☆☆☆☆

موپساں
انگریزی سے ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

چاندنی

میڈم جولی روبیئر اپنی بڑی بہن، میڈم ہنریٹ لیٹور کا انتظار کر رہی تھی، جو ابھی ابھی سوئیٹزرلینڈ سے لوٹی تھی۔ لیٹور خاندان تقریبا پانچ ہفتے پہلے ہی اپنا گھر چھوڑ گیا تھا۔ میڈم ہنریٹ نے اکیلا اپنے خاوند کو واپس اپنی جاگیر کلوادوز کی اجازت دے دی تھی، جہاں کچھ کاروبار کو اس کی توجہ کی ضرورت تھی اور وہ اپنی بہن کے ساتھ کچھ دن گزارنے کے لیے پیرس آیا تھا۔ رات ہو گئی۔ ایک خاموش کمرے میں، میڈم روبیر غائب دماغی کے ساتھ ملگجی اندھیرے میں کچھ پڑھنے میں مصروف تھی، جب بھی وہ کوئی آواز سنتی تو اپنی آنکھیں ضرور اٹھاتی۔

آخر کار اس نے دروازے پہ گھنٹی کی آواز سنی اور اس کی بہن نمودار ہوئی جس نے ایک سفرانہ چوغہ پہنا ہوا تھا اور بغیر کسی روایتی سلام دعا کے، انھوں نے بہت ہی محبت کے ساتھ ایک دوسرے کو گلے لگا لیا، صرف چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے کو جدا کرتے ہوئے تا کہ وہ ایک دوسرے سے دوبارہ گلے لگا سکیں۔ پھر انھوں نے اپنی صحت، اپنے اپنے خاندانوں اور ہزاروں دوسری چیزوں کے بارے میں باتیں کیں۔ گپ شپ لگاتے، جلدی میں بال جھٹکاتے، ٹوٹے ہوئے جملوں کے ساتھ وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتی گئیں جب کہ میڈم ہیرنٹ اپنا ہیٹ اور نقاب اتار رہی تھی۔

اب خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ میڈم روبیر نے ایک لیمپ کے لیے گھنٹی بجائی اور جوں ہی یہ لایا گیا، اس نے اپنی بہن کے چہرے کا جائزہ لیا اور ایک بار پھر اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی بہن کو گلے لگا لے۔ لیکن اس کے خود کو روک لیا، خوفزدہ سی ہوئی اور اس کے ظاہری وجود پہ حیران رہ گئی۔

میڈم لیٹور کی کنپٹیوں پہ، سفید بالوں کی دو بڑی لٹیں تھیں۔ جب کہ اس کے باقی سارے بال، بہت چمکدار، سیاہ فام کالے تھے؛ لیکن وہاں اکیلے، اس کے سر کے دونوں جانب، چاندی کی دو لہریں سی تیرتی نظر آتیں جو فورا ہی اپنے اردگرد پھیلے ہوئے سیاہ جنگل میں گم ہوتی دکھائی دیتیں۔ وہ کم وپیش صرف چوبیس سال کی تھی اور یہ تبدیلی اس میں یک لخت آئی تھی جب وہ سوئیزرلینڈ سے لوٹی تھی۔

بغیر کسی حرکت کے، میڈم روبیر نے حیرانی کے ساتھ اس کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تیر آئے کہ ہو نہ ہو اس کی بہن کا کسی ناگہانی اور پراسرار مصیبت سے سامنا ہوا ہے۔ اس نے پوچھا؛

“کیابات ہے، ہنریٹ؟”

ایک اداس چہرے کے ساتھ مسکراتے ہوئے، ایک ایسی مسکراہٹ جو کہ بیمار دل کے ساتھ ہو، دوسری نے جواب دیا:

“کیوں، کچھ بھی نہیں، میں تم کو یقین دلاتی ہوں۔ کیا تم نے میرے سفید بال دیکھ لیے ہیں؟”

لیکن میڈم روبیر نے تیزی کے ساتھ اس کو کندھوں سے تھام لیا اور اس پر کھوجتی ہوئی نگاہیں ڈالتے ہوئے دوبارہ پوچھا:

“کیا مسئلہ ہے تمھارے ساتھ؟ مجھے بتاؤ تمھارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اور اگر تم نے مجھ سے جھوٹ بولا، مجھے بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔”

اب وہ دونوں آمنے سامنے تھیں اور میڈم ہنریٹ، جو بالکل ایسے دکھائی دے رہی تھیں جیسے وہ بے ہوش ہونے والی ہو، اس کی جھکی ہوئی آنکھوں کے کونوں پہ موتیوں کی طرح آنسو ابھر آئے تھے۔

اس کی بہن نے دوبارہ بات شروع کی:

“کیا ہوا ہے تمھیں؟ کیا مسئلہ ہے تمھارے ساتھ؟ مجھے جواب دو۔۔۔!” پھر ڈوبی ہوئی آواز میں، دوسری نے بڑبڑاتے ہوئے کہا:

“میرا۔۔۔ میرا ایک محبوب ہے۔” اور اپنا چہرہ چھوٹی بہن کے کندھے میں چھپاتے ہوئے، اس نے آہیں بھریں۔

پھر، جب اسے تھوڑا سا سکون آیا اور اس کی چھاتیوں کے ابھار کچھ دھیمے پڑ گئے، اس نے خود کو اس سے جدا کرنا شروع کر دیا، جیسے کہ وہ اپنا راز اس کے سامنے اگلنا چاہتی ہو اور غموں کے اس غبار کو ایک ہمدردانہ دل میں منتقل کرنا چاہتی ہو۔

دونوں عورتیں ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے، ایک صوفے کی جانب چلی گئیں جو کہ کمرے کے ایک اندھیرے کونے میں رکھا تھا۔ وہاں وہ ایک دوسرے میں کھو گئیں۔ چھوٹی بہن نے اپنا بازو بڑی بہن کی گردن میں حمائل کیا اور اسے اپنے دل کے قریب کرتے ہوئے اس کو غور سے سننے لگی۔

“آہ! میں جانتی ہوں کہ میرے لیے کوئی بہانہ نہ تھا؛ میں خود کو بھی نہ سمجھ سکی اور اس دن کے بعد، میں محسوس کرتی ہوں جیسا کہ میں پاگل تھی۔ میری جان، اپنے لیے بہت محتاط رہو۔۔۔ بہت ہی محتاط۔۔۔!!! اگر تم صرف یہ جان لو کہ ہم کتنے کمزور ہیں، کتنے جلدی ہم گھائل ہو جاتے ہیں اور محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس میں بہت ہی کم وقت لگتا ہے، بہت ہی کم وقت، بہت ہی کم۔۔۔ یہ درد کا ایک لمحہ ہے، دکھ کے ان

اچانک احساسات میں سے ایک جو آپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، آپ پہ ساری آرزویں کھل جاتیں ہیں، آپ کی بانھیں، محبت کرنے کے لیے، کسی چیز کے پیار میں کھونے کے لیے جس سے کچھ خاص لمحوں میں ہم کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔

''تم میرے خاوند کو جانتی ہو، اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ مجھے اس سے کتنا پیار ہے؛ لیکن وہ بہت بڑی عمر کا اور سمجھدار ہے اور وہ کبھی بھی ایک عورت کے دل کے نرم جذبات کی لہر کو محسوس نہیں کرسکتا۔ وہ ہمیشہ ہی ایک جیسا رہا ہے، ہمیشہ اچھا، ہمیشہ مسکراتا ہوا، ہمیشہ مہربان اور ہمیشہ ہی کامل ۔۔۔اوہو! کیسے میں کبھی کبھار یہ خواہش کرتی کہ وہ مجھے اپنی بانھوں میں گرمجوشی کے ساتھ لپیٹ لے، کہ وہ مجھے اپنے ست اور مدہوش بوسوں کے ساتھ گلے لگا لے جو کوئی بھی دو وجودوں کو ایک کردیتے ہیں، جو ایک گونگے اعتماد کی طرح ہوتا ہے! کس طرح میں نے خواہش کی تھی کہ وہ بیوقوف تھے، بالکل کمزور، تا کہ اس کو میری ضرورت رہے، میرے پیار کی اور میرے آنسوؤں کی ۔۔۔!!!

''یہ سب کچھ بہت ہی احمقانہ محسوس ہوتا ہے؛ لیکن ہم عورتیں اس طرح ہی ہوتی ہیں۔ ہم اس مسئلے میں کیا کرسکتی ہیں؟''

''اور ابھی بھی اس کو دھوکہ دینے کا کوئی بھی خیال میرے دماغ میں نہیں ہے۔ اور اب یہ محبت کے بغیر، کسی وجہ کے بغیر اور کسی چیز کے بغیر ہو چکا ہے، صرف و صرف اس وجہ سے کیوں کہ ایک رات جھیل لوسرنیں پر چاند چمکا ہے۔

''سارے مہینے کے دوران، جب ہم ایک ساتھ سفر کر رہے تھے، میرے خاوند نے اپنی دھیمی بے پروائی سے میرے جوش و جذبے کو بے حس کردیا اور میرے شاعرانہ جوش و جذبے کو بجھا کے رکھ دیا۔ جب ہم سورج ابھرتے وقت، پہاڑوں سے نیچے راستوں پر اتر رہے تھے، جب کہ چار گھوڑے جاں فشانی کے ساتھ ایک ساتھ سرپٹ دوڑ رہے تھے، ہم نے صبح کی شفاف دھندلاہٹ میں، وادیاں، جنگل، ندیاں اور گاؤں دیکھے، میں نے خوشی سے اپنے ہاتھوں سے تالیاں بجائیں اور اسے کہا: ''جان! یہ سب کتنا پیارا نظارہ ہے! مجھے ایک بوسہ دو! ابھی مجھے ایک بوسہ کرو!'' اس نے صرف سرد مہر ہمدردانہ مسکراہٹ کے ساتھ اتنا سا جواب دیا: ''اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ ہم کیوں ایک دوسرے کو پیار کریں، صرف اس وجہ سے کہ تم کو یہ نظارہ پسند آگیا ہے۔''

''اور اس کے الفاظ نے مجھے اور میرے دل کو منجمد کردیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ان کو پہلے سے زیادہ محبت کی تبدیلیوں کو محسوس کرنا چاہیے جب ایسے خوبصورت مناظر ان کے اردگرد موجود ہوں۔

”دراصل، میرا من شاعری کے لیے مچل رہا تھا جس کا اس نے مجھے اظہار نہیں کرنے دیا۔ میں بالکل ایک بوائیلر کی طرح تھی جو کہ بھاپ سے بھرا ہوتا ہے اور ساحرانہ طور پر بند ہوتا ہے۔

”ایک شام (ہم فلولین کے ایک ہوٹل میں چار دن سے ٹھہرے ہوئے تھے) رابرٹ، بیماری کے باعث اپنے شدید سر درد کی وجہ سے، رات کے کھانے کے فوراً بعد جلدی ہی سونے کے لیے چلا گیا اور میں بالکل اکیلی واک کے لیے جھیل کنارے چلی گئی۔

”یہ ایک ایسی رات تھی جس کے بارے میں ہم پریوں والی کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔ آسمان کے بالکل بیچ میں، پورا چاند کھلا ہوا تھا۔ اونچے اونچے پہاڑ، اپنے برفیلے اوج کے ساتھ ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے انھوں نے چاندی کے تاج پہنے ہوں؛ جھیل کے پانیوں میں، ننھی چمکتی لہروں کے ہلکورے چمک رہے تھے۔ ہوا بہت خوشگوار تھی، ایک چبھنے والی گرمی کے ساتھ جو ہمیں کمزور کر دیتی ہے جب کہ ہم بظاہر کسی وجہ کے بغیر کسی چیز کے شدید زیرِ اثر بے ہوش ہونے والے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کیسا احساس ہے، ایسے لمحوں میں، دل کیسے دھڑکتا ہے! اس کی کتنی تیز دھڑکن ہوتی ہے اور اس کے جذبات کتنے شدید ہوتے ہیں!

”میں نیچے گھاس پہ بیٹھ گئی اور اس وسیع، اداس اور دل موہ لینے والی جھیل کو دیکھا اور ایک عجیب سا خیال میرے ذہن میں آیا۔ محبت کی پیاس کی نہ بجھنے والی چاہ نے مجھے جکڑ لیا، یہ میری زندگی کی غمگین سستی کے خلاف میرے رویے کی تبدیلی تھی۔ کیا! یہ میری قسمت میں کبھی نہیں ہوگا کہ میں بانھوں میں بانھیں لے کر گھوموں، ایک ایسے شخص کے ساتھ جس سے میں محبت کرتی ہوں، اس جھیل کنارے کے ساتھ ساتھ جس کو چاندی کرنیں چومتی ہیں۔ کیا میں اپنے لبوں پہ کبھی بھی گہرے، دل کش اور مدہوش کر دینے والے بوسوں کو محسوس نہیں کر سکتی؟ جن کا تبادلہ محبت کرنے والے لوگ راتوں کو کرتے ہیں، رات جسے خدا نے اسی پیار اور چاہت کے لیے بنایا ہے۔ کیا میں کبھی بھی گرم جوشی کو، گرمیوں کی راتوں کو چاندنی کے سایوں میں پگھلا دینے والی محبت کو نہیں جان پاؤں گی؟

”اور میں ایک پاگل عورت کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔ مجھے اپنے پیچھے کچھ چیز حرکت کرتی محسوس ہوئی۔ وہاں ایک شخص کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ جب میں نے اپنا چہرہ پیچھے کی جانب موڑا، وہ مجھے پہچان گیا اور میری جانب بڑھتے ہوئے کہا:

”میڈم، کیا آپ رو رہی ہیں؟“

”یہ ایک نوجوان بیرسٹر تھا جو اپنی ماں کے ساتھ کہیں جا رہا تھا اور جیسے ہم اکثر ملتے رہتے تھے۔ اس کی آنکھیں متواتر مجھے دیکھ رہی تھیں۔

”میں بہت گھبرا گئی کیوں کہ مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ میں اسے کیا جواب دوں یا اس صورت حال کے بارے میں کیا کہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بیمار ہوں۔“

”وہ میرے پہلو میں، عزت دار اور عام سے انداز میں ساتھ ساتھ چلنے لگا اور میرے ساتھ گفتگو شروع کر دی کہ میں نے اس سفر کے دوران کیا کیا دیکھا تھا۔ جو سب کچھ میں نے محسوس کیا تھا، اس نے وہ سب الفاظ میں ترجمہ کر دیا؛ جو جو سنسنی مجھے اس سفر میں ملی، وہ اسے مکمل طور پہ سمجھ گیا، مجھ سے بھی زیادہ اچھے انداز میں، جو میں نے خود محسوس کی تھی اور بالکل اچانک ہی، اس نے الفرڈ ڈی موزے کے کچھ اشعار پڑھے۔ ایک ناقابل بیان جذبے کے زیر اثر، مجھے اپنا دم گھٹا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے ایسا دکھائی دیا جیسے کہ سارے پہاڑ، جھیل، چاندنی، سب کچھ ان تمام ناقابل بیان خوبصورتی کے بارے مجھ سے گا رہی تھیں۔

”اور ایسا ہی ہوا، مجھے نہیں معلوم کیسے، مجھے نہیں معلوم کیوں، ایک قسم کے ہذیان میں ہی سب کچھ ہو گیا اور اس کے لیے۔ میں نے اسے دوبارہ اس کے رخصت کی صبح تک نہیں دیکھا۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ دیا!“

اور اپنی بہن کی بانھوں میں ڈوبتے ہوئے، میڈم لیٹور آہوں میں ڈوب گئی جو کہ بعد میں چیخوں میں بدل گئی۔

پھر میڈم رویر نے سنجیدہ اور ٹھہری آواز میں، بہت نرمی سے اسے کہا:

”دیکھو بہن، اکثر اوقات یہ مرد نہیں ہوتا جس سے ہم محبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں لیکن یہ بذات خود محبت ہوتی ہے۔ اور تمہاری حقیقی محبوب، اس رات کو چاندنی تھی۔“

☆☆☆☆

دیزی ال امیر
انگریزی سے ترجمہ: **اعظم ملک**

ڈاکٹر کی پرچی

اس نے دوائی والے سے ٹرینکولائزر مانگا۔ اور دوائی والے نے پوچھا کہ کیا اس کے پاس ڈاکٹر کی پرچی ہے۔ اس سوال سے وہ چونک گئی کیوں کہ وہ نیند کی گولیاں نہیں مانگ رہی تھی۔ دوائی والا سمجھ گیا کہ اسے کیا چاہیے۔ لیکن اس نے کہا، ''ڈاکٹر کی لکھی ہوئی پرچی ٹرینکولائزر کے لیے بھی ضروری تھی۔''

اس نے عرض کیا کہ ٹرینکولائزر سے نقصان نہیں ہو سکتا ہے اور وہ ان کا استعمال کر چکی ہے۔ دوائی والے نے کہا کہ سوال یہ نہیں ہے کہ آپ استعمال کر چکی ہیں۔ اس میں خطرہ بھی ہے۔

اس نے بات کاٹتے ہوئے دوائی والے سے کہا، ''کیا آپ کا مطلب خودکشی سے ہے؟''

''بالکل ویسا نہیں لیکن خطرہ ہوتا ہے۔'' دوائی والے نے جواب دیا۔

اس نے پوچھا، آپ کے پاس کتنی طرح کے ٹرینکولائزر ہوں گے۔ دوائی والے نے نام بتایا اور کہا کہ میرے پاس صرف ایک قسم کا ہے۔ یہ ٹرینکولائزر بہت ہلکا تھا۔ شاید اتنا کہ اس سے اس کا بلند فشارِ خون بھی ست نہ ہوتا۔ پھر بھی وہ فکرمند تھا کہ لوگ اس کے استعمال سے خود کو مار سکتے ہیں۔

عورت نے پوچھا کہ کیا آپ کو یقین ہے کہ کوئی ان ادویات سے خودکشی کرے گا۔ اسے سینکڑوں گولیاں کھانا پڑیں گی۔ مطلب کہ کئی درجن شیشیاں۔ جنھیں نگلنے میں کئی گھنٹے لگ جائیں گے اور کافی مقدار میں پانی کی ضرورت ہوگی۔ ڈھیر سارا پانی پیٹ میں گڑبڑ پیدا کرے گا۔ اور اسے نگلنے میں طویل وقت لگے گا، جس سے خودکشی پر نظرِ ثانی کا اسے موقع مل جائے گا۔ شخص اپنے فیصلے پر سوچنا چاہے گا۔ چوں کہ گولیوں کا اثر ہونے میں وقت لگے گا جب کہ شخص اس زندگی سے جلد ہی چھٹکارا چاہتا تھا۔ اس طرح کوئی خود کو کبھی بھی بچا سکتا ہے لیکن وہ زندگی میں واپس نہیں لوٹ سکے گا۔ کسی کو خودکشی کی وجوہات پر سوچنے کے بعد لگے گا کہ مرنے کے بارے میں سوچنے کے بجائے مر جانے کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور کوئی دوسرے موقع کے بارے میں سوچ سکتا ہے اور مسائل سے نپٹ سکتا ہے۔

جیسے ہی اس پر دوا کا اثر شروع ہوا تو دل میں اپنے بچاؤ کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں بھی سوچوں گی کہ میں نے غلطی کر دی۔ زندگی بہت غالب ہے۔ میں مدد کے لیے پکاروں گی اور خود کو قریبی کھڑکی یا دروازے کی طرف اس لیے لے جاؤں گی تا کہ چلا سکوں۔ لوگ سنیں گے۔ کوئی ہسپتال میں میری آنکھ کھولے گا اور پیٹ

دبایا جا رہا ہوگا اور ہاتھوں میں نلکیاں لگی ہوں گی اور چاروں طرف دوست کھڑے ہوں گے۔ کوئی پچھتائے گا اور زندگی بالکل موت کے دہانے سے لوٹ کر خوب صورت لگے گی۔ اس طرح آپ نے دیکھا کہ ایسے ٹرینکولائزر خودکشی کے قابل نہیں ہوتے۔

دوائی والے نے کہا، ”آپ جیسی عقل مند عورت کے بارے میں ایسی بدگمانی کون پالتا ہے۔ مجھے ایسا کوئی تعلق نہیں لگ رہا ہے۔“

اس نے کہا، ”آپ کسی خطرے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔“ دوائی والے نے ایک شیشی گولیاں اس کو دے دی۔ اس نے، ”شکریہ“ کہا اور چلی گئی۔

دوسری دکان پر اسے پوری بات دہرانے کی ضرورت پڑی۔ تیسری دکان پر اسے پوری بات کہنے سے پہلے گولیوں کی شیشی مل گئی۔ چوتھی پر چند جملے کافی تھے اور اسی طرح پانچویں، چھٹی اور اگلی دکانوں پر بھی۔

اخبارات میں خبر تھی کہ ایک عورت بستر میں مردہ پائی گئی۔ اس کے پاس نیند کی گولیوں کی خالی پڑی شیشیاں تھیں اور ایک خودنوشت رقعہ بھی۔ ”اس حالت تک میں بغیر کسی کے مشورہ کے پہنچی۔ لیکن زندگی نے مجھے کبھی نہیں سمجھا۔ کافی سوچنے کے بعد کہ زندگی اور مجھ میں دُوری اتنے وقت تک نہیں ہو سکتی۔ میں نے آخر فیصلہ کیا۔ زندگی کے اختتام کا خیال میرا اکیلی کا ہے۔“

جب لوگوں نے خبر پڑھی اور مسکراتی ہوئی تصویر دیکھی تو غم سے انھوں نے سر پکڑ لیا۔ کسی نے کہا، ”بیچاری! اس نے خود کو مایوسی کے لمحات میں مار لیا۔“ کسی اور نے کہا، ”ایسا لگتا ہے کہ اس نے جس سے محبت کی، وہ وفادار نہیں تھا۔“ ماہرین نفسیات نے تجزیہ کیا کہ خودکشی کا یہ فیصلہ پوری طرح ایک منظم فیصلہ تھا۔ دوائی بیچنے والوں نے اخبار میں تصویر پہچانی اور اس خاتون کے ساتھ ہوئی بات چیت کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی۔

اس کی ماں روتے ہوئے کہتی رہی کہ ہم نے ہر ممکن مدد کی کوشش کی۔

خودکشی کے ان کہے بھید کے بارے میں انھیں پتہ نہیں تھا۔ پھر بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ”اس نے زندگی سے کتنی زیادہ محبت کی!“

دیزی ال امیر عراق کی مشہور مصنفہ ہیں۔ وہ عراق کے شہر بسرا میں 1935 میں پیدا ہوئیں۔ بغداد کے ٹیچرز ٹریننگ کالج سے بیچلر ڈگری لینے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے کیمبرج چلی گئیں۔ وہ کئی برس تک عراق سے باہر رہی ہیں۔ خاص طور پر ایک عرصہ تک لبنان کے شہر بیروت میں عراقی سفارت خانے میں سیکرٹری کے فرائض انجام دیتی رہیں۔ بعد ازاں وہ اسسٹنٹ پریس اتاشی مقرر ہوئیں۔ وہ عراقی کلچرل سینٹر کی ڈائریکٹر بھی رہیں۔ ان کی کہانیوں میں اجاڑپن ہے۔ ”ڈاکٹر کی پرچی“ کہانی 1994 میں شائع ہونے والے ان کے مشہور مجموعہ ”دی ویٹنگ لسٹ“ سے لی گئی ہے۔

دِینو بوتزاتی

انگریزی سے ترجمہ: خالد فرہاد

سات قاصد

جب سے میں اپنے باپ کی سلطنت کی سیاحت کرنے نکلا ہوں، روز بہ روز پایہ تخت سے دُور ہی دُور ہوتا جا رہا ہوں اور میرے پاس اطلاعات کی آمد میں کمی واقع ہوتی جا رہی ہے ۔

میں جب اس سفر پر روانہ ہوا، تب محض تیس سال کا تھا اور آٹھ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں ۔ ٹھیک ٹھیک کہوں تو آٹھ سال، چھ مہینے اور پندرہ دنوں سے مسلسل سفر میں ہوں ۔ جب میں روانہ ہوا تو سوچا تھا کہ کچھ ہی ہفتوں میں آسانی سے سرحد پر پہنچ جاؤں گا، مگر مجھے نئے نئے لوگ ملتے جا رہے ہیں، نئے دیہاتوں اور علاقوں کا پتہ لگتا جا رہا ہے اور ہر کہیں میری زبان بولنے والے، میری تابعداری کا دعویٰ کرنے والے لوگ ہیں ۔

مجھے بعض اوقات شبہ ہوتا ہے، میرا قطب نُما پاگل ہو گیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم جنوب کی طرف بڑھ رہے ہیں، لیکن دراصل ہم دائرے میں چکر لگائے جا رہے ہیں، اور حقیقت میں پایہ تخت سے ہمارا فاصلہ بڑھ ہی نہیں رہا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم مُلک کی سرحد پر نہیں پہنچ پا رہے ۔

لیکن اکثر یہ خیال بھی مجھے ستاتا ہے کہ شاید سرحدیں ہیں ہی نہیں، یہ سلطنت بے حد وسیع و عریض ہے ۔ اور اس طویل مسافت کے باوجود میں کبھی سرحد پر پہنچ ہی نہیں سکوں گا ۔

جب میں نے سفر آغاز کیا، تب میں تیس سال کا تھا اور شاید تاخیر ہو گئی تھی ۔ میرے دوستوں حتیٰ کہ میرے خاندان والوں نے بھی میرے منصوبے کا مذاق اڑایا، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ میں اپنی زندگی کے بہترین سال برباد کر رہا ہوں ۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف چند وفادار دوست ہی میرے ساتھ چلنے کو تیار ہوئے ۔

بے فکری کے باوجود ۔ جتنا اب ہوں اس سے کہیں زیادہ لاپرواہ ہوتے ہوئے بھی میرا اس سفر میں اپنے عزیز و اقارب سے رابطہ رکھنے کا ارادہ تھا ۔ اور اس لیے میں نے اپنے محافظوں میں سے بہترین سات سواروں کو قاصد چُنا ۔

اپنی نادانی کے سبب میں نے سوچا تھا، سات قاصد تو بہت زیادہ ہیں ۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا

گیا، مجھے محسوس ہوا کہ سات بہت زیادہ نہیں ہیں، بلکہ مضحکہ خیز حد تک کم ہیں۔ ویسے ان میں سے کوئی بھی کبھی بیمار نہیں پڑا ہے، نہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں پکڑا گیا ہے، نہ کسی کے گھوڑے نے جواب دیا ہے۔ ساتوں نے ایسے اعتماد اور لگن کے ساتھ میری خدمت کی ہے کہ اس کا مکمل بدلہ دینا میرے لیے کٹھن ہوگا۔

شناخت میں آسانی کے لیے میں نے انھیں حروفِ تہجی کے لحاظ سے نئے نام دیے: الساندرو، بارتولمیو، کائیو، ڈومنیکو، عطورہ، فِڈریکو اور گریگوری۔

گھر سے دُور رہنے کا مجھے بالکل تجربہ نہیں تھا، اس لیے میں نے پہلے قاصد الساندرو کو سفر کے دوسرے دِن شام کو ہی گھر روانہ کر دیا۔ تب تک ہم لگ بھگ اسّی کوس کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ تا کہ خبروں کا سلسلہ چلتا رہے، میں نے اگلی شام کو دوسرا قاصد بھی روانہ کر دیا۔ پھر تیسرا، پھر چوتھا اور سفر کی آٹھویں شام کو گریگوری بھی چلا گیا۔ پہلا قاصد ابھی پایہ تخت سے واپس نہیں آیا تھا۔

دسویں دن جب ہم ایک ویران وادی میں رات کا پڑاؤ ڈالنے کی تیاری میں تھے، الساندرو واپس ہم سے آن ملا۔ اس نے بتایا کہ جتنی امید تھی اس سے کہیں دھیمی رفتار میں اسے سفر کرنا پڑا۔ میں نے تو سوچا تھا، چوں کہ وہ اکیلا ہی جا رہا ہے اس لیے ہمیں جتنا وقت لگا، اس سے نصف میں ہی وہ یہ مسافت طے کر لے گا۔ لیکن حقیقت میں وہ ہماری توقع سے صرف ڈیڑھ گنا فاصلہ روزانہ طے کر پایا تھا۔ ہم چالیس کوس چلتے تھے اور وہ ساٹھ کوس، اس سے زیادہ نہیں۔

یہی بات دوسروں کے ساتھ بھی ہوئی۔ بارتولمیو ہمارے سفر کی تیسری شام پایہ تخت کو روانہ ہوا اور دو ہفتے بعد واپس آیا۔ کائیو چوتھے دن گیا اور بیسویں دن لوٹا۔ میں جلدی ہی سمجھ گیا کہ ہر ایک قاصد کے لوٹنے کے دن کا حساب لگانے کے لیے اس کی روانگی کا سفر شروع ہونے کے دن کو پانچ سے ضرب دینا ہوگی۔

چوں کہ ہم پایہ تخت سے دُور ہوتے جا رہے تھے، قاصدوں کو بھی زیادہ تر لمبا سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ پچاس دن بعد، قاصدوں کے ورود میں نمایاں وقفہ رہنے لگا۔ جب کہ شروع میں ہر پانچویں دن ایک قاصد ہمارے قافلے میں آ پہنچتا تھا، اب پچیس دن کا فرق رہنے لگا تھا۔ اس وجہ سے اپنے شہر کی خبریں نایاب ہوتی جا رہی تھی۔ ہفتے بیت جاتے تھے بغیر اطلاعات کے۔

سفر کرتے کرتے چھ مہینے ہو گئے۔ اب تک ہم فسانی پہاڑی سلسلہ پار کر چکے تھے۔ قاصدوں کی آمد کے درمیان پورے چار مہینے کا فرق رہنے لگا۔ اب وہ مجھے بہت پرانی خبریں لا کر دے رہے تھے۔ جو خط وہ میرے ہاتھ پر لا کر رکھتے، مڑے تڑے ہوتے، ان کا کاغذ پیلا پڑ چکا ہوتا، کیوں کہ قاصدوں کو اوس بھری

راتوں میں کھلے آسمان تلے سونا پڑتا تھا۔

ہم اب بھی سفر کیے جا رہے تھے۔ میں بیکار ہی خود کو باور کرواتا تھا کہ میرے سر پر سے جو بادل گزر رہے ہیں، وہ میرے بچپن کے دنوں کے بادل ہیں، دُور کے قصبے پر ٹھہرا ہوا آسمان میرے سر پر چھائے نیلے آسمان سے مختلف نہیں ہے، ماحول وہی ہے، ہوا کا جھونکا وہی ہے، پرندوں کے چہچہے وہی ہیں۔ مگر حقیقت میں بادل، آسمان، ماحول، ہوا، پرندے اب مجھے نئے لگ رہے تھے اور میں خود کو اجنبی محسوس کر رہا تھا۔

چلتے جائیں، بڑھتے رہیں! راہ میں ملنے والے خانہ بدوش مجھ سے کہتے کہ سرحد دُور نہیں ہے۔ میں اپنے آدمیوں کو بنا رُکے چلتے رہنے کی ترغیب دیتا، تا کہ مایوسی کے بول ان کے لبوں پر آنے سے قبل ہی مر جائیں۔ چار سال گزر چکے تھے۔ اوہ! حد سے زیادہ تھکان! عجیب بات تھی پایہ تخت، میرا گھر، میرے والد، سب مجھے بہت بعید محسوس ہوتے تھے، جیسے مجھے یقین ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان کا اب بھی وجود ہے۔ ہر ایک قاصد کی متواتر حاضری کے درمیان بیس مہینوں کی تنہائی اور چُپ کا وقفہ رہتا تھا۔ وہ مجھے عجیب سے خط لا کر دیتے، پرانے اور پیلے پڑ چکے خط۔ جن میں بھولے بسرے نام، اجنبی محاورے اور سمجھ میں نہ آنے والے خیال ہوتے تھے۔ اور اگلے دن صرف رات بھر کے قیام کے بعد، جب ہم کوچ کرتے تو قاصد میرا خط لے کر مخالف سمت میں روانہ ہو جاتا تھا، کئی دن پہلے لکھا ہوا خط۔

ساڑھے آٹھ سال بیت چکے ہیں۔ میں آج شام اپنے خیمے میں اکیلا بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ ڈومنیکو داخل ہوا۔ بے تحاشہ تھکا ہوا ہونے کے باوجود بھی وہ مُسکرایا۔ پچھلے سات سال سے وہ بس ایک ہی کام کرتا آ رہا ہے میدانوں، جنگلوں اور ریگستانوں میں گھوڑا دوڑانا، نہ جانے درمیان میں کتنی بار سواری بدلنا اور خطوط کا پلندہ لا کر میرے ہاتھ میں رکھنا، جسے اب اتنی رات گئے کھولنے کی میری کوئی خواہش نہیں ہے۔ وہ آ کر بستر پر لیٹ گیا ہے، کیوں کہ کل صبح پو پھٹتے ہی اسے روانہ ہونا ہے۔

یہ اس کی آخری روانگی ہو گی۔ میں نے اپنی نوٹ بک میں حساب لگا کر دیکھ لیا ہے کہ اگر سب کچھ صحیح سلامت رہے، اگر اسی طرح ہی میں اپنا سفر جاری رکھوں اور وہ اپنا سفر، تو میں ڈومنیکو کو آئندہ چونتیس سال سے پیشتر نہیں دیکھ سکوں گا۔ تب میں بہتر سال کا ہوں گا۔ مگر میں خود کو بہت تھکا ماندہ محسوس کرنے لگا ہوں اور تب تک غالباً موت مجھے اپنی گرفت میں لے چکی ہو گی تو میں اسے پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔

چونتیس سال بعد (دراصل اس سے بھی پہلے، کافی پہلے) ڈومنیکو اچانک ہی میرے پڑاؤ کا دھواں دیکھے گا اور حیران ہو گا کہ شہزادے نے اس عرصے میں اتنا قلیل سفر طے کیا ہے۔ تب آج کی ہی طرح وفا شعار

قاصد، سالخوردہ پیلے پڑ چکے گزرے زمانے کی بے معنی خبروں سے بھرے ہوئے خط لیے میرے خیمے میں داخل ہوگا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ میں اپنے پلنگ پر بے حس وحرکت مرا ہوا پڑا ہوں اور میرے دائیں بائیں دو سپاہی مشعلیں تھامے کھڑے ہیں، وہ دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رک جائے گا۔

لیکن پھر بھی ڈومنیکو تم روانہ ہو جاؤ، اور مجھے سنگدلی کا الزام مت دینا۔ اس شہر کے لیے میرا آخری سلام لے جاؤ، جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ میرے اور اس دنیا کے درمیان تم ہی رابطے کی واحد کڑی ہو، وہ دنیا جو کبھی میری تھی۔ تازہ ترین خط بتاتے ہیں کہ وہاں بہت کچھ بدل گیا ہے؛ میرے والد صاحب وفات پا چکے ہیں، حکومت میرے سب سے بڑے بھائی کے ہاتھ آ گئی ہے، مجھے ہمیشہ کے لیے گمشدہ سمجھ لیا گیا ہے، اور جہاں پہلے شاہ بلوط کے درخت تھے، جن کے نیچے میں کھیلا کرتا تھا، وہاں اب پتھر کے سر بہ فلک مکان بنائے جا رہے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ میرا قدیم آبائی مسکن ہے۔

ڈومنیکو! اس کے ساتھ رابطے کی تم میری آخری کڑی ہو۔ پانچواں قاصد عطورہ، جو اگر خدا نے چاہا تو ایک سال اور آٹھ مہینوں بعد واپس آئے گا، دوبارہ روانہ نہیں ہو سکے گا۔ اس کے یہاں آ کر لوٹنے کے لیے وقت نہیں بچے گا۔ سو تمھارے بعد ڈومنیکو، بس سناٹا ہے! اگر میں نے سرحدیں کھوج نکالیں، تو اور بات ہے۔ مگر میں جتنی ہی طویل مسافت کرتا ہوں، اتنا ہی مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ سرحد ہے ہی نہیں۔

مجھے شک ہے کہ کسی سرحد کا وجود نہیں ہے، کم از کم اس معنی میں تو نہیں، جیسا ہم سمجھتے ہیں۔ میرا ارادہ روکنے والی کوئی دیوار نہیں ہے، نہ کوئی کھائی ہے، نہ کوئی پہاڑ۔ شاید میں حد پار کر جاؤں گا اور مجھے پتہ بھی نہیں چلے گا اور بے خبر آگے بڑھتا چلا جاؤں گا۔

اسی سبب میرا ارادہ ہے کہ مستقبل میں جب عطورہ اور دوسرے قاصد لوٹیں گے تو وہ پایہ تخت کو واپس روانہ نہیں ہوں گے، بلکہ اُلٹی سمت چل پڑیں گے اور مجھ سے آگے نکل جائیں گے، تاکہ مجھے پیشگی معلوم ہو سکے کہ آگے کیا ہے۔

ادھر کچھ عرصے سے شام کو ایک نئی پریشانی مجھے دبوچ لیتی ہے۔ یہ ان شادمانیوں کی حسرت نہیں ہے، جنھیں میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں، جیسی کہ سفر کے شروعاتی دنوں میں ہوا کرتی تھی۔ بلکہ یہ اُن اجنبی سرزمینوں کو دریافت کرنے کی بیتابی ہے، جن کی طرف میں پیش قدمی کر رہا ہوں۔

میں دیکھ رہا ہوں، اور اب تک میں نے یہ بات کسی سے بھی نہیں کہی ہے کہ بہ تدریج اس سفر کے نا

ممکن اختتام کی طرف بڑھتے ہوئے ہر دن گزرنے کے ساتھ، ایک منفرد روشنی آسمان میں چمکنے لگی ہے۔ ایسی روشنی، جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے، خوابوں میں بھی نہیں۔ جن جنگلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کو ہم پار کرتے ہیں، ان کی پرچھائیاں مجھے نیا وجود اختیار کرتی دکھائی دیتی ہیں، اور ہوا نہ جانے کن اندیشوں سے بوجھل ہو اٹھی ہے۔

کل صبح نئی امید مجھے ان پہاڑوں کی سمت میں اور آگے لے جائے گی، پہاڑ جو انجانے ہیں اور ابھی رات کی پرچھائیوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ایک بار پھر میں اپنا خیمہ باندھ لوں گا، جب کہ دُور دراز کے ایک شہر کے لیے میرا بے مطلب پیغام لیے ڈومنیکو اُفق کے اُس پار غائب ہو جائے گا۔

☆☆☆☆

نجم الدین احمد

تعارف

کازُواَو اِشیگو رَو (Kazuo Ishiguro)

‘‘وہ بے حد پختہ لکھاری ہیں۔’’ یہ الفاظ سال ۲۰۱۷ء کے لیے نوبیل انعام کا اعلان ہونے کے بعد سویڈش اکادمی کی مستقل سیکریٹری سارا ڈینیئس کے، کازُواَو اِشیگو رو کے بارے میں ہیں۔ سارا ڈینیئس نے کازُواَو اِشیگو رو کی لکھتوں کے اُسلوب کو جین آسٹن اور فرانز کافکا کے اُسلوب کا ادغام قرار دیتے ہُوئے کہا: ‘‘لیکن اِس ادغام میں آپ تھوڑا سا مارسیل پراؤسٹ کے اُسلوب کو بھی شامل کرلیں تب ہی آپ جوش پاتے ہیں۔’’ جب کہ اِس سے قبل سویڈش اکادمی کی اکتوبر ۵، ۲۰۱۷ء کی جانب سے کازُواَو اِشیگو رو کے نوبیل انعام کے حق دار پانے کی خبر کے اجرا میں مؤقف اختیار کیا گیا: ‘‘جس نے، عظیم جذباتی قوت کے حامل ناولوں میں، ہماری تخیلاتی حِس کی اتھاہ گہرائی اور دُنیا کے ساتھ ربط کو دریافت کیا ہے۔’’

نوبیل انعام ملنے کا اعلان سننے کے بعد گارڈین اخبار کو انٹرویو دیتے ہُوئے جاپانی نژاد برطانوی مصنف کازُواَو اِشیگو رو کا تاثر ‘‘بہ یک وقت عزت افزائی اور کامل حیرت زدگی’’ کا تھا کیوں کہ ‘‘میں نے اپنے نوبیل انعام پانے کی خبر کو جھوٹی خبر سمجھا تھا۔ میں نے اِسے فریب سمجھا تھا۔’’ اُن کا مزید کہنا تھا۔ ‘‘یہ بہت بڑے اعزاز کی بات ہے، خاص طور پر اِس لیے کہ میں اُن عظیم لکھاریوں کے نقشِ قدم پر ہوں جو زندہ ہیں، پس یہ عظیم اعزاز ہے۔ دُنیا بے حد غیر یقینی وقت سے گذر رہی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ تمام نوبیل انعامات دُنیا میں مثبت تبدیلی کا باعث بنیں گے کہ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ میرے لیے یہ بھی باعثِ اعزاز ہوگا اگر میں اِس غیر یقینی کی کیفیت میں کسی طور کوئی مثبت کردار ادا کر سکا۔’’

کازُواَو اِشیگو رو جاپان کے علاقے ناگاساکی میں ۸ نومبر ۱۹۵۴ء کو پیدا ہُوئے۔ جب وہ پانچ برس کے تھے تو اُن کا خاندان ۱۹۶۰ء میں انگلستان چلا آیا جس کے بعد وہ اپنے وطن بالغ ہونے کے بعد گئے۔ اُس کے خاندان نے انگلستان کے علاقے گلڈفورڈ، سرے میں قیام کیا۔ اِشیگو رو نے ابتدائی تعلیم سرے کے سٹوکلن پرائمری سکول اور ووکنگ کاؤنٹی گرامر سکول سے حاصل کی۔ سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اِشیگو رو کی تعلیمی سرگرمیوں میں ایک سال کا وقفہ آیا جس کے دوران اُنھوں نے امریکا اور کینیڈا کا دورہ کیا اور ایک مقالہ تحریر کیا۔ اِشیگو رو نے ۱۹۷۴ء میں کینٹربُوری کی یونیورسٹی آف کینٹ میں دوبارہ تعلیم کا آغاز کیا اور ۱۹۷۸ء میں انگریزی اور فلسفے میں گریجوایشن کی۔ ایک بار پھر اُن کے تعلیمی سلسلے میں تعطل آیا جس کے دوران وہ افسانوی ادب تخلیق کرتے رہے اور پھر اُنھوں نے تخلیقی لکھت کے مطالعے کے لیے یونیورسٹی آف ایسٹ اینگلیا کا رُخ کیا جہاں سے ۱۹۸۰ء میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔

کازُواو اِشیگُو رو ۱۹۸۲ء میں اپنی پہلی کتاب ''پہاڑیوں کا پھیکا نظارہ'' (A Pale View of Hills) کی اشاعت ہی سے کل وقتی اور انگریزی زبان کے دُنیا بھر میں بے حد معروف مصنف ہیں۔ اُن کا یہ پہلا ناول اور اِس کے بعد ۱۹۸۶ء میں آنے والا ناول ''تیرتی ہُوئی دُنیا کا ایک فن کار'' (An Artist of the Floating World) دونوں جنگِ عظیم دوم کے چند برس بعد کے ناگاساکی کے منظر نامے میں ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ اِشیگُو رو کے ناولوں کے موضوعات نئے نہیں ہیں اور پہلے ہی سے موجود ہیں: یادیں، وقت اور خُوش فہمی۔ یہ چیزیں خاص طور پر ۱۹۸۹ء میں منصۂ شہود پر آنے والے اُن کے ناول ''وقت کی باقیات'' (The Remains of the Day) میں تو بے حد نمایاں ہے، جس پر فلم بھی بن چکی ہے۔ اِس ناول کو ۱۹۸۹ء کے مین بُکر پرائز سے بھی نوازا گیا ہے۔

کازُواو اِشیگُو رو کی لکھتوں کی خصوصیت احتیاط سے محدود کیے گئے ذریعۂ اظہار اور واقعات کو از خُود ظہور پذیر ہونے دینا ہے۔ بایں ہمہ، اُن کی تازہ کار افسانوی تحریریں تو عمدہ خصوصیات کی حامل ہیں۔ ۲۰۰۵ء کے خوف و دہشت بھری تخیلاتی دُنیا والے ناول ''مجھے کبھی جانے مت دینا'' (Never Let Me Go) اِشیگُو رو اپنی تحریر میں سائنس فکشن کی ایک سرد زیریں رَو متعارف کرواتے ہیں۔ اِس ناول کو ''ٹائم'' نے نہ صرف ۲۰۰۵ء کا بہترین ناول قرار دیا بَل کہ بعد ازاں یہ ناول ۱۹۲۳ء تا ۲۰۰۵ء تک کے ۱۰۰ بہترین ناولوں میں بھی شامل ہُوا۔ اِس ناول میں بھی، دیگر بے شمار ناولوں کے مانند، ہمیں موسیقی کے اثرات ملتے ہیں۔ اِس کی ایک عمدہ مثال ۲۰۰۹ء کا اُن کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ ''شبینہ: موسیقی اور رات پڑنے کی پانچ کہانیاں'' (Nocturnes: Five Stories of Music andNightfall) میں موسیقی کرداروں کے مابین تعلقات میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ ۲۰۱۵ء میں چھپنے والے ناول ''مدفون دیوہیکل'' (The Burried Giant) میں ایک جوڑا اپنے جوان بیٹے سے، جسے اُنھوں نے برسوں سے نہیں دیکھا، ملنے کی آس پر ایک متروک سڑک پر سفر کرتا ہے۔ یہ ناول اِس امر کو کھوجتا ہے کہ کس طرح یادداشت تغافل، زمانۂ حال کی تاریخ اور حقیقت کی تخیل پسندی کا شکار ہوتی ہے۔

اِن آٹھ کتابوں کے علاوہ کازُواو اِشیگُو رو نے فلموں اور ٹیلی ویژن کے سکرپٹ بھی لکھے ہیں۔ جن میں آرتھر جے میسن کا خاکہ (A Profile of Arthur J. Mason)، گورمے (The Gourmet)، دُنیا کی افسردہ ترین موسیقی (The Saddest Music in the World)، اور سفید فام نواب بیگم (The White Countess) شامل ہیں۔ اِس کے علاوہ، ''شبینہ: موسیقی اور رات پڑنے کی پانچ کہانیاں'' سے ہٹ کر بھی کازُواو اِشیگُو رو کی کچھ کہانیاں مختلف جرائد اور کہانیوں کے مختلف انتخابوں میں شامل ہُوئی ہیں۔ اِشیگُو رو نے جاز گلوکار سٹیسی کینٹ (Stacey Kent) کے لیے بے شمار گیت بھی لکھے ہیں جو ''صبح کی گاڑی پر ناشتہ'' (Breakfast on the Morning Tram)، ''محفلِ موسیقی میں خواب دیکھنے والا'' (Dreamer in Concert)، ''بدلتی ہُوئی روشنیاں'' (The Changing Lights)، ''مجھے پتا ہے میں خواب دیکھتا ہوں'' (I Know I Dream)، ''عشقِ مکرر'' (In Love Again)، ''وہ اُسے مجھ سے چھین نہیں سکتے'' (They Can't Take That Away from Me) اور ''صحرائی جزیرے کے گیت'' (Desert island Discs) نام کے البموں سے ۲۰۰۲ء سے ۲۰۱۳ء کے دوران منظرِ عام پر آئے۔

کازُواَو اِشیگُورَو

ترجمہ: نجم الدین احمد

خاندانی توشہ

فیوگو مچھلی جاپان میں بحرالکاہل کے ساحل پر پائی جاتی ہے۔ اِس مچھلی کی میرے لیے ایک خاص اہمیت اِس بِنا پر تھی کہ میری ماں کی موت اِسی مچھلی کو کھانے سے ہوئی تھی۔ اِس مچھلی کے جنسی غدودوں کی بہ آسانی پھٹ جانے والی دو تھیلیوں میں زہر ہوتا ہے۔ مچھلی تیار کرتے وقت اُن تھیلیوں کو چوکسی سے ہٹایا جاتا ہے کیوں کہ ذرا سی بے احتیاطی سے زہر رِس کر مچھلی کی وریدوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ بتانا آسان نہیں ہوتا کہ یہ عمل کامیابی سے ہم کنار ہُوا ہے یا نہیں۔ ثبوت، جیسا کہ ہونا چاہیے، محض کھانے کے بعد ہی ملا کرتا ہے۔

فیوگو کا زہر بے حد خطرناک اور مہلک ہوتا ہے۔ اگر مچھلی کو رات کے کھانے میں کھایا گیا ہے تو اِس کا شکار نیند کے دوران میں تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ چند گھنٹے کرب وافیّت کے عالم میں تڑپنے کے بعد صبح تک مر چکا ہوتا ہے۔ یہ مچھلی جنگ کے بعد جاپان میں بے حد مقبول خوراک بنی۔ بالآخر اِس کے استعمال پر سخت پابندیاں عاید کرنا پڑیں۔ سب سے خطرناک بات اِس مچھلی کی چیر پھاڑ اور آلائشیں مطبخ میں نکالنے کے بعد ہم سایوں اور دوستوں کو دعوت اُڑانے کے لیے بلانا تھا۔

میری ماں کی وفات کے وقت میں کیلی فورنیا میں قیام پذیر تھا۔ اُس زمانے میں اپنے والدین سے میرے تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ نتیجتاً مجھے دو سال بعد ٹوکیو واپسی تک اُن کی موت کے حالات کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا۔ عام طور پر میری ماں فیوگو کھانے سے انکار کر دیا کرتی تھیں لیکن اُس خاص موقع پر اُنھوں نے رعایت برتی کیوں کہ اُنھیں اُن کی ہم سکول ایک پُرانی دوست نے مدعو کیا تھا، جنھیں وہ ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ مجھے یہ تفصیلات میرے والد نے ہوائی اڈّے سے کاماکورا ضلع میں واقع اُن کے گھر جاتے ہوئے بتائیں۔ جب ہم گھر پہنچے تو خزاں رسیدہ دِن لگ بھگ اپنے اختتام کو پہنچنے والا تھا۔

”کیا تم نے جہاز پر کچھ کھایا ہے؟“ میرے والد مستفسار ہُوئے۔ ہم اُن کے چائے والے کمرے میں چٹائی کے فرش پر بیٹھے تھے۔

”اُنھوں نے مجھے ایک ہلکا پھلکا کھانا دیا تھا۔“

”تم یقیناً بھوکے ہو گے۔ بس جُوں ہی کیکو کو آتی ہے ہم کھانا کھا لیں گے۔“

اپنے استخوانی جبڑے اور خوف ناک حد تک سیاہ بھنوؤں سے میرا والد دہشت ناک دِکھائی دیتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کسی زمانے میں وہ چُو این لائی سے بے حد مشابہ ہو گا، گو اُسے اپنا ایسا موازنہ پسند نہیں آتا تھا، خاص طور پر رگوں میں خالص سامورائی خون دوڑنے کی وجہ سے۔ اُن کی عمومی موجودگی ایسی نہیں تھی جس میں بات چیت کا حوصلہ ملتا؛ نہ ہی اُن کی کوئی بات حوصلہ افزا ہوتی تھی کہ ہر جملہ اختتامی جملہ لگتا تھا۔ دراصل، اُس سہ پہر اُن کے مقابل بیٹھے ہُوئے مجھے اپنے لڑکپن کا وہ واقعہ بار بار یاد آتا رہا جب اُنھوں نے میرے سر پر متعدّد بار یُوں چپتیں لگائی تھیں جیسے کوئی بڑھیا چٹاخ پٹاخ بول رہی ہو۔ میرے ہُوائی اڈّے پر آمد سے لے کر اب تک ہماری گفتگو میں ناگزیر طور پر طویل وقفے آتے رہے تھے۔

”مجھے فرم کے بارے میں جان کر دُکھ ہُوا۔“ جب ہم دونوں میں کچھ دیر تک کسی نے کوئی بات نہیں کی تو میں بولا۔ اُنھوں نے متانت سے سر ہلایا۔

”درحقیقت، کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔“ وہ بولے۔ ”کاروبار کی تباہی کے بعد وتانابے نے خُودکشی کر لی تھی۔ وہ بے توقیری سے جینا نہیں چاہتا تھا۔“

”اوہ۔“

”ہم سترہ برس سے شریکِ کار تھے۔ وہ بااصول اور باوقار شخص تھا۔ میں اُس کی بے حد عزت کرتا تھا۔“

”کیا آپ دوبارہ کاروبار کریں گے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”میں — ریٹائرمنٹ پر ہوں۔ میں اِتنا بُوڑھا ہو گیا ہوں کہ اب اپنے آپ کو نئے بکھیڑوں میں اُلجھا نہیں سکتا۔ آج کل کاروبار بہت مختلف ہو گیا ہے۔ بدیسیوں سے معاملت کرنا پڑتی ہے۔ اُن کے کہے پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی ہم یہاں تک کیسے پہنچ گئے۔ وتانابے بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔“ اُنھوں نے آہ بھری۔ ”ایک عمدہ شخص۔ بااصول شخص۔“

چائے کے کمرے سے باہر کا باغیچہ دِکھائی دیتا تھا۔ میں جہاں بیٹھا تھا وہاں سے میں اُس قدیم کنویں کو دیکھ سکتا تھا جو مجھے بچپن میں خوف زدہ رکھتا تھا۔ اب گھنے پتوں سے اُس کی محض جھلک دِکھائی دیتی تھی۔ سُورج مزید نیچے جھک گیا تھا اور باغیچے میں گہرے سائے اُتر آئے تھے۔

”بہر حال، مجھے خُوشی ہے کہ تم پلٹ آئے۔“ میرے والد نے کہا۔ ”مجھے اُمید ہے کہ تمھارا قیام مختصر نہیں ہو گا۔“

”میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میرا اِرادہ کیا ہے۔“

”میں ماضی بھلانے کے لیے تیار ہوں۔ تمھاری ماں بھی تمھاری واپسی پر تمھیں خوش آمدید کہنے پر تیار تھی– تمھارے روّیے سے پریشان تھی۔“

”میرے لیے آپ کی ہم دردی قابلِ تحسین ہے۔ لیکن جیسا میں نے کہا کہ میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میرا کیا اِرادہ ہے۔“

”مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تمھارے ذہن میں کوئی برے عزائم نہیں تھے۔“ میرے والد نے بات جاری رکھی۔ ”بس تم بھی مخصوص جذبات میں بہہ گئے تھے۔ بہت سے دُوسروں کی طرح۔“

”جیسا کہ آپ نے کہا، شاید اِسے بُھلا ہی دینا چاہیے۔“

”جیسے تمھاری مرضی۔ اور چائے؟“

عین اُسی لمحے گھر میں سے ایک لڑکی کی آواز گونجی۔

”بالآخر۔“ میرے والد اُٹھے۔ ”کیکو آ ہی گئی۔“

ہمارے برسوں کے اختلافات کے باوجود، میں اور میری بہن ہمیشہ ایک دُوسرے کے قریب رہے تھے۔ لگتا تھا مجھے دوبارہ دیکھنا اُسے بے حد ہیجان زدہ کر گیا اور وہ کچھ دیر تک سوائے کھسیانی سی ہنسی ہنسنے کے کچھ نہ کر پائی۔ لیکن جب میرے والد نے اُس سے اوساکا اور جامعہ کے بارے میں پُوچھنا شروع کی تو وہ کسی حد تک پُرسکون ہو گئی۔ اُس نے اُنھیں رسمی سے مختصر جواب دیے۔ جس کے بعد اُس نے مجھ سے کچھ سوالات دریافت کیے لیکن وہ ہراساں تھی کہ اُس کے سوالات سے ناپسندیدہ موضوعات کا رُخ نہ ہو جائے۔ تھوڑی دیر بعد، کیکو کی آمد سے قبل والی گفتگو میں زیادہ وقفے آ گئے۔ پھر میرے والد یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہُوئے: ”مجھے کھانے کی طرف دھیان دینا چاہیے۔ براہِ مہربانی مجھے ایسے معاملات نبھانے کی اجازت دو۔ کیکو تمھارا خیال رکھے گی۔“

اُن کے کمرے سے جانے کے بعد میری بہن نے واضح طور پر سکون کا سانس لیا۔ چند ہی منٹوں میں وہ اوساکا میں اپنے دوستوں اور جامعہ میں اپنی جماعت پر کُھل کر بات کر رہی تھی۔ پھر یکایک اُس نے فیصلہ کیا کہ ہمیں باغیچے میں چہل قدمی کرنا چاہیے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی برآمدے کی جانب چل دی۔ ہم نے برآمدے کی باڑ کے پاس پڑی تنکوں کی چپلیں پہنیں اور باغیچے میں داخل ہو گئے۔ دِن کا اُجالا کم و بیش ختم ہو چکا تھا۔

”میں پچھلے آدھ گھنٹے سے سگریٹ نوشی کے لیے مری جا رہی تھی۔“ اُس نے سگریٹ سلگاتے ہُوئے کہا۔

”تو تم سگریٹ نوشی کرتی ہی کیوں ہو؟“

اُس نے مڑ کر غضب سے گھر کی سمت دیکھا اور طیش سے دانت کچکچائے۔

”اوہ، اچھا۔“ میں بولا۔

”کیا تمھیں اندازہ ہے؟ اب میرا ایک محبوب بھی ہے۔“

”اوہ، اچھا؟“

”اب میں اِس سوچ بچار میں ہوں کہ مجھے اب کیا کرنا ہے۔ میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائی۔“

”کاملاً قابلِ فہم بات ہے۔“

”تمھیں پتا ہے، وہ امریکا جانے کا قصد کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں تعلیم مکمل کرتے ہی اُس کے ساتھ چلوں۔“

”اچھا۔ اور کیا تم امریکا جانا چاہتی ہو؟“

”اگر ہم گئے تو پہاڑ سرائی کے لیے جائیں گے۔“ رَیکو نے میرے منہ کے سامنے انگوٹھا لہرایا۔

”لوگ کہتے ہیں کہ یہ خطرناک ہے لیکن میں نے یہ کام اوساکا میں کیا ہے اور یہ عمدہ چیز ہے۔“

”اچھا۔ پھر تم کس چیز کے بارے میں بے یقینی کا شکار ہو؟“

ہم جھاڑیوں سے اَٹے ایک تنگ راستے پر چل رہے تھے جو ایک قدیمی کنویں پر ختم ہوتا تھا۔ ہمارے چلنے کے دوران رَیکو اپنے سگریٹ سے کے، دِکھاوے کے بلا وجہ گہرے کش لیتی رہی۔

”خوب۔ اب اوساکا میں میرے بہت سے دوست ہیں۔ میں وہاں رہنا چاہتی ہوں۔ ابھی میرا اُن سب کو چھوڑ کر جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اور سُو بچی— میں اُسے پسند کرتی ہوں لیکن میں اُس کے ہم راہ طویل وقت گزارنے کے بارے میں بے یقینی کا شکار ہوں۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟“

”اوہ، مکمل طور پر۔“

وہ دوبارہ کھسیانے انداز میں ہنسی اور پھر میرے آگے چلتی ہوئی کنویں تک جا پہنچی۔ ”تمھیں یاد ہے؟“ میں اُس کے قریب جا رہا تھا تو وہ بولی۔ ”ہم کیسے کہا کرتے تھے کہ یہ کنواں آسیبی ہے۔“

”ہاں، مجھے یاد ہے۔“

ہم دونوں نے اُس طرف متجسس نگاہوں سے دیکھا۔

”ماں مجھے ہمیشہ بتایا کرتی تھی کہ میں نے رات کو سبزیوں کی دُکان والی بڑھیا کو دیکھا ہے۔“ وہ بولی۔ ”لیکن میں نے کبھی اُن کا اعتبار نہیں کیا اور یہاں کبھی تنہا نہیں آئی۔“

”ماں مجھ سے بھی یہی کہا کرتی تھیں۔ انھوں نے تو مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ عورت نے خود بھوت بننے کا عمل کیا تھا۔ بظاہر وہ عورت اپنا راستہ مختصر کرنے کے لیے ہمارے باغیچے سے ہو کر جاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اُسے اِن دیواروں کو عبور کرنے میں دشواری پیش آتی ہو گی۔“

رکیکو نے کھی کھی کی۔ پھر اُس نے اپنی پشت کنویں کی جانب کرتے ہوئے باغیچے پر نظریں گاڑ دیں۔

”تمھیں پتا ہے کہ ماں نے کبھی تمھیں موردِ الزام نہیں ٹھیرایا۔“ اُس نے دِھیمی آواز میں کہا۔

میں چُپ رہا۔

”وہ مجھ سے سدا یہی کہتی رہیں کہ یہ اُن کا اور والد کا قصور تھا کہ تمھاری پرورش اچھے طور پر نہیں کر سکے۔ وہ مجھے بتایا کرتی تھیں کہ وہ میری پرورش کے معاملے میں کیسے محتاط رہے تھے اور اِسی لیے میں اتنی اچھی ہوں۔“

اُس نے اُوپر دیکھا اور اُس کے چہرے پر چڑانے والی شریر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”بے چاری ماں۔“ وہ بولی۔

”ہاں، بے چاری ماں۔“

”کیا تم کیلیفورنیا واپس جا رہے ہو؟“

”پتا نہیں۔ سوچنا پڑے گا۔“

”اُس کے۔۔ ساتھ کیا ہُوا؟ وِکی کے ساتھ؟“

”وہ سب ختم ہو گیا۔“ میں نے کہا۔ ”میرے لیے اب کیلی فورنیا میں کچھ زیادہ نہیں بچا۔“

”کیا تمھارے خیال میں مجھے وہاں جانا چاہیے؟“

”کیوں نہیں؟ مجھے نہیں پتا۔ غالباً تم یہ پسند کرو۔“ میں نے گھر کی سمت نظر دوڑائی۔ ”شاید ہمارے لیے بہتر ہو کہ جلد اندر لوٹ جائیں۔ ابا جی کو شاید کھانے کے لیے مدد کی ضرورت ہو۔“

لیکن میری بہن ایک بار پھر کنویں کے اندر جھانک رہی تھی۔ ”مجھے تو کوئی بھوت دِکھائی نہیں دے رہا۔“ اُس نے کہا۔ اُس کی آواز ہلکی سی گونجی۔

”کیا ابا جی اپنے کاروبار کے ختم ہونے پر کافی پریشان ہیں؟“

”پتا نہیں۔ تم کبھی ابا جی کے بارے میں بتا نہیں سکتے۔“ پھر وہ یکایک سیدھی ہو کر میری طرف مُڑی۔ ”کیا انھوں نے تمھیں بُوڑھے وتانابے کے بارے میں بتایا ہے؟ اُس نے کیا کِیا تھا؟“

“میں نے سنا ہے کہ اُس نے خودکشی کر لی تھی۔”

“خوب، محض اتنی سی بات نہیں تھی۔ وہ اپنے سارے خاندان کو اپنے ساتھ لے گیا تھا، اپنی بیوی اور دونوں کم سن بیٹیوں کو۔”

“اوہ، ہاں۔”

“اُن دونوں خُوب صُورت کم سن بیٹیوں کو۔ جب وہ لوگ سو رہے تھے تو اُس نے گیس کھول دی۔ پھر اُس نے گوشت کاٹنے والی چھری اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔”

“ہاں، ابا جی نے ابھی تھوڑی دیر قبل مجھے بتایا ہے کہ وتانابے کس قدر با اصول شخص تھے۔”

“پاگل۔” میری بہن واپس کنویں کی جانب مُڑی۔

“احتیاط سے۔ تم اندر گر سکتی ہو۔”

“مجھے تو کوئی بُھوت نظر نہیں آ رہا۔” وہ بولی۔ “تم مجھ سے ماضی میں ہمیشہ جھوٹ بولتے رہے ہو۔”

“لیکن میں نے یہ کبھی نہیں کہا وہ کنویں میں رہتا ہے۔”

“پھر وہ کہاں ہے؟”

ہم دونوں نے اِردگرد درختوں اور جھاڑیوں میں دیکھا۔ باغیچے میں روشنی بے حد مدہم ہو چکی تھی۔ بالآخر میں نے لگ بھگ دس گز کے فاصلے پر صاف قطعے کی طرف اشارہ کیا۔

“میں نے اُسے وہاں دیکھا تھا۔ بالکل وہیں پر۔”

ہم اُس قطعے کی طرف بڑھنے لگے۔

“کیسا دِکھتا تھا؟”

“میں اُسے اچھی طرح نہیں دیکھ پایا تھا۔ کافی تاریکی تھی۔”

“لیکن تم نے کچھ تو دیکھا ہو گا۔”

“وہ کوئی بُڑھیا تھی۔ وہ بس وہاں کھڑی مجھے دیکھے جا رہی تھی۔”

ہم اُس مقام کو تنویم زدہ کے مانند تکتے رہے۔

“وہ ایک سفید کیمونو پہنے ہُوئے تھی۔” میں نے کہا۔ “اُس کے کچھ بال منتشر تھے اور ہَوا میں لہرا رہے تھے۔”

کیکو نے اپنی کُہنی میرے بازو کے گرد حمایل کر دی۔

“اوہ، چپ ہو جاؤ۔ تم مجھے دوبارہ ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو۔”

اُس نے اپنی سگریٹ کا بچا ہُوا ٹکڑا پیر تلے مسلا۔ پھر تھوڑی دیر تک متذبذب حالت میں کھڑی رہی۔ اُس نے ٹھوکر مار کر ٹکڑے پر صنوبر کے کچھ پتے ڈالے اور اپنی کھسیانی ہنسی کی نمائش کی۔

’’آؤ دیکھیں کہ کھانا تیار ہُوا یا نہیں۔‘‘

ابا جی ہمیں مطبخ میں ملے۔ اُنھوں نے ہم پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور پھر اپنے کام میں جُت گئے۔

’’جب سے ابا جی نے اپنے کام خود کرنا شروع کیے ہیں وہ اچھے خاصے باورچی بن گئے ہیں۔‘‘ رُکیکو نے قہقہہ لگاتے ہُوئے کہا۔ اُنھوں نے گھوم کر میری بہن کو سرد مہری سے دیکھا۔

’’ایک بھی کام ایسا نہیں جس پر مجھے فخر ہو۔‘‘ وہ بولے۔ ’’رُکیکو، یہاں آ کر میری مدد کرو۔‘‘

میری بہن کچھ دیر تک اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ پھر اُس نے آگے بڑھ کر ایک دراز سے ٹنگا ہُوا پیش بند اُتار لیا۔

’’بس اب یہ سبزیاں پکنے والی رہ گئی ہیں۔‘‘ اُنھوں نے اُس سے کہا۔ ’’باقی چیزوں پر صرف دھیان رکھنا ہے۔‘‘ پھر اُنھوں نے نظریں اُٹھائیں اور کچھ سیکنڈوں تک مجھے اجنبی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ ’’مجھے اُمید ہے کہ تم گھر دیکھنا چاہو گے۔‘‘ بالآخر وہ بولے۔ اُنھوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھانا کھانے والی سلائیاں نیچے رکھ دیں۔ ’’تمھیں اِسے دیکھے ہُوئے بہت عرصہ گذر گیا ہے۔‘‘

جب ہم مطبخ سے نکلے تو میں نے مُڑ کر رُکیکو پر نظر ڈالی لیکن اُس کا منہ دُوسری جانب تھا۔

’’وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔‘‘ ابا جی نے آہستگی سے کہا۔

میں نے ایک کمرے سے دُوسرے کی طرف اپنے والد کی تقلید کی۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ گھر کتنا وسیع تھا۔ ایک دروازہ کھولنے پر دُوسرا کمرہ سامنے آ جاتا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر کمرے ساز و سامان سے عاری تھے۔ ایک کمرے کی بتیاں روشن نہیں ہو سکتی تھیں اور ہم کھڑکیوں سے چھن کر آتی مدہم روشنی میں عریاں دِیواروں کو تھام کر چٹائی پر چلے۔

’’یہ گھر اکیلے شخص کے لیے بہت بڑا ہے۔‘‘ ابا جی بولے۔ ’’میرے پاس اب اِن کمروں کا کوئی استعمال نہیں ہے۔‘‘

لیکن آخرش میرے والد نے کتابوں اور اخبارات سے بھرے ہُوئے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ اُس کمرے کے گُل دانوں میں پھول اور دِیواروں پر تصاویر ٹنگی ہوئی تھیں۔ پھر میرا دھیان کونے میں پڑی ایک میز پر دھری کسی شے کی طرف گیا۔ میں قریب گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک بحری جنگی جہاز کا نمونہ تھا، ویسا ہی جیسا بچے بناتے ہیں۔ وہ کسی اخبار پر دھرا ہُوا تھا۔ اُس کے گرداگرد سُرمئی پلاسٹک کے ٹکڑے بے

ترتیبی سے بکھرے ہُوئے تھے۔

ابا جی نے قہقہہ لگایا۔ اُنھوں نے میز کے پاس آ کر اُس نمونے کو اُٹھا لیا۔

”کاروبار ختم ہونے کے بعد۔“ وہ بولے۔ ”مجھے ہاتھوں سے کام کرنے کے لیے زیادہ وقت میسر آ گیا ہے۔“ اُنھوں ایک بار پھر قہقہہ لگایا، قدرے عجیب انداز میں۔ ایک لمحے کے لیے اُن کا چہرہ نرم خُو ہو گیا۔ ”کچھ زیادہ وقت۔“

”یہ بات عجیب لگتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ تو ہمیشہ بے حد مصروف رہے ہیں۔“

”بے حد مصروف شاید۔“ اُنھوں نے مجھے ہلکی سی مُسکراہٹ سے دیکھا۔ ”شاید میں کچھ زیادہ ہی محتاط باپ رہا ہوں۔“

میں ہنسا۔ وہ اپنے بحری جنگی جہاز پر غور و خوض کرتے رہے۔ پھر اُنھوں نے نظریں اُٹھائیں۔

”میں تمھیں یہ نہیں بتانا چاہتا تھا مگر شاید یہ بھی اچھا ہی ہُوا۔ مجھے یقین ہے کہ تمھاری ماں کی موت حادثاتی نہیں تھی۔ اُسے بہت سے پریشانیاں لاحق تھیں۔ اور کچھ مایوسیاں بھی۔“

ہم دونوں پلاسٹک کے بحری جنگی جہاز کو تکنے لگے۔

”یقیناً۔“ آخر کار میں بولا۔ ”ماں کو میرے ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے کی توقع نہیں تھی۔“

”ظاہر ہے کہ تم نہیں دیکھتے۔ تم نہیں دیکھتے کہ کچھ والدین کے لیے یہ معاملہ کس طرح سے ہے۔ وہ نہ صرف اپنے بچے گنواتے ہیں بل کہ ساتھ ہی اُن کی ایسی چیزیں بھی گنوا بیٹھتے ہیں جنھیں وہ سمجھتے نہیں۔“ اُنھوں نے بحری جنگی جہاز کو اپنی اُنگلیوں میں گھمایا۔ ”یہ بندوقیں نصب کی ہوئیں چھوٹی چھوٹی کشتیاں یہاں چپکا دی جانا بہتر رہیں گی۔ تمھارا کیا خیال ہے؟“

”شاید۔ میرا خیال ہے کہ عمدہ رہیں گی۔“

”زمانۂ جنگ میں مَیں نے اِس سے ملتے جلتے بحری جہاز پر کچھ وقت گذارا تھا۔ لیکن میری خواہش سدا ہَوائی فوج کی رہی تھی۔ مجھے بس کچھ یہی پتا چلا تھا کہ اگر تمھارا جہاز دشمن کے نرغے میں آ جائے تو زندگی کی آس میں پانی میں جد و جہد کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک ہَوائی جہاز میں — خُوب — ہمیشہ حتمی جنگ ہوتی ہے۔“ اُنھوں نے نمونہ واپس میز پر رکھ دیا۔ ”میرا قیاس ہے کہ تمھیں جنگوں پر یقین نہیں ہے۔“

”کوئی خاص نہیں۔“

اُنھوں نے کمرے میں ایک نظر دوڑائی۔

”کھانا اب تیار ہو گیا ہوگا۔“ اُنھوں نے کہا۔ ”تمھیں بُھوک بھی لگی ہو گی۔“

مطبخ سے ملحق نیم روشن کمرے میں کھانا ہمارا منتظر تھا۔ میز کے اُوپر لٹکی ہوئی لالٹین روشنی کا واحد ذریعہ تھی۔ جس کا سایہ کمرے کے باقی حصے میں تاریکی پھیلا رہا تھا۔ کھانے کے آغاز سے قبل ہم ایک دُوسرے کے سامنے کورنش بجالائے۔

کھانے کے دوران کم بات چیت ہوئی۔ جب میں نے کھانے کے بارے میں اچھے کلمات کہے تو کیکو کو گدگدیانہ انداز میں ہنس دی۔ لگتا تھا اُس کی پہلے والی اضطرابی کیفیت لوٹ آئی ہے۔ میرے والد نے کافی دیر تک کوئی بات نہیں کی۔ بالآخر اُنھوں نے کہا۔

”تمھیں جاپان لوٹنا یقیناً عجیب لگ رہا ہوگا۔“

”ہاں، تھوڑا سا عجیب۔“

”شاید، تمھیں پہلے بھی امریکا میں قیام پر پچھتاوا تھا۔“

”تھوڑا سا۔ بہت زیادہ نہیں۔ میں نے پیچھے کچھ زیادہ نہیں چھوڑا تھا۔ بس چند خالی کمرے۔“

”اوہ، اچھا۔“

میں نے میز کے دُوسری طرف دیکھا۔ نیم روشنی میں میرے والد کا چہرہ سخت اور خوف ناک دِکھائی دے رہا تھا۔ ہم خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

پھر کمرے کے عقب میں کوئی چیز میری نگاہوں کی گرفت میں آئی۔ پہلے تو میں کھانا کھاتا رہا لیکن پھر میرے ہاتھ تھم گئے۔ دُوسرے لوگوں نے بھی یہ بات محسوس کر لی اور مجھے دیکھنے لگے۔ میں اپنے والد کے کندھوں کے پار تاریکی میں گھورتا رہا۔

”وہ کون ہے؟ وہاں لگی اُس تصویر میں؟“

”کون سی تصویر؟“ میرے والد میری نظروں کے تعاقب میں آہستگی سے گھومے۔

”سب سے نیچے والی۔ سفید کیمونو والی بُوڑھی عورت۔“

میرے والد نے اپنی کھانا کھانے والی سلائیاں نیچے رکھیں۔ اُنھوں نے پہلے تصویر کو اور پھر مجھے دیکھا۔

”تمھاری ماں۔“ اُن کی آواز بہت سخت ہوگئی تھی۔ ”کیا تم اپنی ماں کو بھی نہیں پہچان سکتے؟“

”میری ماں۔ دیکھیے، وہاں اندھیرا ہے۔ میں تصویر کو اچھی طرح دیکھ نہیں پا رہا۔“

چند سیکنڈوں تک کوئی کچھ نہیں بولا۔ پھر کیکو نے اپنا قدم اُٹھایا۔ اُس نے دِیوار سے تصویر اُتاری، واپس آئی اور تصویر میرے حوالے کر دی۔

”یہ بہت بُوڑھی دِکھائی دے رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ اُس کی موت سے تھوڑا سا پہلے کھینچی گئی تھی۔“ میرے والد نے بتایا۔

”اندھیرا تھا۔ میں اچھی طرح دیکھ نہیں پایا۔“

میں نے اُوپر دیکھا تو میرے والد نے ہاتھ بڑھایا ہُوا تھا۔ میں نے تصویر اُنھیں دے دی۔ اُنھوں نے اشتیاق سے اُسے دیکھا پھر اُسے کیکُو کو تھما دیا۔ میری بہن ایک بار پھر تابع داری سے اُٹھی اور تصویر کو واپس اُس کی جگہ پر دِیوار پر لگا دیا۔

میز کے وسط میں رکھا ہُوا ایک بڑا سا برتن ابھی تک نہیں کھولا گیا تھا۔ جب کیکُو واپس آ کر دوبارہ بیٹھ گئی تو میرے والد نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا ڈھکن اُٹھایا۔ بھاپ کا بادل اُوپر کو اُٹھا اور لالٹین کے گِرد جمع ہو گیا۔ اُنھوں نے برتن کو تھوڑا سا میری جانب سرکا دیا۔

”تم بھوکے ہو گے۔“ وہ بولے۔ اُن کے چہرے کا ایک رُخ سائے کی زد میں آ گیا تھا۔

”شکریہ۔“ میں نے اپنی کھانا کھانے والی سلائیاں آگے بڑھائیں۔ بھاپ بے حد گرم تھی۔ ”یہ کیا ہے؟“

”مچھلی۔“

”بہت اچھی خُوش بُو اُٹھ رہی ہے۔“

یخنی کے بیچوں بیچ مچھلی کے قتلے تھے جو کم و بیش گیند جیسے ہو گئے تھے۔ میں نے ایک قتلہ اُٹھا کر اپنے پیالے میں ڈالا۔

”اپنی مدد آپ کرو۔ کافی مقدار میں ہے۔“

”شکریہ۔“ میں نے تھوڑی سی مقدار مزید لے کر برتن کو ابا جی کی طرف بڑھا دیا۔ میں اُنھیں اپنے پیالے میں کئی قتلے ڈالتے دیکھتا رہا۔ پھر ہم دونوں کیکُو کو اپنے لیے ڈالتے دیکھنے لگے۔

ابا جی ہلکا سا جھکے۔ ”تمھیں بُھوک لگی ہو گی۔“ اُنھوں نے دوبارہ کہا۔

اُنھوں نے تھوڑی سی مچھلی اپنے منہ میں ڈالی اور کھانے لگے۔ پھر میں نے بھی ایک ٹکڑا منتخب کر کے منہ میں ڈال لیا۔ وہ زبان کو نرم اور پُر گوشت محسوس ہوئی۔

”بہت خُوب۔“ میں بولا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”صرف مچھلی۔“

”بہت اچھی ہے۔“

ہم تینوں چُپ چاپ کھاتے رہے۔ کئی مِنٹ بیت گئے۔

”اَور لو گے؟“

”کیا کافی موجود ہے؟“

”ہم سب کے لیے کافی مقدار میں موجود ہے۔“ میرے والد نے ڈھکن اُٹھایا اور ایک مرتبہ پھر بھاپ بلند ہوئی۔ ہم سب نے آگے بڑھ بڑھ کر اپنے اپنے لیے لے لیا۔

”یہ۔“ میں نے ابا جی سے کہا۔ ”آپ کے لیے آخری ٹکڑا بچا ہے۔“

”شکریہ۔“

جب ہم نے کھانا ختم کر لیا تو میرے والد نے ہاتھ پھیلا کر سکون بھری جماہی لی۔

”کیکوکو۔“ وہ بولے۔ ”براہِ مہربانی، چائے تو بنا لو۔“

میری بہن نے اُن کی طرف دیکھا اور پھر بنا کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔ میرے والد اُٹھ کھڑے ہُوئے۔

”آؤ دُوسرے کمرے میں آرام سے بیٹھتے ہیں۔ یہاں قدرے زیادہ گرمی ہے۔“

میں اُٹھا اور اُن کے پیچھے چلتا ہُوا چائے والے کمرے میں آ گیا۔ باغ کی تازہ ہَوا کی آمد و رفت کے لیے پھسلنے والی بڑی بڑی کھڑکیاں کھلی چھوڑی ہوئی تھیں۔ ہم تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

”ابا جی۔“ آخر کار میں بولا۔

”ہاں؟“

”کیکوکو نے مجھے بتایا ہے کہ وتا نابے اپنے سارے خاندان کو ساتھ لے گیا ہے۔“

میرے والد نے نظریں جھکا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔

”وتا نابے کو اپنے کام سے بہت لگاؤ تھا۔“ بالآخر وہ بولے۔ ”کاروبار کی تباہی اُس کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ مجھے خدشہ ہے کہ اِس چیز نے اُس کی قوتِ فیصلہ کو کمزور کر دیا تھا۔“

”آپ کا کیا خیال ہے — جو کچھ اُنھوں نے کیا، غلطی تھی؟“

”کیوں، بلا شبہ۔ کیا تم اِسے کسی اور پہلو سے دیکھتے ہو؟“

”نہیں، نہیں۔ بلا شبہ نہیں۔“

”کام کے سوا بھی معاملات ہوتے ہیں۔“

”جی۔“

ہم دوبارہ خاموش ہو گئے۔ باغیچے سے جھینگروں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے باہر تاریکی میں دیکھا۔ کنواں اب نظروں سے اوجھل تھا۔

”تم نے اب کیا کرنے کا سوچا ہے؟“ ابا جی مستفسار ہوئے۔ ”کیا تم کچھ عرصہ جاپان میں ٹھیرو گے؟“

”سچی بات ہے کہ میں نے اتنی دُور تک نہیں سوچا۔“

”اگر تم یہاں قیام کرنا چاہو تو، میرا مطلب ہے کہ اِس گھر میں، تمھیں خُوش آمدید کہا جائے گا۔ یعنی تم ایک ضعیف العمر شخص کے ساتھ رہ لو تو۔“

”شکریہ۔ میں اِس پر غور کروں گا۔“

میں ایک بار پھر تاریکی میں گُھورنے لگا۔

”لیکن بے شک۔“ میرے والد بولے۔ ”یہ گھر اب بے حد بے کشش اور بے رونق ہے۔ یقیناً تم بہت جلد امریکا لوٹنا چاہو گے۔“

”شاید۔ مجھے خُود ابھی معلوم نہیں ہے۔“

”بلا شبہ، تم یہی چاہو گے۔“

میرے والد کچھ دیر تک اپنے ہاتھوں کی پشت دیکھتے رہے۔ پھر اُنھوں نے نظریں اُٹھائیں اور آہ بھری۔

”کیکو اگلے موسمِ بہار تک اپنی تعلیم مکمل کر لے گی۔“ اُنھوں نے کہا۔ ”شاید، تب وہ گھر آنا چاہے۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔“

”شاید، وہ ایسا چاہے۔“

”پھر معاملات بہتر ہو جائیں گے۔“

”جی، مجھے یقین ہے۔“

ہم نے کیکو کے چائے لانے کے انتظار میں ایک بار پھر چُپ سادھ لی۔

☆☆☆☆

کازُواِشیگُورو
ترجمہ: نجم الدّین احمد

مُطرب

جس صبح میں نے ٹونی گارڈنر کو سیاحوں کے بیچ بیٹھے دیکھا، یہاں وینس میں آغازِ بہار ہونے ہی والا تھا۔ ہم نے چوراستے پر ایک بھرپور ہفتہ مکمل کیا تھا۔ کیفے کے پچھواڑے زینہ استعمال کرنے کے متمنی گاہکوں کی راہ میں کام کے اُس تمام تھکن زدہ عرصے کے بعد، مجھے کہنے دیجیے، ایک احساسِ سکون میسر آیا تھا۔ اُس صبح ایک خاموش بادِ صبا تھی اور ہمارا نیا نکور خیمہ ہمارے چوگرد پھڑ پھڑا رہا تھا لیکن ہم سب اپنے آپ کو تھوڑا سا ہلکا پھلکا اور تازہ دم محسوس کر رہے تھے اور میرا خیال ہے کہ اِس کا اظہار ہماری موسیقی میں بھی ہو رہا تھا۔

لیکن میں تو یُوں بات کر رہا ہوں گویا میں طائفے کا باقاعدہ رُکن ہوں۔ میں ایک ”خانہ بدوش“ ہوں، دیگر موسیقار ہمیں یہی نام دیتے ہیں، ایک ایسا بندہ جو چوراہے میں منڈلاتا رہتا ہے کہ کیفے کے تینوں طائفوں میں سے کسے اُس کی ضرورت ہے۔ اکثر و بیشتر میں کیفے لاوینا میں گاتا بجاتا ہوں لیکن کسی مصروف سہ پہر کو میں قادری لونڈوں کے ساتھ کچھ گیت گا لیتا ہوں یا پھر فلوریَن والوں کی طرف چلا جاتا ہوں اور پھر پلٹ کر چوک عبور کر کے لاوینا چلا آتا ہوں۔ میرے اُن سب سے عمدہ تعلقات ہیں—اور بیروں سے بھی—اور کسی اَور شہر میں ہوتا تو آج میرا مقام مستحکم ہوتا۔ لیکن اِس روایت اور ماضی میں جکڑی جگہ پہ ہر چیز ہی اُلٹ ہے۔ اِس جگہ کے علاوہ ہر جگہ میں گٹار بجانے والے کے طور پہ مقبولیت پا لیتا۔ لیکن یہاں؟ ایک گٹار! کیفوں کے مینیجر دِقتی ہو جاتے ہیں۔ یہ کافی جدید لگتا ہے، سیاح اِسے پسند نہیں کریں گے۔ میں نے گزشتہ موسمِ خزاں میں ایک قدیمی طرز کا بیضوی سوراخوں والا ایک جاز موسیقی کا آلہ لے لیا، ویسا ہی جیسا ڈی جانگو رین ہارٹ بجاتا رہا ہوگا، تاکہ کوئی بھی مجھے راک اینڈ رولر نہ سمجھے۔ اِس سے معاملات قدرے سہل ہو گئے لیکن کیفوں کے مینیجروں کو اب بھی یہ چیز ناپسند تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ گٹار بجانے والے ہیں تو چاہے آپ جو پاس ہی کیوں نہ بن جائیں وہ اِس چوراستے میں آپ کو باقاعدہ ملازمت نہیں دیں گے۔

بے شک ایک اَور چھوٹا سا مسئلہ میرا اطالوی نہ ہونا بھی ہے، وینس سے ہونا تو زیادہ خواری کا سبب ہے۔ بعینہٖ معاملہ اُس قوی ہیکل چیک نژاد بانسری نواز کا تھا۔ ہم میں بے حد پسند کیا جاتا ہے، دُوسرے موسیقاروں کو ہماری ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن ہم باقاعدہ تنخواہ دار بننے کے اہل نہیں۔ بس گاؤ بجاؤ اور اپنا منہ

بند رکھو، کیفوں کے منیجر ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔ اِس سے سیاحوں کو پتا نہیں چلتا کہ ہم اطالوی نہیں اگر ویسا ہی لباس زیبِ تن کر لیں، دھوپ کا چشمہ لگا لیں، اپنے بال اُلٹے رُخ بنا لیں تو کوئی فرق نہیں کر سکے گا، بس بولو مت۔

لیکن میں اِتنا بُرا بھی نہیں بجاتا۔ خاص طور پر جب تینوں کیفوں کے طائفوں کو بہ یک وقت اپنے حریفوں سے مبارزت درپیش ہوتی ہے تو اُنھیں ایک گٹار کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کوئی ملائم، ٹھوس لیکن بلند آہنگ اور پس منظر سے اُبھرتی ہوئی دُھن۔ میرا قیاس ہے کہ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ تینوں طائفوں کی ایک ہی چوراہے میں بہ یک وقت موسیقی سے وہاں شور و غل مچ جاتا ہوگا۔ لیکن سان مارکو کا چوک اِس قدر کشادہ ہے کہ وہ اُسے اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ چورستے سے گذرنے والا سیاح ایک دُھن کو دھیرے دھیرے فضا میں یُوں گُم ہوتے اور دُوسری کو آہستہ آہستہ اِس طرح اُبھرتے محسوس کرتا ہے جیسے وہ ریڈیو کی سُوئی گھما رہا ہو۔ اِس سے سیاح کلاسیکی موسیقی کو زیادہ اخذ نہیں کر پاتے کیوں کہ تمام آلات کسی معروف دُھن کی ایک ہی آواز پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہے، یہ سان مارکو ہے اور اُنھیں جدید معروف پاپ موسیقی نہیں چاہیے۔ لیکن ہر تھوڑی دیر کے بعد اُنھیں کوئی ایسی چیز درکار ہوتی ہے جس کی اُنھیں شناخت ہو: شاید بوڑھی جُولی اینڈریو کا کوئی گیت یا کسی مشہور فلم کی کوئی دُھن۔ گذشتہ موسمِ گرما کی ایک سہ پہر کو ایک طائفے سے دُوسرے طائفے کی طرف جانا اور نو مرتبہ "دی گاڈ فادر" بجانا مجھے یاد ہے۔

خیر، موسمِ بہار کی اُس سویر، سیاحوں کے بڑے ہجوم کے سامنے موسیقی پیش کرتے ہُوئے، جب میں نے اپنے عین سامنے، خیمے سے لگ بھگ چھ گز پیچھے ٹونی گارڈنر کو تنہا کافی پیتے دیکھا۔ چوراہے میں ہمہ وقت ہمارے سامنے معروف ہستیاں آتی رہتی ہیں لیکن ہم کوئی افراتفری برپا نہیں کرتے۔ کسی گیت کے خاتمے پر طائفے کے ارکان کے بیچ خاموشی سے شاید یک لفظی کھسر پھسر ہوتی ہے۔ دیکھو، وہ وارن بیٹی ہے۔ دیکھو، یہ کسنجر ہے۔ وہ عورت، وہ وہی ہے جو اُس فلم میں تھی جو اُس شخص کے بارے تھی جو اُن کے چہرے بدل ڈالتا ہے۔ ہم اِس کے عادی ہیں۔ آخر یہ سان مارکو چوک ہے۔ لیکن جب میں نے وہاں ٹونی گارڈنر کو بیٹھے دیکھا تو وہ ایک مختلف معاملہ تھا۔ میں بے حد ہیجان زدہ ہو گیا۔

ٹونی گارڈنر میری ماں کو بے حد پسند تھا۔ کمیونزم کے زمانے کے ایسے ریکارڈ گھر میں رکھنا نہایت ہی کارِ دشوار تھا لیکن میری ماں نے اپنے تمام ذخیرے کو سنبھال کر رکھا تھا۔ ایک دفعہ، جب میں لڑکا تھا، میں نے اُن اَنمول ریکارڈوں کو بکھیر دیا۔ اپارٹمنٹ بے حد تنگ تھا کہ جس میں بعض اوقات تو بس معمولی سی حرکت ہی کی جا سکتی تھی اور اُس میں میری عمر کا ایک لڑکا ہو جو سردیوں کے اُن مہینوں میں گھر سے باہر بھی نہیں جا سکے۔

پس میں چھوٹے سے سُوفے سے بازوؤں والی کُرسی پر کودنے کا کھیل کھیل رہا تھا کہ ایک بار میرا اندازہ غلط ہُوا اور میں ریکارڈ پلیئر سے جا ٹکرایا۔ سُوئی زور سے ریکارڈ سے ٹکرائی۔ یہ سی ڈیوں کی آمد سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اور میری ماں باورچی خانے سے اندر آ کر مجھ پر چیخنے چلّانے لگی۔ مجھے بہت بُرا محسوس ہُوا، اِس لیے نہیں کہ میری ماں مجھ پر چلّا رہی تھی بَل کہ اِس لیے کہ میں جانتا تھا کہ وہ ٹونی گارڈنر کا ایک ریکارڈ تھا اور مجھے پتا تھا کہ اُس کی اُن کے لیے کیا اہمیت ہے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اِس ریکارڈ سے اب اُس کے گائے ہُوئے اُن امریکی گیتوں کے بجائے محض شور وغل ہی برآمد ہو گا۔ سالہا سال بعد، جب میں وارسا میں کام کر رہا تھا تو مجھے ریکارڈوں کے چور بازار کے بارے میں پتا چلا تو میں نے اپنی ماں کو ٹونی گارڈنر کے تمام ٹُوٹے ہُوئے ریکارڈ لا دیے جن میں وہ بھی شامل تھا جس پر مجھ سے خراشیں پڑ گئی تھیں۔ مجھے اِس کام میں تین برس کا عرصہ لگا لیکن میں اُنھیں ایک ایک کر کے اکٹھا کرتا رہا اور ہر بار جب بھی اُنھیں ملنے کے لیے واپس جاتا تو اُن کے لیے ایک ریکارڈ لے جاتا۔

پس آپ سمجھ گئے کہ میں اُسے پہچانتے ہی کیوں اِتنا ہیجان زدہ ہو گیا تھا، محض چھے گز کی دُوری پر۔ پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہ آیا اور میں دُھن تبدیل ہونے پر بعد میں شامل ہو سکا تھا۔ ٹونی گارڈنر! اگر میری ماں کو پتا چل جاتا تو وہ کیا کہتی! اُن کی خاطر، اُن کی یادداشت کے واسطے مجھے اُس کے پاس جا کر کچھ کہنا تھا چاہے اِس پر دُوسرے موسیقار میرا ٹھٹھا اُڑاتے اور کہتے کہ میں بھاگ کر سیاحوں کا سامان اُٹھانے والے لڑکے کا سا کردار ادا کر رہا ہوں۔

لیکن بے شک میں کُرسیوں میزوں کو اِدھر اُدھر دھکیلتا ہُوا اُس کی طرف دوڑ نہیں لگا سکتا تھا۔ ہماری دُھن ختم ہونے ہی والی تھی۔ یہ ایک کرب تھا کہ ابھی تین چار سُر باقی تھے اور مجھے ہر لمحے یہی خیال آ رہا تھا کہ وہ ابھی اُٹھے گا اور چل دے گا۔ لیکن وہ وہاں اپنے آپ میں مگن بیٹھا یُوں اپنی کافی کو تکتا، اُس میں چمچ ہلاتا رہا گویا وہ واقعی پریشان ہو کہ بیرا اُس کے لیے کیا لے آیا ہے۔ وہ ہلکی نیلی پولو کی قمیص اور سُرمئی رنگ کے ڈھیلے ڈھالے پاجامے میں دِیگر امریکی سیاحوں جیسا دِکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے ریکارڈوں والے بے حد سیاہ، بے حد چمک دار بال اب قریب قریب سفید تھے لیکن اُن کی تعداد خاصی تھی اور اب بھی صاف ستھرے انداز میں اُسی طرز میں بنے ہُوئے تھے جیسے وہ پہلے بنایا کرتا تھا۔ جب اُس پر پہلی بار میری نظر پڑی تھی تو وہ اپنے ہاتھ میں سیاہ شیشوں والا چشمہ تھامے ہُوئے تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ میں نے اُسے کوئی اَور شخص سمجھا تھا۔ لیکن جُوں جُوں ہماری موسیقی آگے بڑھتی گئی اور میں اُسے دیکھتا رہا تو اُس نے چشمہ آنکھوں پر لگایا، پھر اُتارا، ایک بار پھر لگایا۔ وہ اپنے خیالوں میں ڈُوبا ہُوا تھا اور مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہ درحقیقت ہماری موسیقی سُن ہی

نہیں رہا تھا۔

پھر ہمارا گیت اختتام پذیر ہُوا۔ میں کسی سے کچھ کہے بغیر تیزی سے خیمے سے باہر نکلا اور سیدھا ٹونی گارڈنر کی میز کا رُخ کیا اور پھر مجھے لمحاتی کرب نے آ گھیرا کہ میں اپنی بات کیسے شروع کروں۔ میں اُس کے عقب میں کھڑا تھا کہ اُس کی چھٹی حس نے اُسے پیچھے مُڑنے اور مجھے دیکھنے پر مجبور کیا۔ میرا قیاس ہے کہ یہ وہ سال تھے جب اُس کے پاس چاہنے والے آتے تھے۔ اور اگلی چیز یہ کہ میں ایک ہی سانس میں اُسے اپنا تعارف کروا رہا تھا، بتا رہا تھا کہ میں اُنھیں کس قدر پسند کرتا ہوں، میں کس طرح اُس طائفے میں ہوں جسے وہ ابھی سن رہے تھے، کیسے میری ماں اُس کی دِیوانی تھی۔ وہ سنجیدہ تاثرات سے سنتے، ہر چند سیکنڈوں بعد اثبات میں سر ہلاتے رہے جیسے وہ میرے طبیب ہوں۔ میں بولتا رہا اور اُنھوں نے بس اتنا کہا: ’’اچھا، ایسا ہے۔‘‘ تھوڑی دیر بعد جب مجھے خیال آیا کہ جانے کا وقت ہو گیا ہے اور میں چلنے لگا تو وہ بولے: ’’تو تمھارا تعلق اُن کمیونسٹ ملکوں میں سے ایک سے ہے۔ وہ بہت ہی سخت ہو گا۔‘‘

’’وہ سب قصۂ پارینہ ہُوا۔‘‘ میں نے مسرت بھرے انداز میں کندھے اُچکائے۔ ’’اب ہم ایک آزاد وطن ہیں۔ ایک جمہوریت۔‘‘

’’یہ جان کر خوشی ہوئی۔ اور وہ تمھارا طائفہ تھا جو ابھی ہمارے لیے موسیقی بجا رہا تھا۔ بیٹھ جاؤ۔ کافی پیو گے؟‘‘

میں نے اُنھیں بتایا کہ میں دخیل نہیں بننا چاہتا لیکن اب مسٹر گارڈنر کے لہجے میں نرمی بھرا اصرار تھا۔ ’’نہیں، نہیں، بیٹھ جاؤ۔ تم بتا رہے تھے کہ تمھاری ماں کو میرے ریکارڈ پسند تھے۔‘‘

پس میں بیٹھ گیا اور اُنھیں مزید بتانے لگا۔ اپنی ماں، اپنے گھر، چور بازاری کے ریکارڈوں کے بارے میں۔ اور چُوں کہ مجھے اُن کے نام یاد نہیں تھے اِس لیے میں اُنھیں اُن کے دامن پر بنی تصاویر سے بتایا جیسے میں خود اُنھیں یاد رکھا کرتا تھا اور ہر بار جب میں یہ کرتا تو وہ اپنی اُنگلی فضا میں اُٹھا کر اِس قسم کی بات کرتے: ’’اوہ، وہ غیر ہم سر، غیر ہم سر ٹونی گارڈنر ہو گا۔‘‘ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں واقعی اُس کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن پھر میں نے دیکھا کہ مسٹر گارڈنر نے مجھ سے اپنی نظریں ہٹالی ہیں اور اُسی لمحے میں نے ایک عورت کو ہماری میز کی طرف آتے دیکھا۔

وہ عمدہ زلفوں، لباس اور بدنی خطوط والی اُن امریکی خواتین میں سے تھی جو شان دار ہوتی ہیں کہ قریب سے دیکھے بغیر اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ اب زیادہ جوان نہیں رہیں۔ دُور سے میں نے بھی اُسے غلطی سے کسی بھڑکیلے فیشنی جریدے کی کوئی ماڈل سمجھا تھا۔ لیکن جب وہ مسٹر گارڈنر کے روبرو بیٹھ گئی اور اپنے دھوپ

کے چشمے کو آنکھوں سے سرکا کر ماتھے پر کرلیا تو مجھے احساس ہُوا کہ وہ لگ بھگ پچاس کے پیٹے میں ہے، یا شاید اس سے بھی زائد۔ مسٹر گارڈنر نے مجھے بتایا: ”یہ لنڈی ہے، میری بیوی۔“

بیگم گارڈنر نے مجھے زبردستی کی مُسکراہٹ سے نوازا، پھر اپنے خاوند سے بولی۔ ”اور یہ کون ہے؟ تم نے کوئی دوست بنالیا۔“

”پیاری، یہ دوست ہے۔ میرا ان سے باتیں کرتے ہُوئے اچھا وقت گذر رہا تھا۔ مجھے افسوس ہے دوست، مجھے تمھارا نام نہیں معلوم۔“

”جان۔“ میں تُرت بولا۔ ”لیکن یار دوست مجھے جینک کہتے ہیں۔“

لِنڈی گارڈنر بولی۔ ”تمھارا مطلب ہے کہ تمھارا مختصر نام تمھارے اصل نام سے طویل ہے؟ یہ کس طرح چلتا ہے؟“

”اِس کے ساتھ ترش روئی اختیار مت کرو، پیاری۔“

”میں ترش رو نہیں ہو رہی۔“

”اِس بے چارے کے نام کا مذاق مت اڑاؤ، پیاری۔ یہ اچھا لڑکا ہے۔“

لِنڈی گارڈنر میری جانب چھپائے نہ جا سکنے والے تاثرات کے ساتھ گھومی۔ ”تمھیں پتا ہے کہ یہ کیا بات کر رہا ہے؟ کیا میں نے تمھاری توہین کی ہے؟“

”نہیں، نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بالکل بھی نہیں، بیگم گارڈنر۔“

”یہ ہمیشہ مجھے کہتے رہتے ہیں کہ میں لوگوں کے ساتھ گستاخی سے پیش آتی ہوں۔ کیا میں نے ابھی تمھارے ساتھ کوئی گستاخی کی؟“ پھر مسٹر گارڈنر سے بولی۔ ”میں لوگوں سے فطری انداز میں بات کرتی ہوں، پیارے۔ یہی میرا طریق ہے۔ میں کبھی ترش نہیں ہوتی۔“

”ٹھیک ہے، پیاری۔“ مسٹر گارڈنر نے کہا۔ ”ہمیں بات کا بتنگڑ نہیں بنانا چاہیے۔ بہر حال، یہ شخص جو یہاں ہے، لوگ نہیں ہے۔“

”اوہ، کیا یہ نہیں ہے؟ پھر یہ کیا ہے؟ طویل عرصے سے بچھڑا ہُوا بھتیجا؟“

”اخلاق برتو، پیاری۔ یہ شخص ہم پیشہ ہے۔ ایک موسیقار۔ ایک پس رو۔ یہ ابھی ہم سب کو تفریحِ طبع فراہم کر رہا تھا۔“ اُس نے ہمارے خیمے کی جانب اشارہ کیا۔

”اوہ، ٹھیک ہے۔“ لِنڈی گارڈنر دوبارہ میری سمت مُڑی۔ ”کیا ابھی تم وہاں گا بجا کر رہے تھے؟ خوب، دِل کش تھا۔ تم اکارڈین پر تھے، ٹھیک؟ واقعی، بے حد دِل کش!“

”بے حد شکریہ۔ دراصل، میں گٹار نواز ہوں۔“

”گٹار نواز؟ مذاق کر رہے ہو۔ میں ایک منٹ پہلے خود دیکھ رہی تھی۔ وہاں بیٹھی ہوئی، طبلہ نواز کے قریب، تم اکارڈین بہت خوب صورتی سے بجا رہے تھے۔“

”معافی چاہتا ہوں، اکارڈین پر درحقیقت کارلو تھا۔ وہ ہٹا کٹا گنجا شخص ......“

”تمھیں یقین ہے؟ تم مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے؟“

”پیاری، میں تمھیں کہہ چکا ہوں کہ اِس کے ساتھ بدتمیزی مت کرو۔“ وہ چلّائے تو نہیں لیکن اُن کی آواز اچانک سخت اور غصیلی ہو گئی تھی اور اب وہاں عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر مسٹر گارڈنر نے نرمی سے بات کرتے ہوئے سکوت توڑا۔ ”مجھے افسوس ہے، پیاری۔ میرا مقصد تمھیں ڈانٹ پلانا نہیں تھا۔“

اُنھوں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا ایک ہاتھ تھام لیا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ اُن کا ہاتھ جھٹک کر پرے کر دے گی لیکن اس کے بجائے وہ اپنی کرسی سرکا کر اُن کے قریب ہو گئی اور اپنے دُوسرے ہاتھ کو دونوں جُڑے ہُوئے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر اِس طرح بیٹھے رہے کہ مسٹر گارڈنر کا سر جھکا ہُوا تھا اور اُن کی بیوی خالی نگاہوں سے اُن کے کندھوں کے اُوپر سے چوراہے کے پار باسیلیکا کی طرف دیکھ رہی تھی، گو اُس کی آنکھیں کچھ بھی دیکھتی ہوئی نہیں لگ رہی تھیں۔ اُن چند لمحات کے دوران لگتا تھا گویا وہ نہ صرف میری وہاں موجودگی بَل کہ چورستے کے لوگوں کو بھی بُھول چکے ہیں۔ پھر وہ قریب قریب سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ ”کوئی بات نہیں، پیارے۔ میری ہی غلطی تھی۔ تمھیں خوامخواہ ناراض کر دیا۔“

وہ تھوڑی دیر تک اُور اِسی طرح ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بیٹھے رہے۔ پھر اُس نے آہ بھری، مسٹر گارڈنر کا ہاتھ چھوڑا اُور مجھے دیکھا۔ اُس نے پہلے بھی مجھے دیکھا تھا لیکن اِس بار دیکھنے کا انداز مختلف تھا۔ اِس بار میں اُس کی دِل کشی محسوس کر سکتا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے اُس نے نمبر ملا لیا تھا، صفر سے ایک تک کا سفر، اور میرے ساتھ اُس نے چھے یا سات کا ہندسہ طے کر لیا تھا البتہ میرے اندر یہ شدید احساس پیدا ہُوا تھا کہ اگر وہ مجھ سے کوئی مدد چاہے۔ اگر کہے کہ چوک کے پار سے اُس کے لیے پُھول خرید لاؤں۔ تو میں بہ خُوشی کرتا۔

”جینک۔“ وہ بولی۔ ”تمھارا یہی نام ہے نا؟ مجھے افسوس ہے، جینک۔ ٹونی ٹھیک کہتے ہیں۔ مجھے تم سے اِس طرح بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

”بیگم گارڈنر، واقعی، براہِ مہربانی پریشان مت ہوں ......“

”اور میں نے تم دونوں کی گفتگو میں مداخلت کی۔ موسیقاروں کی گفتگو۔ شرطیہ۔ پتا ہے کیا؟ میں تم دونوں کو تمھاری باتیں جاری رکھنے کے لیے چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“

”جانے کی کوئی وجہ نہیں، پیاری۔“ مسٹر گارڈنر نے کہا۔

”اوہ، ہے، پیارے۔ مجھے حقیقتاً پارڈا سٹور میں جانے کی خواہش ہو رہی ہے۔ میں تھوڑی دیر قبل تمھیں صرف یہی بتانے کے لیے آئی تھی کہ میں نے جتنا کہا تھا مجھے اُس سے زیادہ دیر لگ سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، پیاری۔“ ٹونی گارڈنر پہلی دفعہ سیدھا ہُوئے اور اُنھوں نے گہرا سانس بھرا۔ ”تم جتنا وقت چاہو بہ خُوشی لگا سکتی ہو۔“

”میرا سٹور میں اچھا وقت گذرے گا۔ پس تم دونوں حضرات اپنی باتیں کرو۔“ وہ اُٹھی اور اُس نے میرا کندھا چھُوا۔ ”اپنا خیال رکھنا، جینک۔“

ہم اُسے جاتا ہُوا دیکھتے رہے، پھر مسٹر گارڈنر نے مجھ سے وینس میں موسیقاروں کے، خاص طور پر قادری طائفے کے بارے میں جنھوں نے حال ہی میں گیت سنگیت کا آغاز کیا تھا، چند باتیں پُوچھیں۔ وہ میرے جوابات کو دھیان سے سنتا ہُوا نہیں لگ رہا تھا۔ پس میں معذرت کر کے وہاں سے اُٹھنے ہی والا تھا کہ اُنھوں نے اچانک دریافت کیا:

”میں تمھیں کچھ بتانا چاہتا ہوں، دوست۔ میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کی میرے ذہن میں کیا ہے اور اگر تمھیں اچھا نہ لگے تو رڈ کر دینا۔“ وہ آگے جھکے اور اُنھوں نے اپنی آواز دھیمی کی۔ ”کیا میں تمھیں کچھ بتا سکتا ہوں۔ پہلی بار جب میں اور لنڈی یہاں وینس میں آئے تھے تو ہمارا ماہِ عُسل تھا۔ ستائیس برس قبل۔ اِس جگہ کے لیے ہماری تمام تر خُوش گوار یادوں کے باوجود ہم دوبارہ کبھی یہاں نہیں آئے، اکٹھے تو کبھی نہیں۔ پس جب ہم اِس سفر کا ارادہ باندھ رہے تھے تو، ہمارے اِس خاص دورے کا، ہم نے اپنے آپ سے کہا کہ ہم چند روز وینس میں بھی گذاریں گے۔“

”کیا یہ آپ کی شادی کی سال گرہ ہے، مسٹر گارڈنر؟“

”سال گرہ؟“ وہ متحیر رہ گئے۔

”معافی چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اچانک یہ خیال آیا تھا کیوں کہ آپ نے کہا ہے کہ یہ آپ کا خاص دورہ ہے۔“

وہ کچھ دیر تک تحیر زدگی کے عالم میں دیکھتا رہا، پھر قہقہہ لگایا۔ ایک بڑا سا اور جان دار قہقہہ اور یکا یک مجھے یاد آیا کہ یہ خاص گیت میری ماں ہر وقت لگائے رکھا کرتی تھی جس میں وہ گیت کے درمیان میں بات چیت کرتا ہے، کچھ ایسی بات کہ اُس عورت کے چھوڑ جانے کی اُسے کوئی پروا نہیں اور وہ ایسا ہی استہزا بھرا قہقہہ لگاتا ہے۔ اب ویسا ہی قہقہہ چوراہے میں گونج رہا تھا۔ پھر وہ بولے:

''سال گرہ؟ نہیں، نہیں۔ ہماری سال گرہ نہیں ہے۔ لیکن میں جو تجویز دینے لگا ہوں، وہ اِس سے زیادہ کی معدبھی نہیں رکھتی۔ کیوں کہ میں کچھ بے حد رومانوی کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُس کے لیے ایک رومانوی گیت گانا چاہتا ہوں۔ بالکل وینس کے انداز میں۔ عین موقع پر تم آ گئے ہو۔ تم اپنا گٹار بجاؤ، میں گاتا ہوں۔ ہم یہ کام نوکے میں، کھڑکی کے تلے کھلی فضا میں کرتے ہیں۔ میں اُس کے لیے گاتا ہوں۔ ہماری کرائے کی کوٹھی یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ خواب گاہ کی کھڑکی سے نہر دِکھائی دیتی ہے۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔ دِیواروں پر لگے ہوئے لیمپ ہر چیز روشن کر دیتے ہیں۔ تم اور میں ایک نوکے میں ہوں گے، وہ کھڑکی میں آ جائے گی۔ اُس کے تمام پسندیدہ گیت۔ ہمیں یہ کام زیادہ دیر کرنے کی ضرورت نہیں، آج کل شام کو ویسے بھی خاصی ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ بس تین یا چار گیت۔ میرے ذہن میں یہ بات ہے۔ میں تمھیں اِس کا معقول معاوضہ ادا کروں گا۔ تم کیا کہتے ہو؟''

''مسٹر گارڈنر، میری بے حد قدر افزائی ہوگی۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ آپ میری زندگی کی اہم شخصیت رہے ہیں۔ آپ یہ کب کرنا چاہتے ہیں؟''

''اگر بارش نہ ہوئی تو، کیوں نہ آج رات ہی؟ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب؟ ہم رات کا کھانا جلد کھا لیتے ہیں، اِس لیے ہم تب تک لوٹ آئیں گے۔ میں کوئی بہانہ تراش کر گھر سے نکل آؤں گا اور آ کر تمھیں مل لوں گا۔ میں نوکے کا انتظام کرلوں گا اور ہم واپس نہر کے کنارے پر لوٹ کر کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو جائیں گے۔ یہ ہر لحاظ سے ٹھیک رہے گا۔ تم کیا کہتے ہو؟''

آپ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ ایک خواب کے سچ ہونے کے مانند تھا۔ اور اِس کے علاوہ یہ ایک نہایت مزیدار منصوبہ تھا، وہ جوڑا — مرد اپنی ساٹھ کی اور عورت پچاس کی دہائی میں — نوجوانوں کی سی محبت کا روّیہ رکھ رہے تھے۔ درحقیقت، یہ اتنا پیارا منصوبہ تھا کہ اِس نے مجھے اُن کے بیچ تھوڑی دیر پہلے جو منظر میں نے دیکھا تھا اُسے کالعدم نہیں تو نہیں لیکن کافی حد تک بُھلا دیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اِس مرحلے کی نوبت آنے کے بعد وہ جس طرح چاہ رہا تھا اُس طرح معاملات سیدھے نہیں ہوں گے۔

اگلے چند منٹوں تک میں اور مسٹر گارڈنر وہاں بیٹھے جزئیات پر بحث کرتے رہے — وہ کون سے گیت گانا، کون سی دُھنوں کو ترجیح دینا چاہتا تھا، اور اِسی طرح کی دیگر تمام چیزیں۔ پھر میرا خیمے میں جانے اور ہمارے اگلے گیت کا وقت ہو گیا۔ پس میں اُٹھ کھڑا ہوا، اُن سے ہاتھ ملایا اور اُنھیں بتایا کہ وہ اُس شام مجھے لے سکتے تھے۔

…………

اُس شب جب میں مسٹر گارڈنر سے ملنے گیا تو گلیارے تاریک اور سنسان تھے۔ اُن دِنوں میں جب بھی سان مارکو کے چورستے سے دُور جاتا تھا تو راستہ کھو بیٹھتا تھا جسے ڈھونڈنے میں مجھے خاصا وقت لگ جایا کرتا تھا۔ مجھے اُس پُل کے بارے میں کم ہی معلوم تھا جہاں ملنے کے لیے مسٹر گارڈنر نے کہا تھا۔ اِس لیے میں چند منٹ کی تاخیر سے پہنچا۔

وہ سلوٹ زدہ سُوٹ پہنے ایک لیمپ کے بالکل نیچے کھڑے تھے۔ اُن کی قمیص کا گلا تین چار بٹنوں تک کھلا ہُوا تھا کہ اُن کی چھاتی کے بال دِکھائی دے رہے تھے۔ جب میں نے تاخیر کی معذرت چاہی تو وہ بولے: "چند منٹ کی کیا بات ہے؟ میری اور لنڈی کی شادی کو ستائیس برس ہو گئے ہیں۔ چند منٹ کی کیا بات ہے؟"

وہ ناراض نہیں تھے البتہ اُن کی کیفیت سنجیدہ اور متین دِکھائی دے رہی تھی۔ رومانوی بالکل بھی نہیں۔ اُن کے عقب میں پانی میں ہولے ہولے ہلتی ہُوا ڈونگا موجود تھا اور میں نے دیکھا کہ ڈونگا چلانے والا وِٹوریو تھا، وہ شخص جسے میں زیادہ پسند نہیں کرتا تھا۔ میرے منہ پر وِٹوریو ہمیشہ دوستانہ ہوتا تھا لیکن میں جانتا تھا — مجھے شروع سے پتا تھا — کہ وہ مجھ جیسے لوگوں کے بارے میں اِدھر اُدھر گھٹیا باتیں، بکواس بازی کرتا پھرتا ہے کہ "نئے ملکوں سے آئے ہُوئے غیر ملکی۔" یہی وجہ ہے کہ جب اُس شام اُس نے بھائیوں کی طرح سلام کیا تو میں نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا اور اُس کے مسٹر گارڈنر کو نوکے میں چڑھنے میں مدد دینے کے دوران چُپ چاپ انتظار کرتا رہا۔ پھر میں نے اُسے اپنا گٹار تھمایا — میں سُروں کے بیضوی سوراخوں والے کے بجائے اپنا ہسپانوی گٹار لایا تھا — اور پھر خود اُوپر چڑھ گیا۔

نوکے کے اگلے حصے میں مسٹر گارڈنر پہلو بدلتے رہے اور ایک موقع پر دھڑام سے نیچے بیٹھے کہ ہم لڑکھڑا گئے۔ لیکن اُنھوں نے اِس پر کوئی توجہ نہیں دی اور بدستور پانی میں تکنا جاری رکھا۔

کچھ دیر تک ہم خاموشی سے تاریک عمارتوں اور کم بلند پلوں کے نیچے چلتے رہے۔ پھر وہ اپنے گہرے خیالات سے باہر نکلے اور بولے۔ "سنو، دوستو۔ مجھے پتا ہے کہ آج کی شام کے لیے ہم نے کچھ گیت طے کیے تھے۔ لیکن میں اِس پر متواتر غور کرتا رہا ہوں۔ لنڈی کو وہ گیت بے حد پسند ہے: 'جب میں فینکس کے پاس گیا تھا'۔ یہ گیت میں نے بہت عرصہ ریکارڈ کروایا تھا۔"

"ہاں مسٹر گارڈنر، میری ماں ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ آپ کا انداز گائیکی بینا تارایا وہ گلین کیمپبل کے مشہور و معروف انداز سے بہتر ہے۔"

"میں اِس گیت کو اُس کے لیے بہت گایا کرتا تھا۔" مسٹر گارڈنر نے کہا۔ "تمھیں پتا ہے، میرا خیال

ہے کہ وہ اِسے آج رات سننا پسند کرے گی۔ کیا تم اِس کی دُھن جانتے ہو؟''

اُس وقت تک میرا گٹار بکسے سے باہر آچکا تھا۔ میں نے گیت کے چند مصرعے بجائے۔

''اِسے تھام لو۔'' وہ بولا۔''ای (E) تک سپاٹ۔ میں نے اپنی البم میں یہی کیا تھا۔''

پس میں نے تاروں کو اُسی سُر میں چھیڑا، اور جب تقریباً ایک بند پُورا ہو گیا تو مسٹر گارڈنر نے گانا شروع کیا، نہایت نرمی سے، زیرِلب جیسے اُسے ادھورے الفاظ یاد رہ گئے ہوں۔ لیکن پُرسکوت نہر میں اُن کی آواز کی گُونج واضح تھی۔ درحقیقت، وہ واقعی بے حد خُوب صُورت آواز تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں جیسے اپنے لڑکپن میں، اپنے اپارٹمنٹ میں لوٹ گیا جہاں میں قالین پر پڑا تھا اور میری ماں تھکی ہاری یا شاید شکستہ دِل سُوفے پر بیٹھی تھی جب کہ کمرے کے ایک کونے سے ٹونی گارڈنر کے گیت اُبھر رہے تھے۔

مسٹر گارڈنر نے اچانک گانا بند کر کے کہا: ''ٹھیک ہے۔ ہم سپاٹ ای میں 'قفس' گائیں گے۔ پھر شاید ہمارے منصوبے کے مطابق 'میں آسانی سے ہُوا دامِ الفت میں گرفتار۔ اور ہم 'ایک گیت میرے بچے کے لیے' پر ختم کر دیں گے۔ اتنا کافی ہوگا۔ وہ اِس سے زیادہ نہیں سنے گی۔''

اِس کے بعد وہ دوبارہ اپنے خیالوں میں کھو گئے اور ہم اندھیرے میں وِٹوریو کے چپو کی آواز سنتے ہُوئے آگے بڑھتے رہے۔

''مسٹر گارڈنر۔'' بالآخر میں بولا۔ ''مجھے اُمید ہے کہ آپ میرے سوال کا بُرا نہیں مانیں گے۔ کیا بیگم گارڈنر اِس لحن کی توقع کر رہی ہیں؟ یا یہ اُن کے لیے ایک تحیّر کُن وقوعہ ہوگا؟''

اُنھوں نے بھاری آہ بھری، پھر کہا: ''میرا خیال ہے کہ ہم اِسے تحیّر کُن وقوعے کے زمرے میں رکھیں گے۔'' پھر اضافہ کیا: ''خدا ہی جانتا ہے اُس کا کیا رَدِّعمل ہوگا۔ ہو سکتا ہے ہم 'ایک گیت میرے بچے کے لیے' پُورا نہ کر پائیں۔''

وِٹوریو نے ہمیں ایک اَور موڑ سے گھمایا تو یکا یک ہنسنے اور موسیقی کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم ایک کشادہ اور رَوشن ریستوران کے پاس سے گذر رہے تھے۔ کوئی میز خالی نہیں تھی، بیروں کی دوڑیں لگ رہی تھیں، کھانا کھانے والے مسرور دِکھائی دے رہے تھے اور سال کے اِس حصّے میں برلبِ نہر حدّت بھی زیادہ نہیں تھی۔ تاریکی اور سکوت میں سفر کے بعد ریستوران ایک نوع کی افراتفری لگی تھی۔ اُس چمک دار کشتی کے پھسلنے پر یُوں لگ رہا تھا گویا ہم ساکت حالت میں ساحل پر بنے چبوترے سے دیکھ رہے ہوں۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہمیں دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے ہم پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ پھر ریستوران پیچھے رہ گیا اور میں بولا: ''یہ کتنا دلچسپ ہے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ سیاح کیا کریں گے اگر اُنھیں کو پتا چل جائے کہ ابھی جو

نوکا گذر رہا ہے اُس میں داستانوں جیسا کردار ٹونی گارڈنر موجود ہے؟“

وِلو ریوکو، جو انگریزی کی زیادہ سُوجھ بُوجھ نہیں رکھتا تھا، اِس کی کچھ سمجھ آئی تو اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ لیکن مسٹر گارڈنر نے کچھ دیر تک مجھے جواب نہیں دیا۔ جب ہم دوبارہ تاریکی میں آ کر تنگ نہر کے کناروں پر نیم روشن روشوں کے قریب سے گذر رہے تھے تو وہ بولے: ”میرے دوست، تمھارا تعلّق کمیونسٹ ملک سے ہے۔ اِسی لیے تم نہیں سمجھ سکتے کہ یہ چیزیں کیسے کام کرتی ہیں۔“

”مسٹر گارڈنر۔“ میں نے کہا۔ ”میرا ملک اب کمیونسٹ نہیں رہا۔ اب ہم آزاد لوگ ہیں۔“

”معذرت چاہتا ہوں۔ میرا مقصد تمھاری قوم کو کم تر سمجھنا نہیں تھا۔ تم بہادر لوگ ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ تم لوگوں کو امن اور خوش حالی ملے گی۔ لیکن میں جو کہنا چاہتا تھا، دوست، میری جو مُراد تھی یہ تھی کہ تم جہاں سے آئے ہو وہاں، کاملاً فطری طور پر، اب بھی تم لوگ بہت سی چیزوں کو نہیں سمجھتے۔ بالکل ایسے ہی جیسے تمھارے وطن کی بہت سی چیزیں ایسی ہوں گی جنھیں میں نہیں سمجھ پاؤں گا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ بات ٹھیک ہے، مسٹر گارڈنر۔“

”جن لوگوں کے پاس سے ہم ابھی گذرے ہیں، اگر تم اُٹھ کر اُن کے پاس جاتے اور کہتے۔ ”کیا تم میں سے کسی کو ٹونی گارڈنر یاد ہے؟ تو شاید اُن میں سے کچھ یا پھر بہت سے لوگ کہتے: ہاں۔ کون جانتا ہے؟ لیکن اِس طرح قریب سے گذرنے پر، اگر اُنھوں نے مجھے پہچان بھی لیا ہو تو کیا وہ ہیجانی ہو جائیں؟ میرا یہ خیال نہیں ہے۔ وہ اپنے چھری کانٹے نیچے رکھیں گے نہ اپنی شمعوں کی روشنی میں کوئی دخل اندازی چاہیں گے۔ وہ کیوں چاہیں؟ بس ماضی کا ایک مُطرب ہی تو ہوں۔“

”مجھے اِس پر یقین نہیں آ رہا، مسٹر گارڈنر۔ آپ کلاسیک ہیں۔ آپ سیناترا یا ڈین مارٹن کے مانند ہیں۔ کچھ لوگ ایسا کر جاتے ہیں کہ وہ کبھی رواج سے باہر نہیں نکلتے۔ وہ اِن پاپ گانے والوں جیسے نہیں ہوتے۔“

”تم نے یہ کہہ کر بہت مہربانی کی، دوست۔ مجھے پتا ہے تمھارا مقصد خیر خواہی ہے۔ لیکن آج کی شب وہ وقت نہیں کہ تم مجھ سے مذاق کرو۔“

میں احتجاج کرنے ہی والا تھا مگر اُن کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے اِس موضوع کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ پس ہم کوئی بات کیے بغیر چلتے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو کس قضیے میں ڈال لیا، ایک عورت کے لیے گھر سے باہر یہ محفلِ موسیقی کیا تھی۔ اور یہ تو آخر کار امریکی تھے۔ مجھے تو بس اتنا پتا تھا کہ جب مسٹر گارڈنر گانے کا آغاز کریں گے تو بیگم گارڈنر بندوق لیے

کھڑکی میں آ کر ہم پر گولیاں برسانے لگیں گی۔

شاید وِڈو ریو بھی اِن ہی خطوط پر سوچ رہا تھا کیوں کہ جب ہم ایک دِیوار سے ٹنگی ایک لالٹین کے قریب سے گذرے تو اُس نے مجھے یُوں دیکھا گویا کہہ رہا ہو: ''ہمارا پالا عجیب وغریب شخص پڑ گیا ہے، کیا نہیں پڑا ہے، اَمیکو؟'' لیکن میں نے کوئی رِدِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ میں مسٹر گارڈنر کے خلاف اُس کی طرف داری کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وِڈو ریو کے مطابق، مجھ جیسے بدیسی، سیاحوں کو لُوٹ رہے تھے، نہر کو گندا کر رہے تھے، یعنی تمام شہر کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ اگر کسی دِن اُس کا مزاج خراب ہوتا تو برملا کہتا کہ ہم لوگ لٹیرے ہیں۔ حد یہ کہ زانی بھی۔ ایک دفعہ میں نے اُس کے مقابل تن کر استفسار کیا کہ یہ سچ ہے کہ وہ اِدھر اُدھر ایسی بکواس کرتا پھرتا ہے تو اُس نے قسم اُٹھائی کہ یہ سب جھوٹ کا پلندہ ہے۔ وہ کس طرح قومیت پرست ہو سکتا ہے جب اُس کی ایک خالہ یہودی ہے جسے وہ ماں کی طرح چاہتا ہے۔ لیکن ایک روز میں ڈورسوڈورو کے ایک پُل پر جھکا ہُوا اَپنے ریاض میں وقت گذاری کر رہا تھا کہ پُل کے نیچے سے ایک نوکا گذرا۔ جس میں تین سیاح بیٹھے تھے اور اُن کے ساتھ وِڈو ریو اپنا چپو تھامے کھڑا آواز سننے کی کوشش کرتے ہُوئے وہی بک بک کر رہا تھا۔ پس وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور میں اُسے کوئی حمایت نہیں دے سکتا تھا۔

''میں تمھیں ایک چھوٹا سا راز بتاتا ہوں۔'' اچانک مسٹر گارڈنر بولے۔ ''اپنی کارکردگی کا ایک چھوٹا سا راز۔ ایک سے دُوسری سمت کی طرف۔ یہ نہایت سادہ ہے۔ تمھیں ایک بات کا پتا ہونا چاہیے، چاہے وہ کوئی بھی بات ہو، تمھیں اپنے سامعین کے بارے میں ایک بات کا پتا ہونا چاہیے۔ ایک ایسی بات جو تمھارے ذہن میں ہو، جو فرق کر سکے گذشتہ رات گیت سننے والے اور موجود سامعین میں۔ فرض کیا کہ تم مِلواؤکی میں ہو۔ تمھیں اپنے آپ سے دریافت کرنا چاہیے کہ کیا فرق ہے، مِلواؤکی کے سامعین کی خاص بات کیا ہے؟ کون سی بات اُنھیں میڈیسن کے سامعین سے مختلف بناتی ہے؟ جب تک اُن کی کوئی بات دماغ میں نہیں آتی، کوشش کرتے چلے جاؤ۔ مِلواؤکی، مِلواؤکی۔ مِلواؤکی میں سؤر کے گوشت کے قتلے بہت اچھے بنتے ہیں۔ یہ کام کی بات ہے۔ جب تم مِلواؤکی میں قدم دھرو گے تو یہ بات تمھارے کام آئے گی۔ تمھیں اُن سے اِس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہنا، بس جب گاؤ تو یہ بات تمھارے ذہن میں ہونا چاہیے۔ یہ لوگ جو تمھارے سامنے موجود ہیں، وہ لوگ ہیں جو سؤر کے اچھے قتلے کھاتے ہیں۔ جب سؤر کے قتلے کھانے کا معاملہ ہو تو اُن کا معیار بہت بلند ہو جاتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میں کیا کہہ رہا ہوں؟ اِس طرح تم اپنے آپ کو اُن سامعین کا شناسا پاؤ گے، جن کے لیے تم گانے جا رہے ہو۔ بس، اتنا سا میرا راز ہے۔ ایک سے دُوسری سمت کی طرف۔''

''خوب، شکریہ مسٹر گارڈنر۔ میں نے اِس پر کبھی اِس طرح غور نہیں کیا تھا۔ آپ جیسی ہستی کا یہ گُر

میں کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"تو آج کی شب۔" اُنھوں نے بات جاری رکھی۔ "ہم لنڈی کے لیے گا رہے ہیں۔ لنڈی سامع ہے۔ اِس لیے میں تمھیں لنڈی کے بارے میں کچھ بتانے لگا ہوں۔ کیا تم لنڈی کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟"

"بے شک، مسٹر گارڈنر۔" میں نے کہا۔ "میں لنڈی کے بارے میں نہایت اشتیاق سے سنوں گا۔"

اگلے بیس یا اِس سے زائد منٹ تک ہم ڈونگے میں بیٹھے چکر پر چکر لگاتے اور مسٹر گارڈنر بولتے رہے۔ بعض اوقات اُن کی آواز ڈُوب کر سرگوشی بن جاتی جیسے وہ خود کلامی کر رہے ہوں۔ بعض اوقات، جب کسی لیمپ یا کھڑکی کے پاس سے گذرتے ہُوئے ہماری کشتی پر روشنی پڑتی تو میں اُنھیں یاد آجاتا، وہ اپنی آواز بلند کرتے اور کچھ ایسی بات کہتے: "تم سمجھ رہے ہونا میں کیا کہہ رہا ہوں، دوست؟"

اُن کی بیوی کا تعلق، اُنھوں نے مجھے بتایا، وسطی امریکا کے مِنیسوٹا کے ایک چھوٹے سے قصبے تھا جہاں اُس کے سکول کے اساتذہ نے بہت مشکل وقت سے دوچار کیا کیوں کہ وہ پڑھنے کے بجائے ہر وقت فلمی ستاروں کے جرائد دیکھتی رہتی تھی۔

"اُن خواتین کو کبھی نہیں پتا چلا کہ لنڈی کے بڑے بڑے منصوبے تھے۔ اور اب اُسے دیکھو۔ امیر کبیر، حسین وجمیل اور دُنیا بھر کی سیر وسیاحت۔ اور وہ سکول کی اُستانیاں، وہ آج کہاں ہیں؟ وہ کس قسم کی زندگی گذار رہی ہیں؟ اگر وہ بھی چند ایک فلمی رسائل دیکھ لیتیں، چند ایک خواب اُور دیکھ لیتیں تو شاید اُنھیں قدرے کم سہی کوئی مقام مل جاتا جو آج لنڈی کے پاس ہے۔"

انیس برس کی عمر میں، وہ پہاڑ سرائی کے لیے کیلی فورنیا چلی گئی۔ وہ ہالیووڈ جانا چاہتی تھی۔ لیکن اِس کے بجائے وہ برلبِ سڑک بنے ایک ڈھابے کی بیرا بن کر لاس اینجلس کے مضافات میں پہنچ گئی۔

"حیرت انگیز۔" مسٹر گارڈنر بولے۔ "ڈھابا، شاہراہ کی وہ با قاعدہ جگہ۔ جو اُس کے لیے پریشانی کا بہترین مقام بنی۔ کیوں کہ یہ وہ جگہ تھی جہاں کچھ کر گذرنے کی تمنائی لڑکیاں صبح سے رات گئے تک آتی رہتی ہیں۔ وہ آپس میں وہاں ملتیں: سات، آٹھ، درجن بھر۔ وہ اپنے لیے کافی اور ہاٹ ڈاگ (روٹی میں لپٹا ہُوا گائے یا سؤر کا چٹنی ملا قیمہ) منگواتیں اور وہاں بیٹھی گھنٹوں باتیں کرتی رہتیں۔"

وہ لڑکیاں، سب کی سب لنڈی سے ذرا زیادہ عمر کی، امریکا کے ہر حصے سے آئی اور لاس اینجلس میں کم وبیش دو تین برس سے تھیں۔ وہ ڈھابے پر اِدھر اُدھر کی گپ ہانکنے، بدقسمتی کا رونا رونے، چال بازیاں تراشنے اور ایک دُوسرے کی ترقی پر نظر رکھنے آیا کرتی تھیں۔ لیکن اُس جگہ کی سب سے اہم شخصیت لنڈی کے

ساتھ بیرا گیری کرنے والی چالیس سالہ مَیگ تھی۔

”اُن لڑکیوں کے لیے مَیگ اُن کی بڑی بہن اور اُن کا سرچشمۂ دانش تھی۔ کیوں کہ کسی زمانے میں وہ بھی اُن ہی کی طرح تھی۔ یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ وہ سنجیدہ، واقعی مشتاق اور اولوالعزم لڑکیاں تھیں۔ کیا وہ دُوسری لڑکیوں کے مانند کپڑوں، جوتوں اور ہار سنگھار کی باتیں کیا کرتی تھیں؟ یقیناً کرتی تھیں۔ لیکن وہ اُن لباسوں، کپڑوں اور ہار سنگھار کی باتیں کیا کرتی تھیں جو کسی فن کار سے اُن کی شادی کا باعث بن سکے۔ کیا وہ فلموں کی باتیں کیا کرتی تھیں؟ کیا وہ موسیقی کے مناظر کی باتیں کیا کرتی تھیں؟ یقیناً۔ لیکن وہ اُن فلمی ستاروں اور گلوکاروں کی باتیں کیا کرتی تھیں جو تنہا تھے، جو اپنی ازدواجی زندگی سے ناخُوش تھے، جو طلاق لے رہے تھے۔ اور دیکھو، مَیگ اُنھیں یہ سب بتایا کرتی تھی اور اِس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ مَیگ اُس شاہراہ پر اُن سے پہلے موجود تھی۔ وہ تمام قاعدے، تمام چالیں جانتی تھی کہ کب کسی فن کار سے شادی ہو سکتی ہے۔ اور رِنڈی اُن کے پاس بیٹھ کر ہر بات اپنے اندر اُتارتی رہتی۔ وہ ہاٹ ڈاگ کا چھوٹا سا ڈھابا اُس کا ہارورڈ اور ییل تھا۔ منیسوٹا کی ایک انیس سالہ؟ مجھے اب یہ سوچ کر ہی جھرجھری آ جاتی ہے کہ اُس کے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ خُوش نصیب ٹھہری۔“

”مسٹر گارڈنر۔“ میں بولا۔ ”مداخلت پر معافی چاہتا ہوں۔ لیکن اگر وہ مَیگ اتنی ہی دانش مند تھی تو وہ خُود کسی فن کار سے بیاہ رچانے میں کامیاب کیوں نہ ہوئی؟ وہ اُس ہاٹ ڈاگ والے ڈھابے پر کیوں کام کر رہی تھی؟“

”اچھا سوال ہے۔ لیکن تم نے یہ قطعاً نہیں دیکھا کہ یہ معاملات کس طرح سرانجام پاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مَیگ نامی خاتون خُود اِس میں کامیاب نہیں ہو پائی۔ لیکن اصل نکتہ یہ ہے کہ اُس نے کامیاب ہونے والیوں کو دیکھا تھا۔ سمجھ گئے نا، دوست؟ وہ بھی کسی زمانے میں اُن لڑکیوں جیسی ہی تھی اور اُس نے کچھ کو کامیاب اور باقی کو ناکام ہوتے دیکھا تھا۔ اُس نے نشیب وفراز دیکھے تھے۔ وہ اُنھیں وہ تمام کہانیاں سنا سکتی تھی اور لڑکیاں دھیان سے سُنتیں۔ اور اُن میں سے کچھ نے سیکھ لیا۔ رِنڈی اُن میں سے ایک تھی۔ جیسا کہ میں نے کہا وہ اُس کا ہارورڈ تھا۔ اُس نے اُسے وہ بنایا جو وہ ہے۔ اُس نے اُسے وہ قوت عطا کی جس کی اُسے بعد میں ضرورت پڑی تھی، اور لڑکا جس کی اُسے ضرورت تھی۔ پہلا موقع ملنے میں اُسے چھے برس لگے۔ کیا تم اِس کا تصور کر سکتے ہو؟ چال بازیوں، منصوبہ سازیوں اور اپنے آپ کو یُوں قطار میں لگائے رکھنے کے چھے برس۔ بار بار پیچھے دھکیلی گئی۔ لیکن ہمارے پیشے میں یُوں ہی ہوتا ہے۔ تم ابتدائی جھٹکوں کے بعد پلٹ سکتے ہو نہ ترک کر سکتے ہو۔ جو لڑکیاں ایسا کرتی ہیں اُنھیں تم کہیں بھی دیکھ سکتے ہو، وہ نامعلوم شخص سے شادی کر کے نامعلوم

گاؤں میں بس جاتی ہیں۔ لیکن اُن میں سے چند، لنڈی جیسی چند ایک، وہ ہر ٹھوکر سے سیکھتی ہیں، زیادہ مضبوط اور سخت ہو کر لوٹتی ہیں۔ وہ معرکہ آرائی اور جنونی ہونے کے لیے واپس آتی ہیں۔ تمھارے خیال میں کیا لنڈی نے توہین برداشت نہیں کی؟ اپنے حسن و جمال کے باوجود؟ لوگ جو بات محسوس نہیں کرتے یہ ہے کہ حسن تو آدھی چیز بھی نہیں ہے۔ اِس کے غلط استعمال سے طوائف بنا جا سکتا ہے۔ بہر حال، چھے برس کے بعد، اُسے بالآخر موقع مل گیا۔"

"تب وہ آپ سے ملی ہوگی، مسٹر گارڈنر؟"

"مجھ سے؟ نہیں، نہیں۔ میں ابھی منظر پر نہیں آیا۔ اُس نے ڈِنو ہارٹ مین سے شادی کر لی۔ کیا تم نے کبھی ڈِنو کے بارے میں نہیں سنا؟" مسٹر گارڈنر نے قدرے بے رحمی سے قہقہہ لگایا۔ "بے چارہ ڈِنو۔ میرا قیاس ہے کہ ڈِنو کے ریکارڈ کمیونسٹ ممالک میں دستیاب نہیں ہوں گے۔ لیکن اُن دِنوں ڈِنو کا نام خاصا معروف تھا۔ وہ ویگاس میں بہت گایا کرتا تھا، اُس کے چند سنہری ریکارڈ ہیں۔ میں نے بتایا نا کہ وہ لنڈی کے لیے بڑا موقع تھا۔ جب میری اُس سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو وہ ڈِنو کی بیوی تھی۔ بڈھی میگ نے بتایا کہ یہ سب کس طرح ہُوا تھا۔ یقیناً ایک لڑکی پہلی دفعہ کامیاب ہو سکتی ہے، سیدھی چوٹی پر جائے اور کسی سیناٹرا یا برانڈو سے شادی کر لے۔ لیکن عموماً اِس طرح نہیں ہوتا۔ لڑکی کو زینے سے نکل کر دُوسری منزل پر جانے اور ٹہلنے کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے۔ اُس کے لیے اُس کے فرش پر سانس لینے کا عادی ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تب شاید، کسی روز، اُس دُوسری منزل پر اُس کی ملاقات کسی ایسے شخص سے ہو جائے جو بالائی منزلوں کے کسی اپارٹمنٹ سے چند منٹوں کے لیے کوئی چیز لینے نیچے اُترے۔ اور وہ شخص اُس سے کہے کہ اے، تمھارا میرے ساتھ بالائی منزل پر آنے کے بارے کیا خیال ہے۔ لنڈی آگاہ تھی کہ عام طور پر یہی حربہ کام کرتا ہے۔ جب اُس نے ڈِنو سے شادی کی تو کم زور نہیں ہوئی اور نہ اُس نے اپنی منزل کی تمنا گھٹ ہونے دی۔ ڈِنو ایک عمدہ شخص تھا۔ میں نے اُسے ہمیشہ پسند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لنڈی کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہونے کے باوجود جب میں نے اُسے پہلی مرتبہ دیکھا تو پیش قدمی نہیں کی۔ میں کاملاً ایک شریف آدمی تھا۔ مجھے تو بعد میں معلوم ہُوا کہ لنڈی کس چیز کے لیے تُلی ہوئی تھی۔ تم ایسی لڑکی کو سراہو گے! میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں، دوست، میں اُس دور میں بے حد درخشاں ستارہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی زمانہ ہوگا جب تمھاری ماں مجھے سنا کرتی تھی۔ ڈِنو کا ستارہ تیزی سے ڈُوب رہا تھا۔ وہ دور بہت سے گلوکاروں کے لیے نہایت سخت تھا۔ ہر چیز بدل رہی تھی۔ لڑکے اُس زمانے میں بیٹلز اور رولنگ سٹونز[1] سن رہے تھے۔ بے چارہ ڈِنو، وہ بنگ کراس بائی[2] جیسی آواز میں گاتا تھا۔ اُس نے بوسانووا[3] طرز کے گیتوں کی کوشش کی لیکن جگ ہنسائی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ یقیناً، یہ لنڈی کے لیے چھوڑ

جانے کا وقت تھا۔ ایسی صُورتِ حال میں ہمیں کوئی بھی قصوروار نہیں ٹھیرا سکتا۔ میرا نہیں خیال کہ ڈِنو نے بھی ہمیں خطا کار ٹھیرایا ہوگا۔ پس میں نے اپنی پیش قدمی کی۔ اِس طرح وہ بالائی منزل تک پہنچ گئی۔

ہم نے ویگاس میں شادی کی۔ ہم اُس ہوٹل میں ٹھیرے جس کا نہانے کا ٹب شیمپین سے بھرا ہوتا ہے۔ ہم نے اُس شب جو گیت گایا وہ تھا: 'میں آسانی سے ہُوا دامِ الفت میں گرفتار'۔ تمھیں پتا ہے میں نے اِس گیت کا انتخاب کیوں کیا تھا؟ کیا تم جاننا چاہتے ہو؟ ایک مرتبہ ہم لندن میں تھے، ہماری شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہُوا تھا۔ ہم ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں گئے تو خادمہ ہمارے فلیٹ کی صفائی کر رہی تھی۔ لیکن میں اور لِنڈی خرگوش کے مانند وحشی ہیں۔ پس ہم اندر گئے تو ہم نے خادمہ کو ہماری نشست گاہ صاف کرنے کی آوازیں سنیں لیکن بیچ میں دِیوار ہونے کی وجہ سے ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا ہم بچّوں کی طرح پنجوں کے بَل چلتے ہُوئے چپکے چپکے اندر داخل ہُوئے، تمھیں پتا ہے؟ ہم چُپ چاپ خواب گاہ میں گئے، اندر سے دروازہ بند کیا۔ ہم نے دیکھا کہ خادمہ نے کمرے کو پہلے ہی سے صاف کیا ہُوا تھا، اِس لیے شاید اُسے وہاں واپس آنے کی ضرورت بھی نہ پڑے لیکن ہمیں اِس کا یقینی طور پر پتا نہیں تھا۔ بہر حال جو بھی ہوتا، ہمیں پروا نہیں تھی۔ ہم نے اپنے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، بستر پر مجامعت کی اور اِس تمام وقت کے دوران خادمہ دُوسری طرف موجود رہی۔ ایک طرف سے دُوسری طرف چکراتی ہوئی، اُسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہم لوٹ چکے ہیں۔ میں تمھیں بتاؤں، ہم وحشی ہیں لیکن تھوڑی دیر بعد ہمیں یہ ساری صُورتِ حال دلچسپ لگنے لگی اور ہم ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے۔ پھر ہم اپنا کام نپٹا کر ایک دُوسرے کی باہوں میں بستر پر لیٹ گئے۔ خادمہ اب بھی باہر موجود تھی اور تمھیں پتا ہے پھر کیا ہُوا، وہ گانے لگی! اُس نے صفائی کا کام ختم کر لیا تھا اور اپنی پُوری بلند آواز میں گانا شروع کر دیا تھا، اور لڑکے، اُس کی آواز بے حد بھدّی تھی! ہمارے قہقہے نکلنے لگے جنھیں ہم دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر کیا ہُوا کہ اُس نے گانا بند کر دیا اور رَیڈیو چلا دیا۔ اچانک ہمارے کانوں نے چیٹ بیکر کی آواز سُنی۔ وہ عمدگی، دھیمے پن اور رَسیلی آواز میں گا رہا تھا: 'میں آسانی سے ہُوا دامِ الفت میں گرفتار'۔ اور لنڈی اور میں وہاں بستر پر پڑے رہے بس چیٹ کا گیت سنتے رہے۔ وہ بازوؤں میں سمٹ گئی۔ یہ واقعہ تھا۔ اِسی لیے ہم آج رات یہ گیت گائیں گے۔ مجھے نہیں پتا اُسے یہ بات یاد بھی ہوگی۔ کون جانتا ہے؟''

مسٹر گارڈنر نے بولنا بند کیا اور میں نے اُنھیں اپنے آنسو صاف کرتے ہُوئے دیکھا۔ وِٹو ریو نے ہمیں ایک اَور موڑ سے گھمایا اور احساس دِلایا کہ ہم اُسی ریستوران کے پاس سے دوبارہ گذر رہے ہیں۔ وہ پہلے سے زیادہ بارونق تھا اور ایک پیانو نواز، جسے میں اینڈریا کے نام سے جانتا تھا، ایک کونے میں پیانو بجا رہا تھا۔

ہم دوبارہ تاریکی میں پہنچ گئے۔ میں بولا۔ ''مسٹر گارڈنر، مجھے معلوم ہے اِس سے میرا کوئی لینا دینا تو

نہیں لیکن مجھے لگتا ہے جیسے آپ کے اور بیگم گارڈنر کے مابین اچھے تعلقات نہیں رہے ہیں۔ میں آپ سے جاننا چاہتا ہوں کہ میں درست سمجھ رہا ہوں۔ میری ماں اکثر اسی انداز میں افسردہ ہو جایا کرتی تھیں جیسے اب آپ ہو رہے ہیں۔ وہ سوچا کرتی تھیں کہ اُنھیں کوئی مل گیا ہے، وہ بے حد مسرت سے مجھے بتاتیں کہ فلاں شخص میرا نیا باپ ہوگا۔ میں شروع شروع میں اُن کا اعتبار کر لیا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں مجھے پتا چل گیا تھا کہ اِس کا کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن میری ماں نے کبھی اپنا یقین نہیں کھویا۔ اور جب بھی وہ دِلگیر ہوتیں، جیسے آپ آج ہیں، تو آپ کو پتا ہے وہ کیا کِیا کرتی تھیں؟ وہ آپ کے ریکارڈ چلا کر ساتھ ساتھ گانے لگتی تھیں۔ طویل موسمِ سرما کے دوران، ہمارے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں وہ گھٹنے اپنی ٹانگوں تلے دبا کر بیٹھ جاتیں، کسی چیز کا گلاس اُن کے ہاتھ میں ہوتا اور وہ ملائمت سے گاتی رہتیں۔ اور بعض اوقات، مجھے یہ یاد ہے مسٹر گارڈنر، اُوپری منزل والے ہمارے ہمسائے چھت پر دھماکے کرنے لگتے، خاص طور پر اُس وقت جب ہم گلوکاری کر رہے ہوتے جیسے کہ 'فلک بوس تمنائیں' یا 'وہ سب ہنس دیئے'۔ میں اپنی ماں کو محتاط نظروں سے دیکھا کرتا تھا لیکن لگتا تھا گویا وہ اپنے سر کو ہلاتے ہوئے آپ کے سوا کچھ بھی نہیں سُن رہیں، اُن کے لب بول کے ساتھ ساتھ ہلتے رہتے۔ مسٹر گارڈنر، میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کے گیتوں نے اُس وقت میری ماں کو سہارا دیا، یہ دُوسرے لاکھوں لوگوں کے لیے بھی سہارا بنے ہوں گے۔ اور یہ بات لازماً درست ہے کہ یہ آپ کے لیے بھی سہارا بنیں گے۔'' میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، جس سے مراد حوصلہ افزائی تھی، لیکن وہ میری توقع سے زیادہ بلند آواز میں نکلا۔ ''آپ آج کی رات مجھے اپنا شریک سمجھیں، مسٹر گارڈنر۔ میں اپنے تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاؤں گا۔ میں طائفے کے مانند اچھی موسیقی پیش کروں گا، اب بس دیکھتے جائیں۔ اور بیگم گارڈنر ہمارے گیت سنیں گی اور کون جانتا ہے؟ شاید آپ لوگوں کے درمیان معاملات دوبارہ سدھرنا شروع ہو جائیں۔ ہر جوڑا مشکل حالات سے دوچار رہتا ہے۔''

مسٹر گارڈنر مُسکرائے۔ ''تم اچھے لڑکے ہو۔ میں آج کی شب تمھاری مدد کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ لیکن اب ہمارے پاس باتوں کے لیے وقت نہیں بچا۔ لنڈی اب اپنے کمرے میں ہے۔ مجھے بتی روشن نظر آرہی ہے۔''

ہم ایک پلازے کے قریب سے گذر رہے تھے جس کے پاس سے ہم پہلے بھی دو مرتبہ گذر چکے تھے اور اب مجھے احساس ہُوا کہ وِٹوریو ہمیں کیوں ایک ہی دائرے میں مسلسل گھما رہا تھا۔ مسٹر گارڈنر ایک خاص کھڑکی میں بتی روشن ہونے کے منتظر تھے اور ہر مرتبہ اُنھوں نے اُسے اندھیرے میں ڈُوبے پایا تھا اور ہم ایک اَور چکّر لگانے لگ جاتے۔ البتہ اِس بار تیسری منزل کی کھڑکی روشن، پٹ کھلے اور ہم جس جگہ تھے وہاں سے لکڑی کے بالوں والی چھت کا تھوڑا سا حصّہ دیکھ سکتے تھے۔ مسٹر گارڈنر نے وِٹوریو کو اشارہ کیا مگر اُس نے پہلے

ہی کشتی کو کھینا بند کر دیا تھا اور ہم آہستہ آہستہ پیرتے رہے، یہاں تک نوکا عین کھڑکی کے نیچے ٹھیر گیا۔

مسٹر گارڈنر، کشتی کو خطرناک حد تک جھلاتے ہُوئے، دوبارہ اُٹھے تو وِٹّو ریو کو ہمیں سنبھالنے کے لیے پُھرتی سے حرکت کرنا پڑی۔ پھر مسٹر گارڈنر نے بےحد ملائمت سے پُکارا: “لِنڈی؟ لِنڈی؟” اور بالآخر اُنھوں نے بہ آوازِ بلند پُکارا: “لِنڈی!”

ایک ہاتھ نے پٹ کو اَور کھولا، پھر تنگ جھروکے میں ایک جسم نمودار ہُوا۔ پلازے کی دِیوار پر لٹکی ہُوئی ایک لالٹین ہم سے زیادہ دُور نہیں تھی، لیکن روشنی کم تھی اور بیگم گارڈنر ایک سائے کی طرح دِکھائی دے رہی تھیں۔ تاہم میں نے پھر بھی دیکھ لیا تھا کہ اُس نے، جب میں اُس سے پلازے میں ملا تھا اُس سے مختلف بال بنا رکھے تھے، شاید رات کے جلد کھانے کے لیے۔

“یہ تم ہو، پیارے؟” وہ جھروکے کی باڑ پر جھکی۔ “میں سمجھی تم اغوا ہو گئے ہو یا ایسا ہی کچھ ہو گیا ہے۔ تم نے مجھے بےحد پریشان کر دیا تھا۔”

“بےوقوفی کی باتیں مت کرو، پیاری۔ ایسے قصبے میں ایسا ہو سکتا ہے؟ خیر، میں نے تمھارے لیے ایک رقعہ چھوڑا تھا۔”

“میں نے کوئی رقعہ نہیں دیکھا، پیارے۔”

“میں نے تمھارے لیے ایک رقعہ چھوڑا تھا۔ صرف اِس لیے کہ تم فکرمند نہ ہو۔”

“کہاں ہے وہ، وہ رقعہ؟ اُس میں کیا لکھا تھا؟”

“مجھے یاد نہیں ہے، پیاری۔” مسٹر گارڈنر کی آواز میں اب جھلاہٹ تھی۔ “وہ ایک باقاعدہ رقعہ تھا۔ تمھیں پتا ہے، اِس قسم کا کہ میں سگریٹ یا کچھ اور خریدنے جا رہا ہوں۔”

“کیا اب تم نیچے یہی کر رہے ہو؟ سگریٹ خرید رہے ہو؟”

“نہیں، پیاری۔ یہ ایک مختلف کام ہے۔ میں تمھارے لیے گانے لگا ہوں۔”

“کیا یہ کسی قسم کا کوئی مذاق ہے؟”

“نہیں پیاری، یہ مذاق نہیں ہے۔ یہ وینس ہے۔ یہ وہ کام ہے جو لوگ یہاں کرتے ہیں۔” اُنھوں نے میری اور وِٹّو ریو کی جانب یُوں اشارہ کیا گویا ہماری وہاں موجودگی اُن کے نکتے کی وضاحت ہو۔

“پیارے، مجھے یہاں باہر ٹھنڈ لگ رہی ہے۔”

مسٹر گارڈنر نے گہری آہ بھری۔ “تب تم کمرے کے اندر سے سنو۔ پیاری، کمرے میں واپس جاؤ، اپنے آپ کو آرام دہ حالت میں لاؤ۔ بس کھڑکیوں کو کھلا رہنے دو تم ہماری آواز بخوبی سن لوگی۔”

وہ کچھ دیر تک اُنھیں گھورتی رہی اور وہ جواباً اُسے تکتے رہے، دونوں ہی ایک بھی لفظ ادا کیے بغیر۔ پھر وہ اندر چلی گئی اور مسٹر گارڈنر مایوس دِکھائی دینے لگے حالاں کہ اِس کی تجویز بھی اُنھوں نے خود ہی دی تھی۔ اُنھوں نے ایک بار پھر آہ بھرتے ہُوئے سر جھکایا اور مجھے یقین ہے کہ وہ اگلا قدم اُٹھانے سے گُریزاں تھے۔ پس میں بولا: ''آیئے مسٹر گارڈنر، 'جب میں قفقس کے پاس گیا تھا' شروع کرتے ہیں۔''

اور میں نے مہارت سے اِبتدائی سُر بجائے، لیکن دُھن نہیں، جو گیت کی طرف لے جا سکتے تھے یا باآسانی دم توڑ سکتے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ وہ امریکی طرز کے ہوں، شاہراہِ طویل وعریض کے کنارے بنے مشروب خانوں جیسے، اور میرا قیاس ہے کہ میں اپنی ماں کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا کہ میں جب کمرے میں آتا تو اُنھیں صوفے پر پڑے ریکارڈ کے ایک امریکی شاہراہیا گلوکار کے کُرسی میں بیٹھنے کی تصویر والے کھانچے کو تکتے دیکھتا تھا۔ میری مُراد ہے کہ میں نے اُس طرح بجانے کی کوشش کی کہ میری ماں اُسے اُسی دُنیا سے آنے والی موسیقی سمجھے، وہی دُنیا جو اُن کے ریکارڈ کے کھانچے پر تھی۔

اِس سے قبل کہ مجھے ادراک ہوتا، میں باقاعدہ دُھن اُٹھا سکتا، مسٹر گارڈنر نے گانا شروع کر دیا۔ اُن کا نوکے میں کھڑے ہونے کا انداز خاصا غیر متوازن تھا اور مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ اپنا توازن نہ کھو بیٹھیں۔ لیکن اُن کی آواز بالکل ویسی ہی تھی جیسی میری یادداشت میں محفوظ تھی۔ ہم وار، بھاری مگر بھرپُور، گویا وہ غیر مرئی مائیک سے آ رہی ہو۔ اور تمام امریکی گلوکاروں کے مانند اُن کی آواز میں بھی تھکن، جھجک کا ایک تأثر تھا گویا وہ ایسا شخص ہو جو اِس طرح اپنا دِل سرِ عام کھولنے کا عادی نہ ہو۔ اِسی طرح تمام عظیم لوگ کیا کرتے ہیں۔

ہم نے وہ گیت گایا، جو سفر اور الوداع سے بھرا ہُوا تھا۔ ایک امریکی شخص اپنی عورت کو چھوڑ کر جا رہا ہوتا ہے۔ وہ بستیوں سے گذرتے ہُوئے ہر دم، مصرع بہ مصرع، اُس کے بارے میں سوچتا جاتا ہے: قفقس، البقرق، اوکلوہاما، ایک طویل شاہراہ پر سفر کرتے ہُوئے جو میری ماں نہیں کر سکتی تھی۔ اگر ہم محض ایسی یادیں اپنے پیچھے چھوڑ سکیں۔ میں قیاس کرتا ہوں کہ میری ماں اِسی طرح سوچتی ہوگی۔ اگر افسردگی محض ایسی ہی ہو۔

ہم نے گیت ختم کیا تو مسٹر گارڈنر نے کہا: ''ٹھیک ہے، آؤ اب سیدھے اگلے گیت کی طرف چلیں۔ 'میں آسانی سے ہُوا دامِ الفت میں گرفتار'۔

یہ میرا مسٹر گارڈنر کے ساتھ ساز بجانے کا پہلا موقع تھا، مجھے ہر چیز کا دھیان رکھنا پڑتا تھا لیکن ہم نے ٹھیک کر لیا۔ پھر اِس گیت کے بارے میں اُن کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق میں اُوپر کھڑکی کی سمت دیکھتا رہا لیکن بیگم گارڈنر کی جانب سے کچھ نہ ہُوا، نہ کوئی حرکت، نہ آواز، کچھ بھی نہیں۔ پھر ہم نے گیت ختم کر لیا تو ہمارے چوطرف سکوت اور تاریکی چھا گئی۔ میں قریب ہی کہیں سے کسی پڑوسی کے پٹ بند کرنے کی آواز بخوبی

سن سکتا تھا لیکن بیگم گارڈنر کی کھڑکی کی جانب سے کچھ نہیں تھا۔

ہم نے 'ایک گیت میرے بچے کے لیے' بے حد دِھیمی، کم و بیش بغیر دُھن کے، گایا اور پھر ہر طرف سکوت طاری ہوگیا۔ ہم منہ اُٹھائے کھڑکی کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر آخر کار، پُورے ایک مِنٹ کے بعد، ہم نے سنا۔ ہم اُسے بخوبی پہچان رہے تھے، بلا خطا کے۔ مسٹر گارڈنر سسکیاں بھر رہے تھے۔

”ہم نے کر دیا ہے، مسٹر گارڈنر!“ میں نے سرگوشی کی۔ ”ہم نے کر دیا ہے۔ ہم اُس کے دِل تک پہنچ گئے ہیں۔“

لیکن مسٹر گارڈنر خوش دِکھائی نہیں دیتے تھے۔ اُنھوں نے تھکے تھکے انداز میں اپنا سر ہاں میں ہلایا، نیچے بیٹھے اور وِٹو ریو کو اشارہ کیا۔ ”ہمیں دُوسری طرف لے چلو۔ اب میرے گھر جانے کا وقت ہوگیا ہے۔“

جب ہم روانہ ہُوئے تو میرا خیال تھا کہ وہ میری طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے گویا وہ ابھی ہم نے تھوڑی دیر قبل جو کیا تھا وہ اُس پر شرمندہ ہوں اور میں سوچنے لگا تھا کہ شاید یہ تمام منصوبہ کسی نوع کا کینہ جُو مذاق ہو۔ مجھے تو بس اتنا پتا تھا کہ یہ تمام گیت بیگم گارڈنر کے لیے خوف ناک مفہوم رکھتے تھے۔ پس میں اپنا گٹار ایک طرف رکھ کر بیٹھ گیا، شاید قدرے رنجیدہ۔ ہم کچھ دیر تک یُوں ہی سفر کرتے رہے۔

پھر ہم ایک بڑی نہر میں پہنچے تو اُسی وقت مخالف سمت سے آنے والا ایک بحری بجرا ہمارے پاس سے تیز رفتاری سے گذر کر ہمارے نوکے کو ہلا گیا۔ لیکن ہم اُس وقت مسٹر گارڈنر کے پلازے کے نزدیک تھے اور وِٹو ریو نے گھاٹ کا رُخ کیا تو میں نے کہا۔

”مسٹر گارڈنر، آپ میرے لڑکپن کا ایک اہم جزو رہے ہیں۔ اور آج کی رات میرے لیے بے حد خاص ہے۔ ہم ابھی ایک دُوسرے کو خدا حافظ کہہ کر جُدا ہو جائیں گے اور اگر میں زندگی میں دوبارہ کبھی آپ سے نہ مل سکا تو میں اپنی باقی تمام زندگی حیرت زدہ رہوں گا۔ اِس لیے مسٹر گارڈنر، براہِ مہربانی، مجھے اتنا بتا دیجیے کہ بیگم گارڈنر خوشی سے رو رہی تھیں یا پریشانی میں؟“

میرا خیال تھا کہ وہ جواب نہیں دیں گے۔ مدہم روشنی میں ڈونگے کے اگلے حصّے میں اُن کا جسم کبڑی شکل کا ہو رہا تھا۔ وِٹو ریو رسّی کھینچ رہا تھا تو وہ دِھیمے لہجے میں بولے: ”میرا خیال ہے کہ وہ مجھے اِس طرح گاتے دیکھ کر خوش تھی۔ لیکن، یقینی طور پر، وہ پریشان بھی تھی۔ ہم دونوں ہی پریشان ہیں۔ ستائیس برس ایک طویل عرصہ ہے اور اس تفریحی دورے کے بعد ہم علیحدہ ہو رہے ہیں۔ یہ ہمارا اِکٹھے آخری سفر ہے۔“

”مجھے یہ جان کر حقیقی دُکھ ہُوا، مسٹر گارڈنر۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ بے شمار شادیاں، ستائیس برس کے بعد بھی، اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہیں۔ لیکن کم از کم آپ اِس طرح جُدا ہونے کے اہل تو ہیں۔ وینس

میں چھٹیاں منا کر۔ نوکے سے گیت گا کر۔ بہت سے ٹوٹنے والے جوڑے اتنے مہذب نہیں رہ سکتے۔“

”لیکن ہم مہذب کیوں رہیں؟ ہم اب بھی ایک دُوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اِسی لیے تو رو رہی تھی۔ کیوں کہ وہ اب بھی مجھ سے اُتنی ہی شدید محبت کرتی ہے جتنی میں اُس سے۔“

وِٹو ریوگھاٹ پر اُتر گیا، لیکن مسٹر گارڈنر اور میں اندھیرے میں بیٹھے رہے۔ میں اُن کی طرف سے مزید بات کرنے کا منتظر تھا اور میرا یقین درست ثابت ہُوا۔ لمحے بھر کے بعد اُنھوں نے اپنی بات جوڑی۔

”جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا ہے کہ میں پہلی ہی نظر میں لنڈی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ لیکن کیا اُسے بھی تب مجھ سے محبت تھی؟ مجھے شک ہے کہ یہ سوال اُس کے ذہن میں کبھی نہیں آیا ہو گا۔ میں ایک معروف فن کار تھا، اُس کے لیے اِتنا ہی کافی تھا۔ میں وہ تھا جس کا اُس نے خواب دیکھا تھا، جس کی اُس نے تب اُس چھوٹے سے ڈھابے میں بیٹھ کر منصوبہ سازی کی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی یا نہیں، میں اِس میں شامل نہیں تھا۔ لیکن ستائیس سالہ ازدواجی زندگی میں دِلچسپ چیزیں ہو سکتی ہیں۔ جوڑوں کی اکثریت ایک دُوسرے سے محبت سے آغاز کرتے ہیں، پھر ایک دُوسرے سے اُکتا جاتے ہیں اور انجام نفرت ہوتا ہے۔ بعض اوقات معاملہ برعکس بھی ہوتا ہے۔ اِس میں چند برس لگے لیکن دِھیرے دِھیرے لنڈی مجھ سے محبت کرنے لگی۔ پہلے پہل مجھے اِس پر اعتبار نہ آیا لیکن آخر کار یقین کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ میز پر سے اُٹھتے ہوئے میرے کندھے کو ہولے سے چُھو دینا۔ کمرے میں خُوش گوار احمقانہ سی مُسکراہٹ دینا جب کہ مُسکرانے والی بات بھی نہ ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ متحیر تھی جیسے اُس کی جگہ کوئی اَور ہوتا تو وہ بھی متحیر ہوتا، لیکن یہی ہُوا تھا۔ پانچ چھے برس بعد، ہم ایک دُوسرے کے لیے سہولت بن گئے تھے۔ ہم ایک دُوسرے کے لیے فکر مند ہوتے، ایک دُوسرے کا خیال رکھتے۔ میں نے کہا نا کہ ہم ایک دُوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اور ہم آج بھی ایک دُوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں، مسٹر گارڈنر۔ پھر آپ اور بیگم گارڈنر الگ کیوں رہ رہے ہیں؟“

اُس نے ایک اَور آہ بھری۔ ”تم کیسے سمجھو گے، میرے دوست، کیوں کہ تمھارا تعلق کہاں سے ہے؟ چُوں کہ آج رات تم میرے لیے مہربان رہے ہو اِس لیے میں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ کبھی میں جتنا بڑا نام ہُوا کرتا تھا آج نہیں ہوں۔ چاہے تم احتجاج ہی کیوں نہ کرو لیکن تم جہاں سے آئے ہو وہاں ایسی چیزیں نہیں ہوتیں۔ میں اب بڑا نام نہیں رہا۔ اب مجھے اِس حقیقت کو تسلیم کرتے ہُوئے دھندلاتا ہو گا۔ شان دار ماضی پر زندگی بسر کرنا ہو گی۔ یا پھر میں یہ کہوں کہ نہیں، میں ابھی ختم نہیں ہُوا۔ بہ الفاظِ دیگر، میرے دوست، میں واپسی اختیار کر سکتا۔ میری صُورتِ حال میں بہت کچھ خراب ہو سکتا ہے۔ لیکن واپسی کوئی سہل کام نہیں۔ بہت سی تبدیلیوں کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا ہے جن میں سے کچھ بے حد سخت ہوتی

ہیں۔ اپنا آپ بدلنا پڑتا ہے۔ حد یہ کہ جن سے محبت ہوتی ہے اُنھیں بدلنا پڑتا ہے۔"

"مسٹر گارڈنر، کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کی واپسی آپ کی بیگم گارڈنر کی علیحدگی کا سبب ہے؟"

"دُوسرے لوگوں کو دیکھو، جن کی کامیاب واپسی ہوئی ہے۔ میری نسل کے لوگوں کو دیکھو جو اَب بھی منظر پر موجود ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک نے دوبارہ شادی کی ہے۔ دوبار، بعض اوقات سہ بار۔ اُن سب کی بغل میں نوجوان بیوی ہے۔ میں اور لنڈی ہنسی کی پوٹ بنتے جا رہے ہیں۔ اِس سے ہٹ کر، میری نظر میں ایک خاص خاتون ہے اور اُس خاتون کی نظر مجھ پر ہے۔ لنڈی اِس بات سے باخبر ہے۔ وہ اِس امر سے مجھ سے بہت پہلے آگاہ ہو گئی تھی، شاید اُن ہی ایام میں جب وہ اُس ڈھابے میں مَیگ کی باتیں سنا کرتی تھی۔ ہم اِس موضوع پر بات کر چکے ہیں۔ وہ سمجھتی ہے کہ اب ہمارے راستے جُدا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا، مسٹر گارڈنر۔ جس جگہ سے آپ کا اور بیگم گارڈنر کا تعلق ہے وہ دُنیا کے کسی بھی اُور مقام سے مختلف نہیں ہے۔ اِسی لیے تو، مسٹر گارڈنر، آپ گذشتہ سالوں میں جو گیت گاتے رہے ہیں وہ ہر جگہ کے لوگوں کو سمجھ آتے رہے ہیں۔ حتّٰی کہ جہاں میں رہتا ہوں وہاں کے لوگوں کو بھی۔ اور وہ تمام گیت کیا کہتے ہیں؟ اگر دو افراد ایک دُوسرے سے بیزار ہو جائیں اور اُنھیں الگ ہونا پڑے تو یہ قابلِ افسوس بات ہے۔ لیکن اگر وہ ایک دُوسرے سے محبت کرتے رہے تو اُنھیں سدا ساتھ رہنا چاہیے۔ وہ گیت یہی بتاتے ہیں۔"

"دوست، میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اور مجھے پتا ہے کہ تمھیں یہ بات ناگوار گذر رہی ہے۔ لیکن اصل بات یہی ہے۔ اور سنو، لنڈی کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اُس کے لیے بھی یہی بہتر ہے کہ اب ہم علیحدہ ہو جائیں۔ وہ ابھی بُوڑھی نہیں ہوئی ہے۔ تم نے اُسے دیکھا ہے، وہ اب بھی ایک حسین عورت ہے۔ اُسے ابھی چھٹکارا پا لینا چاہیے کیوں کہ ابھی اُس کے پاس وقت ہے۔ دوبارہ محبت پانے کے لیے، دُوسری شادی کرنے کے لیے وقت ہے۔ اُسے زیادہ تاخیر ہونے سے پہلے نجات حاصل کر لینا چاہیے۔"

مجھے نہیں پتا کہ مجھے اِس پر کیا کہنا چاہیے لیکن اُسی وقت اُنھوں نے یہ کہہ کر مجھے متحیّر کر دیا۔

"تمھاری ماں، میرا خیال ہے کہ وہ کبھی نہیں چھٹکارا پا سکی۔"

میں نے اِس پر غور کیا اور پھر جلدی سے بولا۔ "نہیں، مسٹر گارڈنر۔ وہ چھٹکارا نہیں پا سکی تھیں۔ وہ ہمارے ملک میں تبدیلیاں دیکھنے کے لیے زیادہ عرصہ جی نہیں پائیں۔"

"بہت بُرا ہُوا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک عمدہ خاتون تھیں۔ تم جو بتا رہے ہو وہ اگر سچ ہے اور میری موسیقی سے اُنھیں خُوشی ملتی تھی تو میرے لیے اِس کی بے حد اہمیت ہے۔ بہت بُرا ہُوا کہ وہ نجات حاصل نہیں کر

سکی ۔ میں نہیں چاہتا کہ میری لنڈی کے ساتھ یہ ہو۔ نہیں، جناب ۔ میری لنڈی کے ساتھ نہیں ۔ میں چاہتا ہوں میری لنڈی چھٹکارا پالے۔''

نوکا ہولے ہولے گھاٹ سے ٹکرا رہا تھا۔ وِٹو ریو نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہُوئے دِھیمی آواز میں پُکارا۔ چند سیکنڈ بعد مسٹر گارڈنر اُٹھے اور اُوپر چڑھ کر باہر اُتر گئے ۔ اُس وقت تک میں بھی اپنا گٹار لیے باہر اُتر آیا تھا– میں وِٹو ریو کے ساتھ مفت میں واپسی کی بھیک مانگنے کو تیار نہیں تھا– مسٹر گارڈنر نے اپنا بٹوہ نکالا ۔

وِٹو ریو کو جو ملا وہ اُس سے خُوش دِکھائی دیتا تھا اور اپنے عمومی عمدہ جملوں اور حرکات وسکنات سے وہ اپنے ڈونگے میں بیٹھ کر واپس نہر میں چلا گیا ۔

ہم اُسے تاریکی میں جاتا ہُوا دیکھتے رہے ۔ پھر اگلی چیز یہ ہوئی کہ مسٹر گارڈنر میری جیب میں بہت سے نوٹ ٹھونس رہے تھے ۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ یہ بہت زیادہ ہیں، میری اوقات سے بہت ہی زیادہ لیکن وہ ایک پیسہ بھی واپس لینے کو تیار نہیں تھے۔

''نہیں، نہیں۔'' وہ اپنے چہرے کے سامنے اپنا ہاتھ ہلاتے ہُوئے یُوں بولے جیسے وہ چاہتے ہوں کہ ہو گیا، رقم کے ساتھ نہیں بَل کہ میرے ساتھ۔ وہ رات جیسے زندگی کا ایک پُورا حصّہ رہا ہو۔ وہ اپنے پلازے کی سمت جانے لگے لیکن چند قدموں کے بعد وہ ٹھہرے اور اُنھوں نے مُڑ کر مجھے دیکھا۔ وہ چھوٹی سی گلی جس میں ہم موجود تھے، نہر، حد یہ کہ ہر چیز خاموش تھی ۔ بس دُور کہیں سے کسی ٹیلی ویژن کی آواز آرہی تھی ۔

''تم نے آج رات بہت اچھا بجایا، میرے دوست ۔'' وہ بولے ۔ ''تمھارا ماترا عمدہ ہے۔''

''شکریہ، مسٹر گارڈنر ۔ اور آپ نے بہت اچھا گایا، ہمیشہ کی طرح ۔''

''شاید میں جانے سے پہلے ایک بار پھر چوراہے پر آؤں ۔ تمھارے طائفے میں تمھیں سننے کے لیے۔''

''مجھے اُمید ہے، مسٹر گارڈنر ۔''

لیکن میں نے اُنھیں دوبارہ کبھی نہیں دیکھا۔ چند ماہ بعد مجھے پتا چلا کہ موسمِ خزاں میں مسٹر و بیگم گارڈنر میں طلاق ہو گئی تھی – فلوریَن والی ایک بیرا خاتون نے یہ بات کہیں پڑھی اور مجھے بتائی تھی ۔ مجھے اُس رات کی تمام باتیں یاد آ گئیں، میں تھوڑا سا اُداس ہو گیا اور دوبارہ اُنھیں سوچنے لگا۔ چُوں کہ مسٹر گارڈنر کافی عمدہ شخص لگتے تھے اور چاہے اِسے جو بھی سمجھا جائے، واپسی ہو یا نہ ہو، وہ ہمیشہ عظیم رہیں گے ۔

---

[۱] بیٹلز اور رولنگ سٹونز: ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے عرصے کے راک گیتوں کے دو گروہ۔

[۲] بِنگ کراس بائی: Bing Crossby امریکا کا ایک گلوکار اور اداکار: ۷۷۔۱۹۳۰ء۔

[۳] بوسا نووا: bossa nova سمبا (samba) سے مماثل ایک برازیلی رقص اور اُس کے گیت۔

کازُواَواِشیگُورَو

ترجمہ: نجم الدّین احمد

تاریکی میں ڈُوبی ہوئی بستی

ایک زمانہ تھا جب میں ہفتوں تک انگلستان میں آخری حد تک سفر کرتا رہتا تھا اور مجھے ذرا بھی تکان نہیں ہوتی تھی۔ تب مجھے سفر سے زیادہ کسی شے کا شوق نہیں تھا۔ لیکن اب میں بُوڑھا ہو گیا ہوں اور میرے اعصاب بہت جلد جواب دے جاتے ہیں۔ پس جب اندھیرا پھیلنے کے بعد میں گاؤں لوٹا تو میں اپنی ملکیت ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں اُسی بستی میں ہوں جس سے گئے ہُوئے مجھے زیادہ عرصہ نہیں بیتا اور اب میں وہاں اپنا اثر و رسوخ برتنے آیا ہوں۔

میں کچھ بھی نہیں پہچان پایا اور میں آڑھی ترچھی، خراب روشنی والی اور دونوں اطرف سے اُس علاقے کے مخصوص چھوٹے پتھروں والے مکانوں میں گھری تنگ گلیوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اکثر مقامات پر تو گلیاں اتنی تنگ ہو جاتیں کہ کھردری دِیوار یا کسی اَور چیز پر میرے بیگ یا میری کہنی کے رگڑ کھائے بغیر میں آگے ہی نہیں بڑھ سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے گاؤں کے چورستے پر پہنچنے کی آس میں تاریکی میں لڑکھڑاتے ہُوئے اپنے حواس بحال رکھے --- جہاں کم سے کم میں شناخت کر سکوں --- یا پھر مجھے کوئی گاؤں کا کوئی باسی مل جائے۔ جب کچھ دیر بعد یہ دونوں ہی کام نہ ہُوئے تو مجھ پر تھکن طاری ہونے لگی اور میں نے الل ٹپ کسی کٹیا کا انتخاب کر کے دروازہ کھٹکھٹانے کا قصد اِس اُمید پر کیا کہ شاید دروازہ کوئی ایسا شخص کھولے جو مجھے جانتا ہو۔

میں نے خاص طور پر ایک خستہ حال دِکھائی دینے والے دروازے کا انتخاب کیا، جس کی بالائی چوکھٹ اِس قدر نیچی تھی کہ مجھے اندر داخل ہونے کے لیے جھکنا پڑتا۔ دروازے کی جھریوں سے مدھم روشنی نکل اور مجھے آوازیں اور ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بلند آواز میں دروازہ کھٹکھٹایا تا کہ مکین اپنی باتوں میں منہمک ہونے کے باوجود بھی دستک سن لیں۔ لیکن اُسی وقت کسی نے مجھے عقب سے پُکارا۔ ”ہیلو۔“

میں نے مُڑ کر دیکھا تو بیس سال کے لگ بھگ عمر کی ایک عورت مجھ سے تھوڑے سے فاصلے پر اندھیرے میں کھڑی تھی جو پھٹی پُرانی جین اور چولی پہنے ہُوئے تھی۔

”آپ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے پاس سے گذرے تھے۔“ وہ بولی۔ ”میں نے آپ کو پُکارا بھی تھا۔“

‘‘واقعی؟ ٹھیک ہے، معذرت چاہتا ہوں۔ اِس سے مُراد میری رعونت نہیں ہے۔’’

‘‘آپ فلیچر ہیں، ہیں نا؟’’

‘‘ہاں۔’’ میں نے قدرے فخر بھرے لہجے میں کہا۔

‘‘جب آپ ہماری کُٹیا کے پاس سے گذرے تو وَینڈی نے بھی یہی سوچا تھا کہ یہ آپ ہی ہیں۔ ہم سب بے حد مسرور ہُوئے۔ آپ بھی اُس گروہ میں سے ہی تھے نا؟ ڈیوڈ میکس اور اُس کے ساتھیوں میں سے۔’’

‘‘ہاں۔’’ میں بولا۔ ‘‘لیکن میکس ذرا بھی اہم نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے مجھے بھی ویسا ہی سمجھ لیا۔ اُس سے بہت زیادہ اہم اَور لوگ بھی تھے۔’’ میں نے ناموں کی ایک فہرست شمار کی اور مجھے لڑکی کو ہر شخص کی شناخت میں اثبات میں سر ہلاتا دیکھ کر مسرت ہُوئی۔ ‘‘لیکن یہ سب تو تم سے بہت پہلے کا ہے۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘مجھے حیرانی ہے کہ تم ایسی باتیں جانتی ہو۔’’

‘‘یہ ہم سے پہلے کے وقت کا ہے، لیکن ہم سب آپ کے گروہ کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم اِس وقت یہاں موجود بہت سے بڑے بُوڑھوں سے زیادہ آگاہ ہیں۔ وَینڈی نے آپ کو محض آپ کی تصویروں کی وجہ سے فوراً پہچان لیا تھا۔’’

‘‘مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا نوجوانوں کو ہم میں اِتنی دلچسپی ہوگی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تھوڑی دیر پہلے تمھارے پاس سے گذر آیا۔ لیکن تم دیکھ رہی ہو کہ میں اب بُوڑھا ہو گیا ہوں اور سفر کے دوران اپنے حواس قدرے مجتمع نہیں رکھ سکتا۔’’

مجھے دروازے کے پیچھے سے شوروغوغا سا سنائی دینے لگا۔ میں نے دوبارہ کچھ بے صبرے پن سے دستک دی کیوں کہ میں لڑکی سے ملاقات کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا تھا۔

اُس نے ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا، پھر بولی۔ ‘‘آپ سب لوگ بالکل ویسے ہی ہیں۔ ڈیوڈ میکس چند برس قبل یہاں آئے تھے۔ ۹۳ء میں یا شاید ۹۴ء کی بات ہے۔ وہ بھی ویسے ہی پڑے ہیں۔ بس ذرا سے بدلے ہُوئے۔ میں کچھ دیر سے آپ کا تعاقب کرتی آ رہی ہوں۔’’

‘‘تو میکس یہاں آیا تھا۔ نہایت دلچسپ۔ تمھیں پتا ہے، وہ واقعی کوئی اہم شخص نہیں تھا۔ تمھیں یہ خیال ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ شاید تم مجھے بتا سکو کہ اِس کُٹیا میں کون رہتا ہے۔’’ میں نے دوبارہ دروازہ پیٹا۔

‘‘پیٹرسن۔’’ لڑکی بولی۔ ‘‘وہ پُرانے رہنے والے۔ شاید آپ کو جانتے بھی ہوں۔’’

''پیٹرسن۔'' میں نے دُہرایا، لیکن مجھے یہ نام یاد نہیں آیا۔

''آپ ہماری کُٹیا کیوں نہیں آ جاتے؟ وَینڈی واقعی بہت پُر جوش ہو رہی تھی، اور ہم باقی لوگ بھی۔ یہ ہمارے لیے بہت بڑی بات ہوگی، اُس دور کے کسی شخص سے حقیقتاً گفتگو کرنا۔''

''مجھے بے حد خُوشی ہوگی۔ لیکن سب سے پہلے تو مجھے اپنے قیام طعام کا بندوبست کرنا ہے۔ تم نے بتایا کہ پیٹرسن۔''

میں نے ایک بار پھر دروازہ پیٹ ڈالا مگر اس بار رُبری طرح۔ بالآخر روشنی کی حدّت بھری ایک لہر گلی میں چھوڑتا ہُوا دروازہ کھلا۔ راہداری میں ایک بُڈھا کھڑا تھا۔ اُس نے بغور مجھے دیکھا، پھر بولا۔ ''کیا تم فلیچر ہی ہوتا؟''

''ہاں، اور میں ابھی ابھی گاؤں میں وارد ہُوا ہوں۔ مجھے سفر کرتے ہُوئے کئی روز بیت گئے ہیں۔''

اُس نے لحہ بھر کے لیے میری بات پر غور کیا، پھر کہا۔ ''بہتر ہے کہ تم اندر آ جاؤ۔''

میں ناتراشیدہ لکڑی اور ٹُوٹے پُھوٹے فرنیچر سے بھرے ایک تنگ اور غلیظ کمرے میں داخل ہُوا۔ آتش دان میں جلنے والی لکڑی روشنی کا واحد ذریعہ تھی، جس سے میں کمرے میں کب نکال کر بیٹھے ہُوئے لوگوں کو دیکھ سکتا تھا۔ بڈھا خشم گینی سے مجھے ایک کُرسی کے پاس لے گیا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی اُسی کُرسی سے اُٹھا تھا۔ بیٹھنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ میں اپنا سر گھما کر اردگرد کے ماحول اور کمرے میں بیٹھے دُوسرے لوگوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن آگ کی حدّت خُوش گوار تھی اور میں کچھ دیر تک محض اُس کے شعلوں کو تکتا رہا، دھیرے دھیرے خُوش گوار حدّت میرے اندر اُترنے لگی۔ میرے عقب سے آوازیں آ رہی تھی کہ کیا میں ٹھیک ہوں، اگر میں دُور سے آیا ہوں تو کیا میں بُھوکا ہوں اور میں نے اپنی طرف سے بہتر جواب دیے مگر میں آگاہ تھا کہ میرے جواب شاید ہی مناسب تھے۔ آخرکار، سوال و جواب کا سلسلہ ختم گیا اور مجھے احساس ہونے لگا کہ میری وہاں موجودگی کافی بوجھل پن پیدا کر رہی تھی لیکن میں حدّت اور آرام کا موقع ملنے، جس کی میں کم ہی پروا کیا کرتا تھا، پر مسرور تھا۔

بایں ہمہ، میری پشت پر کئی منٹ تک خاموشی طاری رہی تو میں نے مہذب انداز میں اپنے میزبانوں سے بات کرنے کا قصد کیا اور اپنی کُرسی پر گھومتے ہی مجھ اُن کی شناخت نے شدید سکتہ طاری کر دیا۔ گو میں نے الل ٹپ ایک کُٹیا کا انتخاب کیا تھا لیکن میں نے پہچان لیا کہ یہ تو وہی گھر ہے جس میں مَیں نے اِس گاؤں میں رہتے ہُوئے اپنے کئی برس بتائے تھے۔ میری نظریں فوراً اُس کونے کی طرف گئیں -- وہ لحہ جیسے پردے کے پیچھے آ گیا -- اُس مقام کی جانب جو میرا کونا ہُوا کرتا تھا، جہاں کبھی میرا بستر ہوتا تھا، جہاں میں

اپنے پُرسکون لمحات کتب گردانی کرتے یا کسی ملاقاتی سے بات چیت کرتے ہُوئے گذارتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں کھڑکیاں اور اکثر دروازہ بھی تازہ ہَوا کی آمد و رفت کے لیے کھلا رکھا جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جھونپڑی کھلے میدان میں گھری ہوتی تھی اور باہر سے میرے دوستوں کی آوازیں آ رہی ہوتی تھیں جو گھاس پر کاہلی سے پڑے شاعری اور فلسفے پر گفتگو کر رہے ہوتے تھے۔ یادوں کے یہ خُوش گوار ٹکڑے مجھ پر اس قدر قوّت سے حاوی ہُوئے کہ میں اپنے کونے کی طرف دیکھنے کے لیے سر کو سیدھا نہیں کر پایا۔

ایک بار پھر کوئی مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا، شاید مزید کوئی سوال پُوچھ رہا تھا لیکن میں نے صحیح طور سے سنا نہیں۔ میں نے سایوں کے بیچ سے اپنے کونے میں جھانکا، وہاں ایک کم چوڑا پلنگ پڑا تھا جس پر ایک پُرانی سا پلنگ پوش بچھا ہُوا تھا، جو کم و بیش عین اُسی مقام پر تھا جہاں میرا بستر لگا ہُوا کرتا تھا۔ پلنگ مجھے دعوت دیتا ہُوا لگا، اور میں نے بُڈھے کی بات کاٹی جو کچھ کہہ رہا تھا۔

”دیکھو۔“ میں بولا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ یہ کچھ بدتہذیبی ہے۔ لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ میں نے آج بہت طویل سفر کیا ہے۔ مجھے حقیقتاً لیٹنے اور سونے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، چاہے یہ محض چند منٹ ہی کے لیے ہو۔ اُس کے بعد میں تم سے بخوشی باتیں کروں گا۔“

میں نے دیکھا کہ کمرے میں موجود لوگ بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔ پھر ایک نئی آواز آئی، قدرے رُوٹھی ہوئی۔ ”ٹھیک ہے، تب جاؤ۔ نیند لے لو۔ ہماری موجودگی کا خیال کیے بغیر۔“

لیکن میں پہلے ہی بے ترتیب چیزوں کے درمیان سے اپنے کونے کی طرف قدم بڑھا چکا تھا۔ بستر نم معلوم ہُوا اور میرے بوجھ تلے دب کر سپرنگ کڑکڑائے۔ میں نے جُوں ہی کمرے کی سمت اپنی پشت کی میرے دماغ میں سفر کے لمحات کی یلغار ہونے لگی۔ خیالات کی رَو میں بہتے ہُوئے میں بُڈھے کو کہتے سنا۔ ”یہ فلیچر ہے، ٹھیک۔ میرے خدا، یہ تو بُوڑھا ہو گیا ہے۔“

ایک عورت بولی۔ ”کیا ہم اِسے یُوں ہی سونے دیں؟ یہ چند گھنٹوں کے بعد جاگ اُٹھے گا اور پھر ہمیں اِس کے ساتھ قیام کرنا پڑے گا۔“

”اِسے گھنٹہ دو سونے دو۔“ کسی اَور نے کہا۔ ”اگر یہ گھنٹے بھر بعد بھی سوتا رہا تو ہم اِسے اُٹھا دیں گے۔“

اِس موقع پر مجھ پر محض گہری سانسیں چھا گئیں۔

وہ کوئی متواتر یا پُرسکون نیند نہیں تھی۔ میں سونے اور چلنے کے درمیان بہتا رہا، ہمہ وقت میرے پشت پر کمرے سے آوازیں آتی رہیں۔ ایک موقعے پر میں نے ایک عورت کو کہتے ہُوئے سنا۔ ”مجھے نہیں پتا

میں کیسے اِس کے سحر میں گرفتار رہی۔ اب تو یہ چیتھڑوں والا ایک خستہ حال شخص ہے۔"

نیم خوابیدگی کے عالم میں مَیں اپنے آپ سے اُلجھتا رہا کہ یہ الفاظ میرے بارے میں تھے یا شاید ڈیوڈ میگس کے متعلق لیکن جلد ہی نیند نے ایک بار پھر مجھے آگھیرا۔

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو کمرہ تاریک اور سرد ہو چکا تھا۔ میرے عقب میں اب بھی دِھیمی دِھیمی آوازیں تھیں لیکن گفتگو ذرا بھی میرے پلے نہ پڑی۔ اب میں اپنے اِس طرح سو جانے پر پریشان ہو گیا تھا اور چند لمحوں تک دِیوار کی جانب منہ کیے بے حس و حرکت پڑا رہا۔ لیکن میری کسی حرکت نے میرے جاگ اُٹھنے کا بھانڈا پھوڑ دیا کیوں کہ عام گفتگو سے ہٹ کر ایک عورت پکاری۔ "اوہ، دیکھو، دیکھو۔" کچھ سرگوشیوں کا تبادلہ ہُوا، پھر میں نے کسی کے اپنے کونے کی سمت آنے کی آواز سنی۔ میں نے اپنے کندھے پر نرمی سے رکھے جانے والے ہاتھ کو محسوس کیا اور دیکھا کہ ایک عورت میرے اُوپر جھکی ہُوئی ہے۔ میں نے کمرے کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے اپنا رُخ نہیں بدلا لیکن مجھے محسوس ہُوا کہ کمرے میں مہک دار لکڑی کے بجھتے ہُوئے کوئلوں کی مدہم روشنی پھیلی ہُوئی ہے اور نیم تاریکی میں بھی عورت کا چہرہ دِکھائی دے رہا تھا۔

"اب، فلیچر۔" وہ بولی۔ "وقت ہو گیا ہے کہ ہم باتیں کر لیں۔ میں نے ایک طویل عرصہ تمھارے انتظار میں گذارا ہے۔ میں اکثر تمھارے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔"

میں نے اُسے غور سے دیکھنے کے لیے آنکھیں بھینچیں۔ وہ چالیس کے لگ بھگ تھی اور نیم تاریکی میں بھی میں نے دیکھ لیا کہ اُس کی آنکھوں میں تندیائی افسردگی بھری ہُوئی تھی۔ لیکن بعید دُھندلی یادوں میں بھی اُس کے چہرے نے مجھے جھنجھوڑا نہیں۔

"مجھے افسوس ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے تمھیں پہچانا نہیں۔ لیکن اگر ہم کہیں مل چکے ہیں تو مجھے معاف کر دینا۔ آج کل میرے حواس میرا ساتھ نہیں دے رہے۔"

"فلیچر۔" وہ بولی۔ "جب ہم ایک دُوسرے کو جانتے تھے تب میں جوان اور حسین ہُوا کرتی تھی۔ میں نے تمھاری بُوجا کی اور تم جو کہتے وہ مجھے ایک جواب کے مانند لگا کرتا تھا۔ اب تم دوبارہ یہاں لوٹ آئے ہو۔ میں کئی برسوں سے تمھیں یہ بتانا چاہتی تھی کہ تم نے میری زندگی برباد کر دی۔"

"تم ناانصافی کر رہی ہو۔ یہ درست ہے کہ میں بہت سے چیزوں کے بارے میں غلط تھا۔ لیکن میں نے کبھی اپنے پاس جوابات ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں نے اُس زمانے جو کچھ بھی کہا وہ ہمارا فرض تھا، ہم سب کا، کہ ہم اپنا اپنا حصہ ڈالیں۔ ہم معاملات کے بارے میں یہاں کے عام لوگوں سے کہیں زیادہ جانتے تھے۔ اگر ہم جیسے لوگ ہی، اِس تاویل پر کہ ہم ابھی کچھ نہیں جانتے، بلا جواز تاخیر کرتے تو یہاں کون تھا جو یہ کام

کرتا۔ میں نے کبھی دعوی نہیں کیا کہ میرے پاس جوابات ہیں۔ نہیں، تم ناانصافی سے کام لے رہی ہو۔"

"فلیچر۔" اُس نے کہا۔ اُس کا لہجہ غیر متوقع طور پر شائستہ تھا۔ "تم میرے ساتھ ہم بستری کیا کرتے تھے، لگ بھگ ہر بار جب بھی میں یہاں تمھارے کمرے میں آتی تھی۔ اِسی کونے میں ہم نے تمام خُوب صُورت غلیظ کام کیے ہیں۔ اب یہ سوچنا بھی عجیب لگتا ہے کہ میں جسمانی طور پر تم سے کتنی متاثر تھی۔ اور اب تم محض ایک بدبودار چیتھڑوں کا ڈھیر ہو۔ لیکن مجھے دیکھو — میں اب بھی دِل کش ہوں۔ میرے چہرے پر ہلکی سی جھرّیاں پڑ گئی ہیں لیکن جب میں گاؤں کی گلیوں میں نکلتی ہوں تو میں ایسے لباس زیبِ تن کر کے نکلتی ہوں جو میں نے خاص طور پر اپنے بدن کی نمائش کے لیے تیار کیے ہیں۔ اب بھی بہت سے مرد مجھے چاہتے ہیں۔ لیکن تم، اب تمھاری طرف کوئی عورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گی۔ محض ایک تعفن زدہ چیتھڑوں اور گوشت کا ڈھیر۔"

"تم مجھے یاد نہیں ہو۔" میں بولا۔ "اور اُن دِنوں میرے پاس جنس پرستی کا وقت بھی نہیں تھا۔ مجھے دُوسرے بہت سے معاملات کی فکر گھیرے رکھتی تھی۔ زیادہ سنجیدہ معاملات۔ بہت خُوب، اُن دِنوں، میرے بارے میں غلط فہمیاں بہت تھیں۔ لیکن میں نے اُنھیں دُور کرنے کے بے حد کوششیں بھی کیں۔ دیکھو، میں اب بھی سفر میں ہوں۔ میں کبھی نہیں رُکا۔ میں سفر در سفر کرتا رہا تا کہ مجھ سے جو بھی نقصان ہُوا ہے اُس کا ازالہ کر سکوں۔ مجھ سے زیادہ یہ بات اُس زمانے کے کسی اَور شخص کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ مثال کے طور پر میکس نے معاملات کو سدھارنے میں اِتنی جاں فشانی نہیں کی ہوگی۔"

وہ عورت میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہی تھی۔

"اپنے آپ کو دیکھو۔ میں اکثر یہ کیا کرتی تھی، اپنی اُنگلیاں تمھارے بالوں میں پھیرتی تھی۔ اِس غلاظت کے ڈھیر کو دیکھو۔ مجھے یقین ہے کہ تم میں ہر نوع کے جراثیم پل رہے ہیں۔" لیکن وہ دِھیرے دِھیرے میری جٹاؤں میں اپنی اُنگلیاں بھی پھیرتی رہی۔ مجھے اِس سے کوئی جنسی تحرک محسوس نہیں ہُوا جس کی شاید اُسے مجھ سے تمنّا تھی۔ اِس کے بجائے مجھے اُس کا چُھونا ممتا بھرا لگ رہا تھا۔ بلا شبہ، مجھے یُوں لگا جیسے میں کسی حفاظتی حصار میں پہنچ گیا ہوں اور مجھے ایک بار پھر نیند آنے لگی۔ لیکن اُس نے اچانک اُنگلیاں پھیرنا بند کر کے میرے پیشانی پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔

"تم ہم سب لوگوں کے ساتھ اب جاگتے کیوں نہیں؟ تم اپنی نیند لے چکے ہو۔ تمھیں بہت سی وضاحتیں دینی ہیں۔" یہ کہتے ہُوئے وہ اُٹھ کر چلی گئی۔

میں نے پہلی مرتبہ کروٹ لے کر کمرے کا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ عورت فرش پر پڑے کاٹھ

کباڑ سے راستہ بناتی ہُوئی جا کر آتش دان کے پاس ایک جھولنے والی کُرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے دم توڑتی ہُوئی آگ کے قریب کبڑے ہوکر بیٹھے تین اَور لوگوں کو دیکھا۔ اُن میں سے ایک وہی بُڈھا تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ دُوسرے دو— جو ایک دُوسرے کے ساتھ لکڑی کی گیلی جیسی چیز پر بیٹھے تھے— کم وبیش مجھ سے بات کرنے والی کی ہم عمر عورتیں لگتی تھیں۔

بُڈھے نے دیکھ لیا کہ میں نے کروٹ بدل لی ہے۔ اُس نے دِیگر کو اشارہ کیا کہ میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ چاروں سیدھے ہوکر بیٹھ ہو گئے۔ اُنھوں نے جس انداز میں یہ حرکت کی تھی اُس سے لگ رہا تھا کہ میرے سونے کے دوران وہ میرے بارے میں باتیں کرتے رہے ہیں۔ درحقیقت، اُن کی طرف دیکھتے ہی میں تقریباً سمجھ گیا کہ اُن کے بیچ کیا گفتگو ہُوئی ہوگی۔ مثال کے طور پر، میں سمجھ سکتا تھا کہ اُنھوں کچھ وقت گھر سے باہر لڑکی کے ساتھ ہونے والی میری ملاقات پر اظہارِ تشویش اور اُس کے بارے میں میرے استفسارات کے اثرات میں صرف کیا ہوگا۔

”وہ تمام بے تاثر ہیں۔“ بُڈھے نے کہا ہوگا۔ ”اور میں نے سنا کہ اُس نے اِسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔“

جس پر، بلا شک وشبہ، تختے پر بیٹھی ہوئی ایک عورت نے کہا ہوگا۔ ”لیکن وہ اب زیادہ مضر ثابت نہیں ہوسکتا۔ ہمارے دور میں ہم مسحور تھے۔ لیکن آج کل وقتاً فوقتاً یہاں ہونے والی عجیب وغریب باتیں اِس طرح شکست وریخت زدہ دِکھائی دیتی ہیں— گویا پُرانے وقتوں کی وہ باتیں اب اپنا سحر کھو چکی ہیں۔ بہرحال، لوگ آج اُسے پسند کرتے ہیں جو اُن کی زندگی میں کوئی تبدیلی لائے۔ اُنھیں خود نہیں علم کہ وہ کس پر اعتبار کریں۔“

بُڈھے نے اپنا سر ہاں میں مارا ہوگا۔ ”میں نے اُس لڑکی کا اِسے دیکھنے کا انداز دیکھا ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہ اب ترحم آمیز دِکھائی دیتا ہے۔ لیکن ایک زمانہ تھا جب اِس کی اَنا سے کچھ لوگوں کو تسکین ملتی تھی، اِسے نوجوان طبقے کی حمایت حاصل تھی۔ دیکھو، وہ کیسے اِس کے خیالات جاننے کے متمنی ہیں، پھر کوئی اِسے روک نہیں پائے گا۔ پہلے جیسے ہی معاملہ ہو جائے گا۔ یہ اُنھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگے گا۔ اُس جیسی نوجوان لڑکیوں کے پاس اعتبار کرنے کے لیے بہت کم ہے۔ اِس جیسا بھڑوا بھی اُنھیں مقصد دے سکتا ہے۔“

میرے سونے کے تمام وقت کے دوران اُن کے مابین زیادہ تر اسی نوع کی گفتگو ہوتی رہی ہوگی۔ لیکن اب، میں نے اُن کا اپنے کونے سے مشاہدہ کیا، وہ تمام ہوتی آگ پر نظریں جمائے خاموش شرمندگی کے

عالم بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد، میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُن چاروں نے مضحکہ خیز انداز میں مجھ سے نظریں چُرائے رکھیں۔ میں چند لمحوں تک اُن میں سے کسی کے بولنے کا منتظر رہا۔ بالآخر میں بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں جلد سو گیا تھا تاہم مجھے اندازہ ہے تم لوگ کیا باتیں کر رہے تھے۔ خُوب، تمھیں یہ جاننے میں دِلچسپی ہوگی کہ اب میں وہی کرنے جا رہا ہوں جس کا تمھیں ڈر تھا۔ میں ابھی اُن نوجوانوں کی کُٹیا میں جا رہا ہوں۔ میں اُنھیں بتانے جا رہا ہوں کہ اُنھیں اپنی بھرپُور توانائیوں کے ساتھ اپنے تمام خوابوں اور اِس دُنیا میں سدا قائم رہنے والی نیکی کے حصول کی تمنا کے لیے کیا کرنا ہے۔ اپنے آپ کو دیکھو، تم لوگوں پر ترس آتا ہے۔ اپنی کُٹیا میں پڑے ہُوئے، کچھ بھی کرنے سے خوف زدہ، مجھ سے، میکس سے، اُس زمانے کے ہر شخص سے سہمے ہُوئے لوگ۔ دُنیا میں کچھ بھی کرنے سے اِس سے دہشت زدہ کہ ایک بار ہم سے کچھ غلطیاں سرزد ہو گئی تھیں۔ خُوب، وہ نوجوان تمھاری گذشتہ برسوں کی کاہلی کی تبلیغ کے باوجود بھی ابھی اِتنے نہیں بگڑے۔ میں اُن سے بات چیت کروں گا۔ میں تمھاری تمام معذرت خواہانہ کوششوں کو آدھ گھنٹے میں ملیامیٹ کر دوں گا۔“

”تم نے دیکھا،“ بُڈھے نے دُوسرے افراد سے کہا۔ ”میں جانتا تھا یُوں ہی ہوگا۔ ہمیں اِسے روکنا چاہیے، لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

میں نے فرش روندتے ہُوئے کمرے کی دُوسری جانب جا کر اپنا تھیلا اُٹھایا اور باہر اندھیرے میں نکل آیا۔

جب میں باہر نکلا تو لڑکی اب بھی کھڑی تھی۔ لگتا تھا جیسے اُسے میری آمد کی توقع ہو اور وہ سر ہلاتے ہُوئے میری رہنمائی کرنے لگی۔

رات دُھند بھری اور تاریک تھی۔ ہم کُٹیاؤں کے درمیان سے تنگ راستوں پر موڑ مُڑتے ہُوئے چلتے رہے۔ ہم کچھ ایسی کُٹیاؤں کے پاس سے بھی گذرے جن کی حالت بے حد خستہ اور شکست و ریخت کا شکار تھی کہ مجھے محسوس ہُوا کہ میں اگر محض دوڑتا ہُوا اُن سے پُوری قوت سے ٹکرا جاؤں تو دھڑام سے زمین بوس ہو جائیں گی۔

لڑکی مجھ سے چند قدم آگے رہی۔ وہ کبھی کبھار پیچھے نگاہ ڈال کر مجھ دیکھ لیتی تھی۔ ایک بار اُس نے کہا۔ ”وینڈی بے حد خُوش ہوگی۔ پہلے جب آپ وہاں سے گذرے تھے تو اُسے یقین تھا کہ یہ آپ ہی ہیں۔ اب تک، اُس نے قیاس کر لیا ہوگا کہ وہ درست تھی کیوں کہ میں اُس سے اِتنی دیر دُور رہی ہوں اور اُس نے تمام لوگوں کو بھی جمع کر لیا ہوگا۔ وہ سب انتظار کر رہے ہوں گے۔

”کیا تم لوگوں نے ڈیوڈ میکس کا بھی ایسا ہی استقبال کیا تھا؟“

”اوہ، ہاں۔ جب وہ آئے تو ہم واقعی بے حد پُرجوش ہو گئے تھے۔“

”مجھے یقین ہے کہ اُس نے اِسے بہت تسکین بخش پایا ہوگا۔ اُسے ہمیشہ اپنی اہمیت جتانے کے لیے کوئی نہ کوئی مبالغہ آمیز موقع مل ہی جاتا ہے۔“

”وَینڈی کہتی ہے کہ میکس ایک دِلچسپ شخصیت تھی لیکن، خُوب، اہم تو آپ تھے۔ اُس کے خیال میں آپ واقعی اہم تھے۔“

میں نے اُس کی بات پر ایک لمحے کے لیے غور کیا۔

”تمھیں پتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے بہت سے معاملات میں اپنا ذہن بدل لیا ہے۔ اگر وَینڈی یہ توقع کر رہی ہے کہ میں وہی کچھ کہوں گا جو برسوں پہلے کہا کرتا تھا تو اُسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

لگتا تھا جیسے لڑکی نے میری بات سُنی ہی نہیں۔ وہ کُٹیاؤں کے جھنڈ میں میری بامقصد رہنمائی کرتی رہی۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھے پتا چلا کہ درجن بھر کے قریب قدموں سے کوئی ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ شروع میں مَیں سمجھا شاید گاؤں کے کوئی دیہاتی سیر کے لیے نکلا ہوگا اور واپسی سے گریزاں ہے۔ لیکن پھر لڑکی سڑک کنارے لگے ایک لیمپ تلے رُکی اور اُس نے ہمارے عقب میں دیکھا۔ میں بھی ٹھہر کر مُڑ گیا۔ وسطِ عمر کا ایک شخص گہرے رنگ کا اوورکوٹ پہنے ہماری سمت آ رہا تھا۔ قریب پہنچتے ہی اُس نے مُسکرائے بغیر اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھ سے ملایا۔

”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”تو تم یہاں آ ہی گئے۔“

تب میں نے جانا کہ میں اُس شخص کو جانتا ہوں۔ میں نے اُسے تب سے نہیں دیکھا تھا جب ہم دس برس کے تھے۔ اُس کا نام روجر بٹن تھا اور وہ اُن دِنوں میرا ہم مکتب ہُوا کرتا تھا جب اپنے خاندان کے واپس انگلستان لوٹنے سے دو برس قبل کینیڈا میں مکتب میں پڑھتا تھا۔ روجر بٹن اور میں کوئی خاص قریب نہیں تھے لیکن چُوں کہ وہ ایک شرمیلا لڑکا اور انگلستان ہی سے تھا اِس لیے وہ کچھ دِنوں تک میرے پیچھے پیچھے پھرتا رہا تھا۔ میں نے اُس کے بعد اُس کے بارے میں نہیں سنا تھا۔ اب اُسے سڑک کے لیمپ تلے اُس کا جائزہ لے کر میں نے دیکھا کہ وقت اُس پر مہربان نہیں رہا تھا۔ وہ گنجا ہو گیا تھا، اُس کا چہرہ چیچک اور جھریوں زدہ تھا اور اُس کا سارا جثہ خستہ حالی سے سمٹا ہُوا تھا۔ اِس کے باوجود بھی میں نے اپنے پُرانے ہم جماعت کو پہچاننے میں کوئی خطا نہیں کھائی تھی۔

''روجر۔'' میں نے کہا۔ ''میں اِس وقت اِس نوجوان خاتون کے دوستوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ وہ میرے لیے جمع ہُوئے ہیں۔ ورنہ میں سیدھا تمھیں ملنے آتا۔ کیوں کہ میرے ذہن میں اگلا کام آج کی رات نیند لینے سے پہلے یہی تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ چاہے کتنی ہی رات گئے اِن نوجوانوں کی کُٹیا میں کیوں نہ لگ جائے اِس کے بعد میں جا کر روجر کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔''

''فکر مت کرو۔'' روجر بات کرنے کے ساتھ ساتھ دوبارہ چلنے لگا۔ ''مجھے پتا ہے تم کتنے مصروف ہو۔ لیکن ہمیں بات کر لینا چاہیے۔ پُرانے وقت کی باتیں۔ جب تم نے مجھے آخری بار دیکھا تھا—میرا مطلب ہے کہ مکتب میں—میرا خیال ہے کہ میں خاصا نحیف و نزار تھا۔ لیکن تمھیں پتا ہے کہ جب میں چودہ پندرہ برس کا ہُوا تو سب کچھ یک سر بدل گیا۔ میں واقعی مضبوط ہو گیا۔ لیڈر قسم کا شخص بن گیا۔ لیکن تمھیں کینیڈا سے گئے ہُوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ میں ہمیشہ حیران ہُوا کرتا تھا کہ اگر ہم پندرہ برس کی عمر میں ملے ہوتے تو کیا ہوتا۔ میں تمھیں یقین دِلاتا ہوں کہ ہمارے درمیان معاملات بے حد مختلف ہوتے۔''

جب اُس نے یہ کہا تو یادوں کا سیلاب آ گیا۔ اُن دِنوں روجر بٹن میرا پرستار تھا اور میں جواب میں اُسے متواتر مارتا پیٹتا رہتا تھا۔ تاہم، ہم دونوں کے درمیان ایک مشتاق یگانت تھی کہ میری مار پیٹ دراصل اُس کے اپنے فائدے میں ہے۔ کبھی اچانک کھیل کے میدان میں اُس کے پیٹ میں گھونسا دے مارتا تو کبھی راہداری میں پکڑ کر اُس کا بازو مروڑ کر کمر سے لگا دیتا یہاں تک کہ وہ چیخنے چِلّانے لگتا۔ میں یہ سب اُسے مضبوط بنانے کے لیے کِیا کرتا تھا۔ اِس طرح ایسے حملوں کا سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ وہ مجھ سے خوف کھانے لگا تھا۔ میرے ہم راہ چلتے ہُوئے خستہ حال شخص کی بات سنتے ہُوئے یہ سب مجھے یاد آ گیا۔

''بے شک۔'' روجر نے، شاید میرے خیالات کی رَو کو بھانپتے ہُوئے، اپنی بات جاری رکھی۔ ''شاید یہ درست ہی ہو کہ اگر تم مجھ سے ایسا سلوک نہ کرتے تو میں جو پندرہ برس کی عمر میں بنا کبھی نہ بن پاتا۔ خیر، میں اکثر حیران ہوتا تھا کہ اگر ہم چند برس بعد ملے ہوتے تو کیا ہُوا ہوتا۔ میں واقعی اُس وقت بڑی چیز بن گیا تھا۔''

ہم ایک بار پھر کُٹیاؤں کے درمیان میں سے آڑھی ٹیڑھی تنگ گلیوں میں سے گذر رہے تھے۔ لڑکی اب بھی راستہ دِکھا رہی تھی البتہ اب وہ کافی تیز چل رہی تھی۔ اکثر ہم اپنے سامنے کسی موڑ پر اُس کی مُڑتی ہُوئی جھلک ہی دیکھ پاتے۔ مجھے یہ خیال چمٹ گیا کہ ہم چوکنا رہنا چاہیے، کہیں ہم اُسے کھو ہی نہ بیٹھیں۔

''آج، بلا شک و شبہ۔'' روجر بٹن کہہ رہا تھا۔ ''میں نے ایک چھوٹا سا قصد کر لیا۔ لیکن مجھے کہنا پڑتا ہے کہ، پُرانے دوست، تم بہت بُری حالت میں دِکھائی دے رہے ہو۔ تمھارے مقابلے میں قوی ہوں۔ اِس

بات کا بُرا مت ماننا لیکن اب تم واقعی محض ایک بُوڑھے بے کار شخص ہو، کیا نہیں ہو؟ لیکن تمھیں پتا ہے، تمھارے چلے جانے کے بعد بھی ایک لمبے عرصے تک میں تمھاری پرستاری میں گرفتار رہا۔ کیا فلیچر یہ کرتا؟ اگر فلیچر مجھے یہ کرتے دیکھتا تو کیا سوچتا؟ اوہ، ہاں یہ بس لگ بھگ پندرہ برس کی عمر تک رہا کہ میں ہر چیز کو تمھاری نظر سے دیکھتا تھا۔ پھر مجھ میں طیش بھر گیا، بے شک۔ حد یہ کہ اب بھی، میں اب بھی بعض اوقات اِس کے بارے میں سوچتا ہوں۔ میں پیچھے دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اچھا تو وہ بس مکمل طور پر غلیظ تھا۔ اُس کے اُس عمر میں میرے جتنے مضبوط پٹھے نہیں تھے، مجھ سے کم اعتماد تھا لیکن وہ بھرپور فائدہ اُٹھایا کرتا تھا۔ ہاں، ماضی میں دیکھنے پر یہ نہایت واضح ہے کہ تم ایک چھوٹے سے غلیظ شخص تھے۔ بے شک، میرا یہ بات اِس کی دلالت نہیں کہ تم اب بھی ہو۔ ہم سب بدل جاتے ہیں۔ میں اِس حقیقت کو تسلیم کرنے پر تیار ہوں۔"

"کیا تم کافی عرصے سے یہاں رہ رہے ہو؟" میں نے موضوع بدلنے کی نیت سے دریافت کیا۔

"اوہ، کم و بیش سات برس سے۔ بلا شبہ، یہاں کے لوگ تمھاری بہت باتیں کیا کرتے تھے۔ میں بعض اوقات اُنھیں اپنے اور تمھارے ساتھ کے بارے میں بتاتا۔ 'لیکن میں اُسے یاد بھی نہیں ہوں گا۔' میں ہمیشہ اُنھیں کہتا۔ 'وہ بھلا ایک سُوکھے سڑے چھوٹے سے لڑکے کو کیوں یاد رکھے گا جسے وہ مارا پیٹا کرتا تھا اور جو اُس کی پکار پر حاضر رہتا تھا؟ بہر حال، یہاں کے نوجوان اِن دِنوں تمھاری بہت باتیں کرتے رہے ہیں۔ یقیناً، جس نے کبھی تمھیں نہیں دیکھا وہی تمھارا سب سے زیادہ پرستار بن گیا۔ میرا خیال ہے کہ تم اِس سب ہی کا فائدہ اُٹھانے یہاں آئے ہو۔ میں اب بھی تمھیں الزام نہیں دوں گا۔ تمھیں کوشش کرنے اور بچی کچھی عزت بچانے کا حق حاصل ہے۔"

اچانک ہی ہم نے اپنے آپ کو ایک کھلے میدان کے سامنے پایا اور ہم دونوں تھم گئے۔ میں نے دیکھا کہ ہم گاؤں سے باہر نکل آئے تھا اور آخری جھونپڑیاں ہم سے کچھ پیچھے رہ گئی تھیں۔ میرا ڈر پُورا ہو گیا تھا، ہم لڑکی گنوا بیٹھے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ دراصل ہم تھوڑی دیر سے لڑکی کے پیچھے نہیں رہے تھے۔

اُسی لمحے چاند اُبھر آیا اور میں نے دیکھا کہ ہم ایک بسیط مرغزار کے کنارے پر کھڑے تھے — جو چاندنی میں میری تاحدِ نگاہ سے پرے تک پھیلا ہُوا تھا۔

روجر بٹن میری جانب مُڑا۔ چاندنی میں اُس کا چہرہ نرم خُو اور بے حد شفیق دِکھائی دے رہا تھا۔

"اب بھی۔" وہ بولا۔ "یہ وقت معاف کر دینے کا ہے۔ تمھیں زیادہ فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے دیکھا کہ انجام کار ماضی کی کچھ چیزیں تمھارے سامنے آئیں گی۔ لیکن اُس وقت ہم اپنی نوجوانی کے ایام میں کیے گئے افعال کے ذمہ دار نہیں ٹھیرائے جا سکتے۔"

‘‘اِس میں کوئی شک نہیں کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔’’ میں نے کہا۔ پھر میں نے مُڑ کر اندھیرے میں دیکھا۔ ‘‘لیکن اب مجھے یہ نہیں پتا کہ کہاں جانا ہے۔ تمھیں پتا ہے کہ کچھ نوجوان اپنی کُٹیا میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ اب تک وہ میرے لیے آگ تازہ اور چائے تیار کر چکے ہوں گے۔ اور کچھ گھر کے بنے ہُوئے کیک ہَل شاید کوئی اچھا سا دم پخت بھی۔ میں جس وقت گاؤں میں داخل ہُوا تھا تب ہی سے وہ نوجوان خاتون میرے تعاقب میں تھی جس کی رہنمائی میں ہم کچھ دیر قبل جا رہے تھے، وہ سب اب تالیاں بجا رہے ہوتے۔ مُسکرا رہے ہوتے، میرے چوگرد داد و تحسین بھرے چہرے ہوتے۔ یہ سب کسی مقام پر میرا منتظر تھا۔ لیکن مجھے نہیں پتا کہ کہاں جانا ہے۔’’

روجر بٹن نے کندھے اُچکائے۔ ‘‘فکر مت کرو، تم وہاں آسانی سے پہنچ جاؤ گے۔ اِس کے علاوہ، تمھیں پتا ہے، وہ لڑکی اِس غلط فہمی کا شکار تھی کہ تم پیدل چل کر وینڈی کی کُٹیا تک پہنچ سکتے ہو۔ وہ بہت دُور ہے۔ تمھیں بس پکڑنے کی ضرورت ہے۔ لیکن پھر بھی کافی طویل سفر ہے۔ میں کہوں گا کہ لگ بھگ دو گھنٹے کا۔ لیکن پریشان مت ہو، میں تمھیں وہاں تک لے جاؤں گا جہاں سے بس ملے گی۔’’

اِس کے ساتھ ہی ہم جھونپڑیوں کے درمیان میں چلنے لگے۔ اُس کے پیچھے پیچھے چلتے ہُوئے مجھے احساس ہُوا کہ بہت دیر ہو گئی ہے اور میرا ساتھی سونے کے لیے بے چین ہو گا۔ ہم کئی منٹوں تک کُٹیاؤں کے درمیان میں چلتے رہے اور پھر اُس نے مجھے گاؤں کے چوراہے تک پہنچا دیا۔ دراصل، وہ بے حد تنگ اور اُجڑا پُجڑا چورستہ تھا جسے چوراہا کہنا بھی درست نہیں تھا۔ اُس کی وسعت سڑک کنارے لگے لیمپ کے چبوترے سے بس کچھ ہی زیادہ تھی۔ وہاں لگے ہُوئے ایک لیمپ کی روشنی پھیلی ہُوئی تھی جس میں چند دُکانیں دِکھائی دے رہی تھیں جو رات بھر کے لیے بند پڑی تھیں۔ وہاں مکمل سکوت طاری تھا اور کہیں سے کوئی ہلکی سی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ زمین پر ہلکی سی دُھند چکرا رہی تھی۔

روجر بٹن سبزے تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹھہر گیا اور اُس نے اشارہ کیا۔

‘‘وہاں۔’’ وہ بولا۔ ‘‘اگر تم وہاں ٹھہرو تو ایک بس آئے گی۔ میں تمھیں بتا چکا کہ سفر کم نہیں ہے۔ کم سے کم دو گھنٹے کا ہے۔ لیکن پریشان نہیں ہونا، مجھے یقین ہے کہ نوجوان تمھارا انتظار کریں گے۔ تم دیکھ چکے ہو کہ اُن کے پاس آج کل یقین کرنے کے لیے بہت کم ہے۔’’

‘‘بہت دیر ہو گئی ہے۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘تمھیں یقین ہے کہ بس آئے گی؟’’

‘‘او، ہاں۔ بالکل۔ تمھیں انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن بالآخر بس آئے گی۔’’ پھر اُس نے یقین دہانی کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ‘‘مجھے معلوم ہے کہ یہاں ٹھہرنے پر ذرا تنہائی محسوس ہو گی۔ لیکن بس کے آنے

کے بعد تمھارے جذبات اُبھر آئیں گے، میرا اعتبار کرو۔ اوہ، ہاں ۔ وہ بس ہمیشہ لطف اندوز ہوتی ہے۔ خُوب روشن ہوگی اور ہمیشہ ہنستے، مذاق کرتے اور کھڑکی سے باہر اشارے کرتے ہنس مُکھ لوگوں سے بھری ہوتی ہے۔ ایک بار تم بس پر سوار ہو گئے تو تم حدت اور آرام دہی محسوس کرو گے اور دُوسری سواریاں تم سے باتیں کرنے لگیں گی۔ شاید وہ تمھیں کھانے پینے کے لیے بھی کچھ دے دیں۔ گیت بھی گائے جا رہے ہوں گے۔ اِس کا انحصار ڈرائیور پر ہے۔ کچھ ڈرائیور اِس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، کچھ نہیں کرتے۔ اچھا فلیچر، تم سے مل کر خُوشی ہوئی۔”

ہم نے ہاتھ ملائے، پھر وہ مُڑ کر چلا گیا۔ میں اُسے دو کٹیاؤں کے بیچ اندھیرے میں غائب ہوتا دیکھتا رہا۔

میں سبزے کی طرف بڑھا اور میں نے اپنا بیگ لیمپ پوسٹ کے نیچے رکھ دیا۔ میں کافی فاصلے سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز سننے لگا لیکن رات اب بھی کاملاً سکوت بھری تھی۔ با ایں ہمہ، مجھے روجر بٹن کے بس کے ذکر سے مسرت ہو رہی تھی۔ مزید، میں اپنے سفر کے اختتام پر اپنا استقبال کرنے والوں کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ نوجوانوں داد و تحسین بھرے چہرے۔ اور میرے اندر گہری خُوش اُمیدی کی لہریں اُٹھنے لگیں۔

☆☆☆☆

کازُواو اِشیگُورَو

ترجمہ: نجم الدّین احمد

جنگ کے بعد کا موسمِ گرما

پھٹے ہُوئے کمبل جیسی کسی چیز نے--- میں شام کے دُھندلکے میں سے واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا– ایک درخت کے تنے کو نیچے سے اُوپر تک جکڑ لیا تھا اور ہَوا میں دھیرے دھیرے اُوپر کو بلند ہو رہی تھی۔ ایک اَور درخت ٹُوٹ کر جھاڑیوں پر، گر چکا تھا۔ پتّے اور ٹُوٹی ہُوئی شاخیں ہر سمت بکھری ہُوئی تھیں۔ میں نے جنگ، تباہی اور بربادی کے بارے میں سوچا جنھیں میں نے اپنی زندگی کے آغاز کے برسوں میں دیکھا تھا۔ میں بِنا کچھ بولے باغ کو تکنے لگا تو میری دادی اماں بتا رہی تھیں کہ کیسے اُس صبح بگولوں والا کاگوشیما سے گذرا تھا۔

چند دِنوں میں باغ کو صاف کر کے ٹُوٹے ہُوئے درخت کی تمام شاخوں اور مردہ پتّوں کو ایک دِیوار کے ساتھ جمع کر دیا گیا تھا۔ تب میں نے پہلی بار باغ کے عقب سے جھاڑیوں سے ہو کر درخت کی سمت جاتا پتّھروں کا راستہ دیکھا۔

اُن جھاڑیوں پر حالیہ حملے کے چند آثار موجود تھے؛ وہ اپنے جوبن پر تھیں، اُن کے پتّے شان دار اور رنگت عجیب وغریب تھی--- سُرخ، نارنجی اور بنفشی کی جھلک والے کہ ویسی کوئی شے مجھے ٹوکیو میں کبھی دِکھائی نہیں دی تھی۔ مختصر یہ کہ باغ کی اب ویسا خستہ حال نہیں رہا تھا جیسا میں نے اپنی آمد کی رات دیکھا تھا۔

گھر کے برآمدے اور پتّھروں کے راستے کے بیچ گھاس کا ایک ہم وار قطعہ تھا۔ جہاں، ہر صبح طلوعِ آفتاب سے قبل، میرے دادا اپنی تنکوں کی چٹائی بچھا کر ورزش کیا کرتے تھے۔ میں باغ سے آنے والے آوازوں سے جاگ اُٹھتا، پھرتی سے لباس پہنتا اور باہر برآمدے میں چلا جاتا۔ میں اپنے دادا کا کیمونو میں ڈھانپا اور حرکت کرتا ہُوا جسم علی الصبح کی روشنی میں دیکھتا۔ وہ توانائی سے بھرپُور انداز میں جھکتے اور اپنا بدن کھینچتے، اور زمین پر دوڑ لگاتے ہُوئے اُن کے قدم ہلکے ہوتے۔ میں روزمرہ کی اِن حرکات کے دوران چُپ چاپ بیٹھا انتظار کرتا رہتا۔ بالآخر، سُورج اتنا نکل آتا کہ دُھوپ دِیوار پر اور باغ میں پڑنے لگتی؛ اور میرے اِرد گرد پھیل جاتی کہ برآمدے کا پالش کیا ہُوا لکڑی کا چبوترہ دُھوپ کی چتّیوں سے ڈھپ جاتا۔ پھر آخر میں میرے دادا کا چہرہ سخت پڑ جاتا اور وہ جوڈو کرنے لگتے: ترت مُڑنا، بدن کے منجمد انداز اور--- اُن میں سے سب سے بہترین--- حملہ کرنے والے انداز، ہر حملے کے ساتھ ایک چھوٹی سے چیخ آتی۔ اُنھیں دیکھتے ہُوئے میں صاف

طور پر دیکھتا کہ ہر سمت سے اُن کی طرف آنے والے غیر مرئی حملہ آور اُن کی بے انتہا مہارت کے سامنے بے بسی سے گرتے جا رہے ہیں۔

ہر میقات کے بعد، میرے دادا پتھریلے راستے پر چلتے ہُوئے باغ کے عقب میں دیوار کے ساتھ لگے سب سے جسیم درخت کے ساتھ مقابلے کے لیے جاتے۔ وہ کئی سیکنڈوں تک درخت کے سامنے کھڑے رہتے، یقینی طور پر بالکل ساکت۔ پھر وہ اچانک چیخ کے ساتھ اُس پر گھونسا مارتے اور اُسے اُٹھا کر اپنی پیٹھ پر لادنے کی کوشش کرتے۔ وہ چار یا پانچ مرتبہ یہ حملہ دُہراتے، ہر بار اُسی پُرغور خاموشی کے ساتھ گویا اِس طرح وہ درخت کو اچانک پکڑ لیں گے۔

جُوں ہی میرے دادا اَندر کپڑے تبدیل کرنے جاتے میں باغ میں جا کر کچھ دیر قبل دیکھی ہُوئی حرکات کو دُہرانے کی سعی کرنے لگتا۔ یہ امر حرکات کے آس پاس میرے مفصل منظرناموں کی تشکیل کا سبب بنتا۔۔۔ وہ منظرنامے جو اُس جگہ ہر لحظہ بدلتے رہتے۔ وہ ہمیشہ میرے اور دادا کے رات کے وقت کا گوشیما ریلوے سٹیشن کی بند گلی میں چلنے سے شروع ہوتے۔ تاریکی میں سے سائے نکلتے اور ہم ٹھیر جاتے۔ اُن کا سرغنہ قدم آگے بڑھاتا۔۔۔ نشے میں دُھت، بے ربط گفتگو۔۔۔ ہم سے رقم حوالے کرنے کا مطالبہ کرتا۔ میرے دادا اُنھیں نرم لہجے میں تنبیہ کرتے کہ وہ اُنھیں جانے دیں ورنہ اُن کا نقصان ہوگا۔ اِس بات پر، ہمارے چوگرد تاریکی میں قہقہے لگنے لگتے۔۔۔ غلیظ اور گھناؤنے قہقہے۔ میں اور دادا بے فکرانہ نظروں کا تبادلہ کرتے، پھر پشت سے پشت جوڑ کر مورچے سنبھال لیتے۔ پھر وہ تمام اطراف سے لاتعداد نکل آتے۔ اور میں وہاں باغ میں اُن کی تباہی کا منظر تشکیل دیتا: میں اور دادا، ایک ہم وار منظّم جماعت، اُنھیں ایک ایک کر کے بے ضرر کرتے جاتے۔ انجام کار، ہم اپنے اِرد گرد پھیلے ہُوئے اجسام کا بنظرِ غائر جائزہ لیتے۔ پھر وہ سر ہلاتے اور ہم اپنی راہ پکڑ لیتے۔ بے شک، ہم اِس واقعے پر غیر معمولی جوش و خروش کا اظہار کیے اور اِس کے بارے میں کوئی بات کیے بغیر گھر کی طرف چلتے رہتے۔

کبھی کبھار یُوں بھی ہو جاتا کہ ایسی لڑائی کے دوران نوریکو، میرے ددھیال کی گھریلو خادمہ، مجھے پکار کر ناشتے کے لیے اندر آنے کا کہتی۔ بصورتِ دیگر میں اپنے دادا ہی کے مانند اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچاتا: درخت کے پاس جاتا، اُس کے سامنے خاموشی سے زندگی سے بھرپُور چند سیکنڈوں کے لیے کھڑا رہتا اور پھر مناسب پُھرتی سے اُس سے لپٹ پڑتا۔ بعض اوقات میں ایک ایسا منظر تشکیل دیتا، جس سے میرے دادا کی آنکھیں کھلی رہ جاتیں، میں درخت کو واقعتاً جڑ سے اُکھاڑ کر جھاڑیوں پر پھینک دیتا۔ لیکن وہ درخت اُس درخت سے زیادہ مضبوط تھا جسے طوفان نے اُکھیڑ ڈالا تھا، اور ایک سات برس کا لڑکا ہونے پر بھی مجھے اِس منظر

کے اُلٹ ہونے کی حقیقت تسلیم تھی، بالکل ویسے ہی جیسے دُوسری سلطنت غیر حقیقی تھی۔

میرا خیال ہے کہ میرے دادا کوئی خاص دولت مند نہیں تھے البتہ ٹوکیو کے حالات دیکھنے کے بعد اُن کے گھر میں زندگی آرام دہ لگتی تھی۔ میں نوریکو کے ہم راہ کھلونے، کتابیں اور رنت نئے کپڑے خریدنے جاتا رہتا؛ اور وہاں کھانے کو بہت سی ایسی چیزیں تھیں --- جو آج کل ہر گھر میں نہیں ملتیں --- جنھیں میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار رکھایا تھا۔ ایک حصّہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر نا قابلِ رہائش ہونے کے باوجود بھی گھر کافی کشادہ لگتا تھا۔ میری آمد کے بعد جلد ہی ایک سہ پہر، دادا نے مجھے کمروں کی سجاوٹ کے لیے لگی ہُوئی تصاویر اور آرائشی اشیا دِکھانے کے لیے گھر بھر کا ایک چکر لگوایا تھا۔ جب بھی میں کوئی ایسی تصویر دیکھتا جو مجھے پسند آتی تو میں اُس کی طرف اشارہ کرتا اور پُوچھتا: ”کیا یہ میرے دادا نے بنائی ہے؟“ لیکن گھر میں لگی ہوئی تمام تصاویر کے بارے میں دریافت کر لینے کے بعد ایک بھی میرے دادا کی بنائی ہُوئی نہیں نکلی۔

”مگر میرے خیال میں اُوجی معروف مصوّر تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اُس کی تصاویر کہاں ہیں؟“

”تمھیں بُھوک تو لگی ہوگی، اِچیرو-سان؟“

”اُوجی کی تصاویر! اُنھیں فوراً لائیں!“

میری دادی نے مجھے پُرتشویش تاثرات سے دیکھا۔ ”مجھے حیرت ہے۔“ وہ بولیں۔ ”میرا خیال ہے کہ اِچیرو کی خالہ نے اِسے اِس کے دادا کے بارے میں بتایا ہو گا۔“

اُن کے بات کرنے کے انداز میں کوئی ایسی چیز تھی جس نے مجھے خاموش کرا دیا۔

”میں حیران ہوں کہ اِچیرو کی خالہ نے اِسے کیا بتایا ہو گا۔“ اُنھوں نے اپنی بات جاری رکھی۔

”ہاں، میں حیرت زدہ ہوں۔“

”اُنھوں نے بس اتنا بتایا ہے کہ اُوجی ایک معروف مصوّر تھا۔ اُس کی تصاویر یہاں کیوں نہیں ہیں؟“

”اُس نے اُور کیا بتایا ہے، اِچیرو-سان؟“

”اُس کی تصاویر یہاں کیوں نہیں ہیں؟ مجھے جواب چاہیے!“

میری دادی مُسکرائیں۔ ”میرا خیال ہے کہ اُنھیں ہٹا دیا گیا ہے۔ ہم اُنھیں بعد میں کسی وقت ڈھونڈ لیں گے۔ لیکن تمھاری خالہ بتا رہی تھیں کہ تم خُود خاکے اور تصاویر بنانے کا بہت شوق رکھتے ہو۔ بے حد اچھی تصاویر، اُس نے مجھے بتایا تھا۔ اِچیرو-سان اگر تم اپنے دادا سے کہو تو وہ تمھیں بھی سکھا دیں گے۔“

”مجھے کسی اُستاذ کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مجھے معاف کر دو، یہ تو بس ایک تجویز تھی۔ اب شاید تم کچھ کھانا چاہو گے۔“

پھر یُوں ہُوا کہ میرے بغیر کہے ہی میرے دادا مجھے مصوری میں مدد دینے لگے۔ ایک گرم دِن کو میں برآمدے میں بیٹھا اپنے آبی رنگوں سے ایک تصویر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تصویر بُری بن رہی تھی اور میں غُصّے میں آ کر اُسے چڑمُڑ کرنے ہی والا تھا کہ میرے دادا برآمدے میں آ کر ایک تکیہ رکھ کر زمین پر بیٹھ گئے۔

”میں تمھارے کام کا حرج نہیں کرنا چاہتا، اِچیرو۔“ وہ تصویر دیکھنے کے لیے جھکے لیکن میں نے اُسے اپنے بازو سے چھپا لیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ وہ ہنستے ہُوئے بولے۔ ”جب تم اِسے مکمل کر لو گے تو میں دیکھ لوں گا۔“

نوریکو نے چائے لا کر ڈالی اور چلی گئی۔ دادا وہاں اطمینان سے بیٹھے چائے کی چسکیاں لیتے اور باغ میں تکتے رہے۔ اُن کی موجودگی نے مجھے چوکنّا کر دیا اور میں یہ ظاہر کرنے لگا گویا اپنی تصویر پر کام کر رہا ہوں۔ تاہم، چند منٹوں کے بعد مجھ پر خلجان طاری ہونے لگا اور میں نے اپنا بُرش برآمدے میں پھینک مارا۔ دادا میری طرف مُڑے۔

”اِچیرو۔“ اُنھوں نے بے حد نرم خُوئی سے کہا۔ ”تم ہر جگہ رنگ گرا رہے ہو۔ اگر نوریکو-سان نے یہ دیکھ لیا تو وہ تم پر بہت ناراض ہو گی۔“

”مجھے پروا نہیں ہے۔“

اُنھوں نے قہقہہ لگایا اور دوبارہ میری تصویر دیکھنے کے لیے جھکے۔ میں نے اُسے دوبارہ چھپانے کی کوشش کی لیکن اُنھوں نے میرا ہاتھ ہٹا دیا۔

”اتنی بھی بُری نہیں ہے۔ تم کیوں اِس پر طیش کھا رہے ہو؟“

”واپس دیں۔ میں اِسے پھاڑنا چاہتا ہوں۔“

اُنھوں نے تصویر میری پہنچ سے دُور رکھی اور اُسے دیکھتے رہے۔ ”بالکل، اِتنی بھی بُری نہیں۔“ وہ پُر خیال انداز میں بولے۔ ”تمھیں اِتنی آسانی سے کوشش ترک نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھو، اوجی تمھاری تھوڑی سی مدد کرے گا۔ پھر تم کوشش کر کے اِسے مکمل کر لینا۔“

بُرش فرش پر ٹپّا کھا کر ہم سے تھوڑی دُور جا گرا تھا۔ میرے دادا اُسے اُٹھانے کو اُٹھے۔ اُنھوں نے اُسے اُٹھا کر اُس کے سرے کو اپنی اُنگلی کی پور سے یُوں چھُوا جیسے اُسے تشفّی دے رہے ہوں، پھر پلٹ کر واپس آئے اور بیٹھ گئے۔ اُنھوں نے لمحہ بھر کے لیے تصویر کا بغور جائزہ لیا، بُرش کو پانی میں ڈبویا، پھر اُسے دو یا تین رنگوں سے چھُوا۔ اور پھر، ایک ہی ہموار حرکت میں، وہ ڈبویا ہُوا بُرش میری تصویر کی سطح پر پھیرنے لگے، اور

میرے بنائے ہُوئے چھوٹے چھوٹے پتوں کی لڑی جیسے جاگ اُٹھی: روشنی اور سائے، پرتیں اور گُچھے، سب کچھ ایک ہی حرکت میں۔

”یہ لو۔ اب تم کوشش کرو اور اسے مکمل کرلو۔“

میں نے بے حد کوشش کی کہ متاثر نظر نہ آؤں لیکن ایسی شان دار کارکردگی میرے جوش کو دہکانے کو کافی تھی۔ جب میرے دادا دوبارہ چائے پینے اور باہر باغ میں دیکھنے لگے تو میں نے بُرش کو رنگ اور پانی میں ڈبویا اور تھوڑی دیر پہلے دیکھے ہُوئے کی نقالی کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے تصویر پر کاغذ کے آر پار چند موٹی موٹی گیلی لکیریں پھیریں۔ دادا نے یہ دیکھ کر اپنا سر ہلایا۔ اُنھیں یقین ہوگیا تھا کہ میں اپنی تصویر مٹا رہا ہوں۔

میں شروع میں سمجھا کہ مکان کو طوفان سے نقصان پہنچا ہوگا لیکن جلد ہی مجھے پتا چلا کہ زیادہ تر حصہ جنگ کی وجہ سے تباہ و برباد ہُوا تھا۔ میرے دادا مکان کے اُس حصے کو دوبارہ تعمیر کروا رہے تھے کہ دوبارہ طوفان نے باڑھ کو زمین بوس اور اُنھوں نے گذشتہ ایک برس میں جو کچھ بنایا تھا اُسے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اُنھوں نے اِس پر تھوڑی سی پریشانی کا اظہار کیا تھا اور میری آمد کے بعد کے ہفتوں کے دوران میں بھی کام پر مستقل مزاجی سے کام جاری رکھا تھا۔۔۔ شاید روزانہ دو تین گھنٹے۔ کبھی کبھار، مزدور بھی اُن کی مدد کے لیے آ جاتے لیکن عام طور پر وہ اکیلے ہی ہتھوڑی اور آری کا کام کرتے۔ کام کی کوئی جلدی دِکھائی نہیں دیتی تھی۔ اور اگر سامان کی کمی کی وجہ سے کام رُک بھی جاتا تو باقی گھر میں بہت جگہ تھی۔ بعض اوقات، اُنھیں کئی کئی دِن تک میخوں کے ڈبے یا کسی خاص لکڑی کا انتظار کرنا پڑتا۔

تباہ شدہ حصے میں صرف ایک کمرہ استعمال ہوتا تھا جو غسل خانہ تھا۔ وہ نایاب تھا: فرش بجری کا تھا جس میں بیرونی دِیوار کے تلے سے پانی بہنے کے لیے نالیاں بنی ہُوئی تھیں؛ اور کھڑکیاں باہر باڑھ اور روڑوں پر دھری دِکھائی دیتی تھیں، پس غسل خانے کو جانے والے کو یوں لگتا تھا کہ وہ غسل خانے کے بجائے ذیلی مکان میں کھڑا ہے۔ لیکن اُس کے ایک کونے میں میرے دادا نے لکڑی کا ایک گہرا ڈبہ بنا رکھا تھا جس میں تین چار فٹ بھاپ دیتا ہُوا پانی اُنڈیلا جا سکتا تھا۔ ہر شب بستر پر جانے سے قبل میں اپنے دادا کو شیشے میں سے پکارتا، اُسے پیچھے کھسکاتا اور غسل خانے کو بھاپ سے بھرا ہُوا پاتا۔ ایک خاص قسم کی مہک اُٹھنے لگتی، خشک مچھلی کے بدن سے نکلنے والی مہک جیسی، جو میرے خیال میں ایک بُوڑھے شخص کے بدن کے لیے مناسب تھی۔ دادا گردن تک پانی ڈُوب کر غسل لیتے۔ اور ہر شب میں بھاپ سے بھرے ہُوئے غسل خانے میں کھڑا ہو کر اُن سے باتیں کرتا۔۔۔ اکثر ایسے موضوعات پر جن کا میں کبھی کہیں تذکرہ نہیں کروں گا۔ میرے دادا غور سے سنتے رہتے، پھر

وہ بھاپ کے بادلوں کے عقب سے یقین بھرے الفاظ میں جستہ جستہ جواب دیتے۔

"اب یہ تمھارا گھر ہے، اچیرو۔" وہ کہتے۔ "جب تک بڑے نہ ہو جاؤ اِسے چھوڑ کر جانے کی ضرورت نہیں۔ بَل کہ اُس کے بعد بھی تم یہی رہنا۔ فکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔"

اُس غسل خانے میں ایسی ہی ایک شب، میں نے اپنے دادا کے سامنے تبصرہ کیا: "جنگ کے دوران جاپانی فوجی بہترین لڑاکے رہے۔"

"ہمارے فوجی یقیناً اولوالعزم تھے۔" وہ بولے۔ "شاید بے حد حوصلہ مند۔ بے حد جرأت مند۔ لیکن بعض دفعہ بہترین فوجی بھی ہار جاتے ہیں۔"

"کیوں کہ دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔"

"کیوں کہ دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اور کیوں کہ دشمن کے اسلحے کی مقدار بہت زیادہ تھی۔"

"جاپانی فوجی بے حد زخمی حالت میں بھی لڑنے کی ہمت رکھتے تھے، کیا ایسا نہیں ہے؟ کیوں کہ وہ اولوالعزم تھے۔"

"ہاں، ہمارے فوجی تب بھی لڑے جب وہ بے حد زخمی تھے۔"

"اَو جی، دیکھو۔"

میں نے غسل خانے میں دشمنوں میں گھرے ہُوئے ایک فوجی کی اداکاری شروع کر دی جو بغیر اسلحے کے لڑائی لڑ رہا تھا۔ جب مجھے گولی لگتی تو میں ایک مختصر سا وقفہ لیتا، پھر دوبارہ لڑنے لگتا۔ "یاہ! یاہ!"

میرے دادا ہنسنے لگے۔ اُنھوں نے اپنے ہاتھ پانی سے اُوپر نکال کر تالیاں بجائیں۔ میرے لڑنے کے دوران میری حوصلہ افزائی کرتے رہے—— آٹھ، نو، دس گولیاں۔ ایک مرتبہ جب میں اپنی سانس ہم وَار کرنے کے لیے تھما تو دادا متواتر تالیاں بجا اور ہنس رہے تھے۔

"اَو جی، کیا آپ کو پتا ہے کہ میں کون ہوں؟"

اُنھوں نے اپنی آنکھیں دوبارہ بند کیں اور پانی میں گہرائی تک اُتر گئے۔ "ایک فوجی، ایک نہایت بہادر جاپانی فوجی۔"

"ہاں، مگر کون؟ کون سا فوجی؟ دیکھو، اَو جی۔ اندازہ لگاؤ۔"

میں نے اپنا ہاتھ درد بھرے انداز میں اپنے زخموں پر دھرا اور دوبارہ لڑائی شروع ہو گئی۔ میرے سینے اور پیٹ میں لگنے والی بہت بڑی تعداد میں گولیوں نے مجھے میری نمائشی تکنیکیں ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔

"یاہ! یاہ! میں کون ہوں، اَو جی؟ اندازہ لگاؤ! اندازہ لگاؤ!"

پھر میں نے دیکھا کہ میرے دادا نے اپنی آنکھیں کھولیں اور مجھے بھاپ میں سے گھور کر دیکھنے لگے۔ وہ مجھے یوں گھور رہے تھے جیسے میں کوئی بُھوت ہوں اور میرے اندر سرد لہر دوڑ گئی۔ میں رُک گیا اور اُنھیں غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اُن کے چہرے پر مُسکراہٹ آئی البتہ اُن کی آنکھوں میں وہی حیرانی موجود رہی۔

’’بس، اب بہت ہو گیا۔‘‘ وہ دوبارہ پانی میں گھستے ہُوئے بولے۔ ’’بے شمار دشمن۔ بے شمار۔‘‘

میں کھڑا رہا۔

’’کیا بات ہے، اچیرو؟‘‘ وہ مستفسار ہُوئے اور ہنس دیے۔ ’’یکایک اتنے چُپ ہو گئے ہو۔‘‘

میں نے جواب نہیں دیا۔ میرے دادا نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے آہ بھری۔

’’جنگ کس قدر خوف ناک چیز ہے، اچیرو۔‘‘ اُنھوں نے کہا۔ ’’بے حد خوف ناک چیز۔ لیکن گھبراؤ مت۔ اب تم یہاں آ گئے ہو۔ یہ تمھارا اپنا گھر ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘

قہر کی گرمی کی ایک شام جب میں اندر آیا تو میں نے دیکھا کہ کھانے کے لیے ایک فالتو نشست رکھی گئی تھی۔ میری دادی نے دِھیمی آواز میں بتایا: ’’آج تمھارے دادا کا کوئی مہمان آ رہا ہے۔ وہ بس ابھی آتا ہی ہو گا۔‘‘

تھوڑی دیر تک میری دادی، نوریکو اور میں کھانا کی میز کے گرد بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ جب میں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا تو نوریکو نے مجھے آواز نیچی رکھنے کے لیے کہا۔ ’’وہ شریف آدمی ابھی ابھی پہنچا ہے۔ تم اُس سے جلد تیار ہونے کی توقع نہیں رکھ سکتے۔‘‘

میری دادی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’میرا خیال ہے کہ اتنے طویل عرصے کے بعد اُنھوں نے ایک دُوسرے سے بہت سی باتیں کرنا ہوں گی۔‘‘

آخر کار، میرا دادا مہمان کے ہم رَاہ نمودار ہُوا۔ وہ شاید چالیس کے لگ بھگ ہو گا— اُس وقت میں بڑوں کی عمر کا کم ہی قیاس لگا سکتا تھا— ایک ناٹا اور موٹا شخص، جس کی بھنویں اتنی سیاہ دِکھائی دیتی تھی گویا وہ سیاہ روشنائی میں ڈبوئی گئی ہوں۔ کھانے کے دوران میں، وہ اور میرا دادا زیادہ تر ماضی کی باتیں کرتے رہے۔ کوئی ایک نام لیا جاتا، میرا دادا وہ نام دُہراتا اور زور زور سے سر ہلاتا۔ جلد ہی میز پر ایک باوقار سا ماحول طاری ہو گیا۔ ایک دفعہ میری دادی نے مہمان کو اُس کی نئی ملازمت پر مبارک باد دی۔

’’نہیں، نہیں مادام۔ آپ بہت مہربان لیکن بہت جلد باز ہیں۔ تقرری کسی بھی طور پر یقینی نہیں ہے۔‘‘

’’لیکن تم نے خُود تو بتایا ہے۔‘‘ میرے دادا نے مداخلت کی۔ ’’تمھارا کوئی حقیقی مدِ مقابل نہیں۔ تم اُس نشست کے لیے نہایت اہل ہو۔‘‘

’’آپ بھی بے حد مہربان ہیں، سینسائی۔‘‘ مہمان بولا۔ ’’لیکن یہ کسی بھی طرح یقینی نہیں ہے۔ میں

تو بس اُمید اور انتظار کر سکتا ہوں۔"

"اگر یہ معاملہ چند برس ہوتا تو۔" میرے دادا نے کہا۔ "میں تمھارے لیے کچھ سفارش کر سکتا تھا۔ لیکن مجھے اُمید نہیں ہے کہ اب میری رائے کی کوئی اہمیت ہے۔"

"واقعی، سینسائی۔" مہمان بولا۔ "آپ اپنے آپ کے ساتھ نا انصافی کر رہے ہیں۔ آپ جیسے کارناموں والی شخصیت کا ہمیشہ احترام کیا جاتا ہے۔"

اِس مرحلے پر میرے دادا نے عجیب سا قہقہہ لگایا۔

کھانے کے بعد میں نے اپنی دادی سے پُوچھا: "وہ اُوجی کو 'سینسائی' کیوں کہتا ہے؟"

"وہ معزز شخص کسی زمانے میں تمھارے دادا کا شاگرد رہا ہے۔ بے حد فطین شاگرد۔"

"جب اُوجی معروف مصور تھے؟"

"ہاں۔ وہ شریف آدمی نہایت شان دار فن کار ہے۔ تمھارے دادا کا ایک بہت فطین شاگرد۔"

مہمان کی موجودگی کا مطلب تھا کہ میں اپنے دادا کی توجہ سے محروم ہو گیا اور اِس سے مزاج بگڑ گیا۔ آنے والے دِنوں میں، جس قدر ممکن ہو سکا میں مہمان سے گریزاں رہا اور میں نے شاید ہی اُس سے کوئی بات کی ہو۔ پھر ایک سہ پہر، میں نے برآمدے میں ہونے والی گفتگو سن لی۔

میرے دادا کے گھر کی بالائی منزل پر ایک مغربی طرز کا کمرہ تھا جس میں اُونچی اُونچی کرسیاں میز دھری تھیں۔ کمرے کے جھروکے سے باغ دِکھائی دیتا تھا اور برآمدہ اُس سے دو منزل نیچے تھا۔ میں کمرے میں مزے میں تھا کہ کچھ دیر سے نیچے آنے والی آوازوں سے چوکنا ہو گیا۔ پھر کسی چیز نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی--- وہ چیز باتوں کے تبادلے کی تھی--- اور میں باتیں سننے کے باہر جھروکے میں چلا گیا۔ یقینی طور پر، میرے دادا اور اُن کا مہمان کسی بات پر اُلجھ رہے تھے؛ جہاں تک میں سمجھا تھا معاملہ کسی خط کا تھا جو مہمان چاہتا تھا کہ میرے دادا لکھ دیں۔

"یقیناً، سینسائی۔" وہ شخص کہہ رہا تھا۔ "یہ میرے لیے غیر معقول بالکل نہیں ہے۔ ایک طویل عرصے سے میں یہ یقین رکھے ہوئے تھا کہ میرا کیریئر اپنے انجام کو پہنچ چکا۔ یقیناً، سینسائی یہ دیکھنا نہیں چاہیں گے کہ ماضی میں میرے ساتھ جو کچھ ہُوا اُس نے مجھے کیسا اپنے بوجھ تلے دبائے رکھا۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی، پھر مہمان بولا۔ "براہِ مہربانی، مجھے غلط مت سمجھیں، سینسائی۔ میں نے ہمیشہ آپ کے ساتھ اپنے تعلق پر فخر محسوس کیا ہے۔ یہ محض کمیٹی کی تسلی کے لیے ہے، اِس سے زیادہ نہیں۔"

"تو تم اِس لیے مجھے ملنے آئے ہو۔" میرے دادا کی آواز میں غصّے سے زیادہ اضمحلال تھا۔ "تو تم

اِتنے عرصے بعد اِس لیے آئے ہو۔ لیکن تم نے اپنے بارے میں جھوٹ کیوں بولا؟ تم نے جو کیا فخر اور ذہانت سے کیا۔ چاہے غلط کام ہو جائے یا درست، آدمی کو اپنے بارے میں جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔''

''لیکن سینسائی، شاید آپ بُھول گئے ہیں۔ کیا آپ کو کوبے کی وہ رات یاد ہے۔ کینوشیتا۔ سان کے لیے ہونے والے جشن کے بعد؟ آپ اُس رات مجھ پر ناراض ہو گئے تھے کیوں کہ میں نے آپ سے اختلاف کی جرأت کی تھی۔ کیا آپ کو یاد نہیں ہے، سینسائی؟''

''کینوشیتا کے لیے جشن؟ مجھے اندیشہ ہے کہ مجھے یاد نہیں۔ ہم کیوں جھگڑے تھے؟''

''ہم اِس بات پر جھگڑے تھے کہ میں نے یہ کہنے کی جسارت کر لی تھی کہ سکول نے غلط سمت اختیار کر لی ہے۔ کیا آپ کو یاد نہیں، سینسائی؟ میں نے کہا تھا کہ یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہم اپنے باصلاحیت نوجوانوں کو اِس طرح نوکری دِلوائیں۔ اور آپ مجھ پر مشتعل ہو گئے تھے۔ کیا آپ کو یاد نہیں، سینسائی؟''

وہاں دوبارہ خاموشی چھا گئی۔

''ہے ہاں۔'' بالآخر میرے دادا بولے۔ ''اب مجھے یاد آ گیا۔ وہ چین کی تحریک کا زمانہ تھا۔ قوم کے لیے ایک فیصلہ کن وقت۔ ہم جس طرح پہلے کام کر رہے تھے اُس طرح کام جاری رکھنا غیر ذمہ دارانہ تھا۔''

''لیکن میں نے ہمیشہ آپ سے اختلاف کیا ہے، سینسائی۔ میں نے اِس کے بارے میں جو مؤقف بے حد مضبوط سمجھا تھا، درحقیقت وہی میں نے آپ کے مُنھ پر کہہ دیا تھا۔ میں اب آپ سے محض یہی تو چاہ رہا ہوں کہ آپ یہی حقیقت کمیٹی کو بتا دیں۔ بس اِتنا بتا دیں کہ شروع سے میرے کیا خیالات رہے تھے اور میں اِس حد تک چلا گیا تھا کہ آپ سے کھلم کھلا اختلاف بھی کر لیا۔ یقیناً، یہ میرے نزدیک غیر معقول نہیں ہے۔''

ایک اَور وقفہ آیا، پھر میرے دادا نے کہا۔ ''جب میرا نام قابلِ احترام تھا تب تم نے اِس کا خُوب فائدہ اُٹھایا۔ اب دُنیا میرے بارے میں مختلف رائے رکھتی ہے، تمھیں اِس حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے۔''

کچھ دیر تک خاموشی رہی، پھر میں نے حرکات اور پٹ بند ہونے کی آوازیں سنیں۔

کھانے پر میں نے اپنے دادا اَور مہمان کے درمیان کھچاؤ کے اثرات کھوجنے کی کوشش کی لیکن وہ دونوں ایک دُوسرے کے ساتھ کاملاً شائستگی کا رویّہ روا رکھے ہُوئے تھے۔ اُس رات میں نے، بھاپ سے بھرے ہُوئے غسل خانے میں، اپنے دادا سے دریافت کیا: ''اوجی، اب آپ تصویریں کیوں نہیں بناتے؟''

پہلے تو وہ چُپ رہے، پھر بولے۔ ''بعض اوقات، جب تم اپنی تصاویر اور چیزیں مصور کرتے ہو تو وہ اچھی نہیں بنتیں اور تمھیں طیش آ جاتا ہے، تمھیں نہیں آتا؟ تم تصاویر پھاڑ ڈالنا چاہتے ہو اور اوجی کو تمھیں روکنا پڑتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟''

”جی۔“ میں نے جواب دیا اور انتظار کرنے لگا۔ اُن کی آنکھیں بند رہیں۔ اُن کی آواز دِھیمی اور تکان زدہ تھی۔ ”یہی تمھارے دادا کے ساتھ بھی ہے۔ وہ اچھا کام نہیں کرتا تھا، پس اُس نے ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔“

”لیکن آپ نے مجھے ہمیشہ یہی بتایا ہے کہ تصویریں مت پھاڑو۔ مجھے ہمیشہ اُنھیں مکمل کرنے کے لیے کہا ہے۔“

”یہ درست ہے۔ لیکن تم ابھی بہت چھوٹے ہو، اچیرو۔ تم بہت عمدہ کرنے لگو گے۔“

اگلی صبح جب میں اپنے دادا کو دیکھنے کے باہر برآمدے میں گیا تو سُورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ میرے بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد ہی میں نے اپنے عقب میں ایک آواز سُنی اور سیاہ رنگ کا کیمونو پہنے مہمان نمودار ہُوا۔ اُس مجھے سلام کیا اور جب میں نے جواب نہیں دیا تو وہ ہنسا اور میرے پاس سے گذر کر برآمدے کے سرے کی طرف چلا گیا۔ میرے دادا نے اُسے دیکھا اور اپنی ورزش روک دی۔

”ہے! اتنی جلد اُٹھ گئے۔ مجھے اُمید ہے کہ میں نے تمھیں تنگ نہیں کیا تھا۔“ میرے دادا اپنی تنکوں کی چٹائی سمیٹنے کے لیے جھکے۔

”بالکل بھی نہیں، سینسائی۔ میں نے شان دار نیند لی ہے۔ لیکن براہِ مہربانی، آپ میری وجہ سے مت ختم مت کریں۔ نوریکو-سان مجھے بتا رہی تھی کہ آپ ہر صبح یہ کرتے ہیں، چاہے گرمی ہو یا سردی۔ یہ بے حد قابلِ تحسین ہے۔ نہیں براہِ مہربانی، واقعی۔ میں بہت متاثر ہُوا ہوں، میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ آج صبح خود جلد اُٹھ کر دیکھوں گا۔ اگر میں سینسائی کے روزمرہ میں دخیل ہُوا ہوں تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ سینسائی، براہِ مہربانی۔“

نتیجتاً میرے دادا نے اپنی ورزش جاری رکھی --- وہ وہاں پر جھجک بھرے انداز میں دوڑ لگاتے رہے۔ وہ دوبارہ جلد ہی تھم گئے اور بولے: ”اِس قدر صبر پر شکریہ۔ یہ آج کے لیے واقعی کافی ہے۔“

”لیکن سینسائی، یہ ننھا مایُوس ہو گا۔ میں نے سنا ہے کہ یہ آپ کی جوڈو کی تربیت سے بہت لطف اندوز ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے، اچیرو-سان؟“

میں نے یُوں ظاہر کیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔

”آج اگر یہ نہیں کروں گا تو مجھے اِس سے کوئی نقصان نہیں ہو گا۔“ میرے دادا نے کہا۔ ”آؤ اندر چل کر ناشتے کا انتظار کریں۔“

”لیکن مجھے خود بھی مایوسی ہو گی، سینسائی۔ میں تو آپ کی شجاعت کی یاد کی توقع کر رہا تھا۔ کیا آپ کو

یاد ہے کہ ایک بار آپ نے مجھے بھی جوڈو سکھانے کی کوشش کی تھی؟”

“واقعی؟ ہاں، مجھے ایسی کوئی چیز یاد تو پڑتی ہے۔”

“تب ہمارے ساتھ مُوراساکی ہُوا کرتا تھا۔ اور اِشیدا بھی۔ یوکوہاما کے اُس سپورٹس ہال میں۔ آپ کو وہ یاد ہے سینسائی؟ تاہم میں آپ کو اُٹھا کر پھینکنے کا جتن کرتا لیکن انجام کار میں خود چت ہو جاتا تھا۔ میں بعد میں از حد ملول ہوتا تھا۔ سینسائی، اچیرو اور میں آپ کو ورزش کرتے دیکھنا چاہیں گے۔”

میرے دادا نے قہقہہ لگا کر اپنا ہاتھ بلند کیا۔ وہ اپنی چٹائی کے وسط میں بد سلیقگی سے کھڑے تھے۔

“لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے بہت عرصے سے سنجیدہ تربیت چھوڑ دی ہے۔”

“آپ کو پتا ہے، سینسائی، زمانۂ جنگ میں مَیں خود بھی ماہر رہ چکا ہوں۔ ہم نے بے شمار افراد کو غیر مسلح لڑائی لڑنا سکھائی تھی۔” یہ کہتے ہُوئے مہمان نے میری جانب چمکتی ہُوئی نگاہوں سے دیکھا۔

“مجھے یقین ہے کہ تم فوج میں نہایت تربیت یافتہ تھے۔” میرے دادا نے کہا۔

“جیسا میں نے کہا کہ میں بے حد ماہر ہو گیا تھا۔ اب بھی اگر مجھے وہ دوبارہ کرنے پڑے، سینسائی، تو مجھے یقین ہے کہ میری قسمت میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا ہوگا۔ میں بلا تاخیر چت ہو جاؤں گا۔”

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

“مجھے یقین ہے کہ تم نے بہترین تربیت حاصل کی ہوگی۔” میرے دادا بولے۔

مہمان دوبارہ میری سمت مُڑا اور میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں عجب انداز میں مُسکرا رہی تھیں۔

“لیکن سینسائی جیسے تجربے کے حامل شخص کے سامنے وہ تمام تربیت رتّی برابر سودمند ثابت نہیں ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ میری تقدیر وہی ہوگی جو سپورٹس ہال میں تھی۔”

میرے دادا اپنی چٹائی پر کھڑے رہے۔ پھر مہمان نے کہا۔ “براہِ مہربانی سینسائی، میری وجہ سے اپنا حرج نہ کریں۔ اِس طرح ورزش کریں گویا میں یہاں موجود ہی نہیں ہوں۔”

“واقعی نہیں۔ آج کے لیے اِتنا کافی ہے۔” میرے دادا اپنے ایک گھٹنے پر بیٹھ کر چٹائی تہہ کرنے لگے۔ مہمان نے اپنا کندھا برآمدے کے ستون سے لگایا اور آسمان کو تکنے لگا۔

“مُوراساکی، اِشیدا...... اب تو یُوں لگتا ہے جیسے ایک زمانہ بیت گیا ہو۔” اُس نے جیسے خود کلامی کی کوشش کی ہو لیکن وہ اتنی بلند آواز میں بولا کہ میرے دادا سن لیں۔ چٹائی سمیٹتے ہُوئے میرے دادا کی پشت ہماری طرف تھی۔

“وہ سب کے سب اب جا چکے ہیں۔” مہمان نے کہا۔ “آپ اور میں، سینسائی۔ لگتا ہے اُس

زمانے کے صرف ہم دونوں ہی بچے ہیں۔"

میرے دادا تھے۔"ہاں۔" وہ مُڑے بغیر بولے۔"ہاں، یہ المیہ ہے۔"

"وہ جنگ اِس قدر فضول تھی۔ اِتنی بڑی غلطی تھی۔" مہمان میرے دادا کی پشت کو گُھور رہا تھا۔

"ہاں، یہ المیہ ہے۔" میرے دادا نے آہستگی سے دُہرایا۔ میں اُنھیں زمین پر گُھورتے ہُوئے دیکھ رہا تھا۔ آدھی سمٹی ہُوئی تنکوں کی چٹائی اُن کے سامنے تھی۔

اُسی روز ناشتے کے بعد مہمان روانہ ہو گیا اور اُسے میں نے دوبارہ کبھی نہیں دیکھا۔ میرے دادا اُس کے بارے میں کوئی بھی بات کرنے کو تیار نہیں تھے اور مجھے صرف وہی بتاتے جس سے میں پہلے ہی آگاہ تھا۔ البتہ، نوریکو سے مجھے کچھ باتیں معلوم ہوئیں۔

وہ جب بھی سبزیاں خریدنے جاتی تو میں اکثر اُس کے ہم راہ ہوتا تھا اور ایسے ایک موقع پر میں نے پُوچھا: "نوریکو، چینی تحریک کیا تھی؟"

چُوں کہ بظاہر میں نے ایک "تعلیمی" سوال دریافت کیا تھا اِس لیے اُس نے جواب دیتے ہُوئے خُوش گوار انداز اپنایا، جب میں نے اِس قسم کے سوالات کیے کہ سردیوں میں مینڈک کہاں چلے جاتے ہیں تو صبر کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے بتایا کہ جنگِ بحرالکاہل سے قبل جاپانی فوج نے کسی کامیابی کے لیے چین کے راستے ایک تحریک چلائی تھی۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا اُس میں کوئی غلط بات تھی تو اُس نے پہلی بار مجھے تیکھی نگاہوں سے گُھورا۔ نہیں، اُس میں کوئی غلط بات نہیں تھی البتہ اُس وقت اُس پر بہت سی باتیں اُٹھتی رہی تھیں۔ اور اب کچھ لوگ کہتے رہے ہیں کہ اگر فوج چین میں داخل نہ ہُوئی ہوتی تو جنگ نہ ہوتی۔ میں نے دوبارہ پُوچھا کیا چین پر حملہ فوج کی غلطی تھی۔ نوریکو نے بتایا کہ ایسی بھی کوئی غلطی نہیں تھی لیکن اِس پر باتیں بہت ہوتی رہی تھیں۔ جنگ کوئی اچھی چیز نہیں، یہ بات سب ہی جانتے تھے۔

موسمِ گرما کے دوران، دادا نے میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت بتایا—اِتنا زیادہ کہ اُنھوں نے گھر کے تباہ شدہ حصے کی مرمت کا کام لگ بھگ ختم ہی کر دیا تھا۔ اُن کی حوصلہ افزائی سے میرے اندر مصوری اور خاکہ سازی کی حقیقی لگن پیدا ہو گئی۔ وہ دِن کے وقت مجھے باہر لے جاتے، اپنی منزل پر پہنچ کر ہم دُھوپ میں بیٹھ جاتے اور میں اپنے رنگین پنسلوں سے خاکے بنانے لگتا۔ عام طور پر ہم کسی ایسے مقام پر جاتے جو لوگوں کی رسائی سے دُور ہوتی—جیسے لمبی لمبی گھاس اور شان دار نظارے والی کسی پہاڑی کی اُترائی۔ یا پھر ہم کسی بحری جہازوں کی گودی میں یا کسی نئے کارخانے کی جگہ پر چلے جاتے۔ پھر ٹرام پر گھر لوٹتے ہُوئے ہم میری اُس دِن بنائی ہُوئی تصاویر کا جائزہ لیتے۔

ہمارے دِن کا آغاز اب بھی میرے برآمدے میں جا کر اپنے دادا کو ورزش کرتے دیکھنے سے ہوتا۔ لیکن ہم صبح کے روزمرہ میں چند ایک نئی چیزوں کا اضافہ کر لیا تھا۔ جب میرے دادا چٹائی پر اپنی ورزش مکمل کر لیتے تو وہ مجھے پکارتے: ''اب آجاؤ۔ دیکھتے ہیں کہ آج تم کتنے مضبوط ہُوئے ہو۔'' اور میں برآمدے سے قدم نکالتا، اُن کی چٹائی پر جاتا اور اُن کا کیمونو ویسے تھام لیتا جیسے اُنھوں نے بتایا تھا—ایک ہاتھ سے اُن کی کالر کو گرفت میں لیتا اور دُوسرے سے کہنی کے قریب سے دامن کو۔ اِس کے بعد اُن کے سکھائے ہُوئے طریقے کے مطابق اُنھیں گرانے کی کوشش کرتا اومتعدّد کوششوں کے بعد میں اُنھیں چت کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ گو مجھے محسوس ہوتا کہ وہ خود اپنے آپ کو گرانے کا مجھے موقع دیتے ہیں لیکن پھر بھی جب میں اُنھیں گرا لیتا تو فخر محسوس کرتا۔ میرے دادا تو بس یہ دیکھتے تھے کہ کامیابی پانے سے قبل میں نے پچھلی بار کی نسبت ذرا زیادہ سخت کوشش کی ہے۔ پھر ایک صبح، میں نے بے حد کوشش کی لیکن میرے دادا نے مجھے فتح یابی کے لیے رعایت نہیں دی۔

''آؤ، اِچیرو، ہار مت۔ تم کیمونو کو ٹھیک طرح سے نہیں پکڑ رہے ہو، کیا پکڑ رہے ہو؟''

میں نے دوبارہ گرفت درست کی۔

''خوب، اب دوبارہ کوشش کرو۔''

میں مُڑا اَور میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔

''قریب قریب۔ تمھیں اپنی سرین مکمل طور پر اِس میں گھسیڑ دینا ہے۔ اُوجی ایک جسیم آدمی ہے۔ تم یہ کام محض اپنے ہاتھوں سے مت لو۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی؛ میرے دادا نے اب بھی غالب نہ آنے دیا۔ دِل شکستہ ہو کر میں نے کوشش ترک کر دی۔

''اب آؤ، اِچیرو۔ اتنی آسانی سے مت چھوڑو۔ بس ایک بار اَور۔ ہر چیز بالکل ٹھیک کرو۔ یہ ٹھیک ہے۔ یہ، اب میں بے بس ہو گیا ہوں۔ اب اُٹھا پھینکو۔''

اِس دفعہ میرے دادا نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور میری ایڑی پر لڑکھڑا کر چت ہو گئے۔ وہ اپنی آنکھیں بند کیے چٹائی پر پڑے تھے۔

''آپ نے مجھے اِسے کرنے کا موقع دیا ہے۔'' میں نے رُوٹھے ہُوئے انداز میں کہا۔

میرے دادا نے اپنی آنکھیں نہیں کھولیں۔ میں، یہ سمجھتے ہُوئے کہ وہ مرنے کی اداکاری کر رہے ہیں، ہنسا۔ لیکن میرے دادا نے اب بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

''اُوجی؟''

اُنھوں نے اپنی آنکھیں کھولیں، پھر مجھے دیکھتے ہُوئے مُسکرائے۔ وہ دھیرے دھیرے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اُن کے چہرے پر حیرانی کا تاثر تھا اور وہ ایک ہاتھ سے اپنی گدّی سہلا رہے تھے۔ ”ٹھیک، ٹھیک۔“ وہ بولے۔ ”اب صحیح چت کیا ہے۔“ اُنھوں نے میرا بازو چھُوا لیکن فوراً ہی اُن کا ہاتھ دوبارہ گدّی پر پہنچ گیا۔ پھر اُنھوں نے قہقہہ لگایا اور اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ ”اب ناشتے کا وقت ہو گیا ہے۔“

”کیا آپ درخت کی طرف نہیں جا رہے؟“

”آج نہیں۔ تم نے آج کی صبح کے لیے اُوجی کو بہت کچھ دے دیا ہے۔“

میرے اندر فتح یابی کی ایک عظیم لہر اُٹھ رہی تھی؛ پہلی بار، میں نے سوچا، میں نے اپنے دادا کو اُن کی مدد کے بغیر چت کیا ہے۔

”میں درخت کے ساتھ مشق کرنے جا رہا ہوں۔“ میں بولا۔

”نہیں، نہیں۔“ میرے دادا نے مجھے اپنی سمت کھینچا۔ اُن کا ایک ہاتھ اب بھی گدّی سہلا رہا تھا۔ ”آؤ اور اب کھانا کھائیں۔ مردوں کو کھانا چاہیے ورنہ وہ اپنی طاقت کھو بیٹھتے ہیں۔“

موسمِ خزاں کے ابتدائی مہینوں سے پہلے تک مجھے اپنے دادا کے مصوری کے کام کی کوئی چیز دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ میں کچھ کتابیں بالائی منزل کے مغربی طرز کے کمرے میں منتقل کرانے میں نوریکو کی مدد کر رہا تھا کہ میری نظر ایک الماری میں دھرے ایک بکسے سے بہت سے کاغذوں کی باہر نکلی ہُوئی ریلوں پر پڑی۔ میں نے ایک ریل کو باہر نکال کر فرش پر پھیلا دیا۔ میں نے جو کچھ دیکھا وہ سینما کے کسی پوسٹر جیسا تھا۔ میں نے اُس کا بغور جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن وہ طویل عرصے سے تہہ کیا ہُوا تھا اور میں اُسے موڑے بغیر سیدھا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے نوریکو سے ایک سرا پکڑنے کو کہا اور خود دُوسرا سرا پکڑنے کے دُوسری طرف چلا گیا۔

ہم دونوں نے پوسٹر کو دیکھا۔ اُس پر ایک سیمورائی ایک تلوار تھامے ہُوئے دِکھائی دیا؛ اُس کے عقب میں جاپانی فوج کا جھنڈا تھا۔ تصویر گہرے سُرخ پس منظر میں بنائی گئی تھی جس نے مجھے بے چینی کا احساس دیتے ہُوئے اُن زخموں کے رنگ کی یاد دِلا دی جب میں گر کر اپنی ٹانگ زخمی کروا بیٹھا تھا۔ نچلے سرے کے ایک طرف کانجی طرزِ تحریر میں کچھ لکھا تھا جس میں سے میں صرف لفظ ”جاپان“ پڑھ پایا۔ میں نے نوریکو سے دریافت کیا کہ پوسٹر پر کیا لکھا ہے۔ وہ اُس کا کوئی اَور حصّہ دِلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے قدرے بے خیالی میں سُرخی پڑھی: ”بزدلانہ گفتگو کا وقت نہیں، جاپان کو آگے بڑھنا چاہیے۔“

”یہ کیا ہے؟“

”کسی زمانے میں تمھارے دادا نے بنائی تھی۔ بہت عرصہ قبل۔“

‘‘اُوجی؟’’ میں مایوس ہوگیا کیوں کہ مجھے پوسٹر پسند نہیں آیا تھا اور میں نے ہمیشہ اُن کے کام کو یکسر مختلف نوع کا تصور کیا تھا۔

‘‘ہاں طویل عرصہ قبل۔ یہ دیکھو، کونے میں اُن کے دستخط موجود ہیں۔’’

کاغذ کی تہہ میں مزید بھی کچھ لکھا ہُوا تھا۔ نوریکو سر گھما کر پڑھنے لگی۔

‘‘یہ کیا کہتا ہے؟’’ میں نے استفسار کیا۔

وہ سنجیدہ تاثرات کے ساتھ پڑھتی رہی۔

‘‘یہ کیا کہتا ہے، نوریکو؟’’

اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہُوا سرا چھوڑ کر فوری طور پر میرے ہاتھ میں لپیٹ دیا۔ میں نے اُسے دوبارہ کھولنے کی کوشش کی لیکن نوریکو کی دِلچسپی ختم ہو چکی تھی۔

‘‘یہ کیا کہتا ہے، نوریکو؟’’

‘‘مجھے نہیں پتا۔’’ وہ کتابوں کی سمت پلٹتے ہُوئے بولی۔ ‘‘یہ بہت پُرانا ہے۔ جنگ سے پہلے کا۔’’

میں نے اصرار نہیں کیا بَل کہ اِس کے بارے میں مزید اپنے دادا سے جاننے کا ارادہ کر لیا۔

معمول کے مطابق اُس رات میں غسل خانے میں گیا اور میں نے اُنھیں دُوسرے حصّے سے پُکارا۔ کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے زیادہ بلند آواز میں پُکارا۔ پھر میں اپنا کان شیشے پر دھر کر سننے لگا۔ اندر کی ہر شے پر سکوت طاری لگتا تھا۔ مجھے اِس خیال نے آ گھیرا کہ دادا کو میرے پوسٹر دیکھنے کے بارے میں پتا چل گیا ہے اور وہ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر مجھے پر ایک خوف طاری ہو گیا اور میں نے دُوسرے حصّے کا دروازہ کھسکا کر اندر دیکھا۔

غسل خانہ بھاپ سے لبالب تھا اور کچھ دیر تک مجھے کچھ بھی واضح طور پر دِکھائی نہیں دیا۔ پھر میں نے دِیوار کے ساتھ دیکھا کہ میرے دادا اُپنے غسال سے باہر نکلنے کا جتن کر رہے ہیں۔ میں بھاپ میں سے اُن کی کہنی اور کندھا پانی سے بدن باہر نکالنے کی سعی میں جکڑے ہُوئے دیکھ سکتا تھا۔ اُن کا چہرہ ایک طرف جھولتے ہُوئے غسال کے کنارے کو چُھو رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر ساکت تھے جیسے وہ حرکت نہ کر سکتے ہوں اور اُن کا جسم جکڑ گیا ہو۔ میں اُن کی طرف دوڑا۔

‘‘اُوجی!’’

میرے دادا ساکت رہے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈرتے ڈرتے اُنھیں یُوں چھوا کہ کہیں کندھا ہٹ جانے سے وہ دوبارہ پانی میں نہ گر جائیں۔

”اُوجی! اُوجی!“

پہلے نوریکو دوڑتی ہُوئی غسل خانے میں آئی اور پھر دادی اماں۔ اُن میں سے ایک نے مجھے کھینچ کر ایک طرف کیا، اور وہ دونوں دادا کو نکالنے کے لیے زور لگانے لگیں۔ میں نے جب بھی مدد کرنے کی کوشش کی، مجھے دُور کھڑے رہنے کی ہدایت ہُوئی۔ اُنھوں نے میرے دادا کو خاصی تگ و دَو سے غسال سے اُٹھایا اور پھر مجھے غسل خانے سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔

میں اپنے کمرے میں جا کر گھر میں ہونے والی چیخ و پکار سننے لگا۔ میں نے ایسی آوازیں سنیں جنھیں میں شناخت نہیں کرسکتا تھا اور جب بھی میں نے دروازہ کھول کر باہر پیر رکھنے کی کوشش کی، کوئی نہ کوئی مجھے طیش سے واپس بستر میں جانے کے لیے کہہ دیتا۔ میں بہت دیر تک جاگتا رہا۔

آنے والے دِنوں میں مجھے اپنے دادا کو دیکھنے کی اجازت نہیں ملی اور وہ اپنے کمرے سے باہر بھی نہیں نکلے۔ ایک نرس ہر صبح گھر میں آتی اور سارا دِن ٹھیرتی۔ میرے سوالات کا ایک ہی جواب ملتا: میرے دادا بیمار ہیں لیکن جلد ہی تندرست ہو جائیں گے۔ یہ فطری بات تھی کہ وہ، کسی بھی اُور شخص کے مانند، وقتاً فوقتاً بیمار پڑ سکتے تھے۔

میں نے ہر روز علی الصبح اُٹھ کر برآمدے میں اِس آس پہ جاتا رہا کہ میرے دادا صحت یاب ہو کر دوبارہ ورزش کر رہے ہوں گے۔ لیکن جب وہ نہ آتے تو بھی میں باغ میں موجود رہتا اور اُمید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتا یہاں تک کہ نوریکو مجھے ناشتے کے لیے اندر بلا لیتی۔

پھر ایک شام مجھے بتایا گیا کہ میں اپنے دادا کے کمرے میں جا سکتا ہوں۔ مجھے تنبیہ کی گئی کہ میں اُن سے مختصر وقت کے لیے مل سکتا ہوں اور جب میں اندر گیا تو نوریکو میرے ساتھ یُوں بیٹھ گئی کہ جیسے ہی میں کوئی غیر معمولی حرکت کروں تو وہ مجھے باہر لے جائے۔ نرس دُور ایک کونے میں بیٹھی تھی اور کمرے میں دواؤں کی بُو رچی ہوئی تھی۔

میرے دادا کروٹ کے بَل لیٹے ہُوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مُسکرائے، اُنھوں نے اپنے سر کو ذرا سا ہلایا لیکن کچھ بولے نہیں۔ میں موقع کی نزاکت کو سمجھ گیا اور اپنے جذبات دبا لیے۔ آخر میں، میں نے کہا:

”اُوجی، آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔“

وہ دوبارہ کچھ کہے بغیر مُسکرائے۔

”میں نے کل میپل کے درخت کی تصویر بنائی تھی۔“ میں بولا۔ ”میں آپ کو دِکھانے کے لیے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ جسے میں یہاں چھوڑ جاؤں گا۔“

”مجھے دِکھاؤ۔“ وہ آہستگی سے بولے۔

میں نے تصویر نکالی۔ میرے دادا نے اُسے لیا اور پشت کے بَل ہو گئے۔ جب اُنھوں نے یہ حرکت کی تو نوریکو نے اپنی جگہ پر بے چینی سے پہلو بدلا۔

”خوب۔“ وہ بولے۔ ”شاباش۔“

نوریکو نے تیزی سے آگے بڑھ کر اُن سے تصویر لے لی۔

”اِسے یہاں میرے پاس رہنے دو۔“ دادا نے کہا۔ ”اِس سے مجھے جلد صحت مند ہونے میں مدد ملے گی۔“

نوریکو نے تصویر کو اُن کے قریب نمدے پر رکھ دیا، پھر مجھے باہر لے گئی۔

ہفتے گذر گئے لیکن مجھے دوبارہ ملنے کی اجازت نہیں ملی۔ میں اب بھی اُنھیں باغ میں پانے کی اُمید پر روزانہ علی الصبح اُٹھتا لیکن وہ وہاں نہ ہوتے اور میرے دِن طویل اور خالی ہو گئے۔

پھر ایک صبح، میں معمول کے مطابق باغ میں تھا، کہ دادا برآمدے میں نمودار ہُوئے۔ وہ بیٹھ رہے تھے کہ میں دوڑتا ہُوا اُن کے پاس جا کر اُن سے لپٹ گیا۔

”تو تم نے اب تک کیا کِیا ہے، اِچیرو؟“

میں اپنے جذبات کے اظہار پر کچھ شرمندہ سا تھا، میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اُن کے ساتھ اپنے تئیں ایک مردانہ انداز میں بیٹھ گیا۔

”بس باغ میں چہل قدمی۔“ میں بولا۔ ”ناشتے سے پہلے ذرا سی ہَوا خوری۔“

”ہونہہ۔“ میرے دادا کی نظریں باغ میں اِس طرح گھوم رہی تھیں گویا وہ ایک ایک درخت اور جھاڑی کا جائزہ لے رہے ہوں۔ میں نے اُن کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ تب تک خزاں اچھی طرح آ چکا تھا، اُوپر آسمان اَبر آلود تھا اور باغ گرے ہُوئے پتّوں سے بھرا ہُوا۔

”مجھے یہ بتاؤ، اِچیرو۔“ وہ متواتر باغ کی طرف دیکھتے ہُوئے بولے۔ ”تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟“

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ ”پولیس والا۔“ میں نے کہا۔

”پولیس والا؟“ میرے دادا میری سمت مُڑ کر مُسکرائے۔ ”اب یہ ہُوا نا اصل مردوالا کام۔“

”مجھے کامیابی کے لیے سخت مشق کی ضرورت ہے۔“

”مشق؟ پولیس والا بننے کے لیے تم کس چیز کی مشق کرو گے؟“

”جوڈو۔ میں کچھ روز سے صبح سویرے ناشتے سے پہلے مشق کر رہا ہوں۔“

میرے دادا کی آنکھیں دوبارہ باغ کی جانب ہو گئیں۔ ''بے شک۔'' وہ دھیمی آواز میں بولے۔ ''[1]اصل مردوالا کام۔''

میں تھوڑی دیر تک اپنے دادا کو تکتا رہا۔ ''اوجی۔'' میں نے دریافت کیا۔ ''جب آپ میری عمر کے تھے تو کیا بننا چاہتے تھے؟''

''جب میں تمھاری عمر کا تھا؟'' وہ کچھ لمحوں تک باغ میں تکتے رہے۔ پھر بولے۔ ''کیوں، میرا خیال ہے کہ میں ایک مصور بننا چاہتا تھا۔ مجھے ایسا کوئی وقت یاد نہیں جب میں نے کچھ اور بننے کے بارے میں سوچا ہو۔''

''میں بھی ایک مصور بننا چاہتا ہوں۔''

''واقعی؟ تم پہلے ہی بہت اچھے ہو، اچیرو۔ میں تمھاری عمر میں اتنا اچھا نہیں تھا۔''

''اوجی، دیکھو!''

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اُنھوں نے مجھے پیچھے سے پُکارا۔

''اوجی، دیکھو۔ دیکھو!''

میں واپس باغ میں جا کر اپنے دادا کے درخت کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''یاہ!'' میں نے تنے کو چھا ڈالا اور اپنے سرین اُس کے ساتھ ٹکا دیے۔ ''یاہ! یاہ!''

میں نے نظریں اُٹھائیں تو میرے دادا قہقہے لگا رہے تھے۔ اُنھوں نے دونوں ہاتھ بلند کر کے تالیاں بجائیں۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ مجھ پر مسرت غالب آ گئی تھی کہ میرے دادا میرے پاس لوٹ آئے ہیں۔ پھر میں نے دوبارہ درخت کی سمت مُڑ کر اُسے دعوتِ مبارزت دی۔

''یاہ! یاہ!''

برآمدے سے میرے دادا کے قہقہوں اور تالیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

---

[1] کانجی (kanji): چینی الفاظ کے استعمال کے ساتھ ایک نوع کا جاپانی طرزِ تحریر۔

☆☆☆☆

بلوچی تخلیق و ترجمہ: **غنی پہوال**

مداوا

آ مرے ہم نوا
تشنگی کے اس بحرِ بیکراں کو
آنکھوں کے صحراؤں میں دفن کر دیں
اور کسی اونچے ٹیلے پر
زندگی کو گلے لگا کر
کچھ یوں گلہ کریں
کہ احساس کے جھلسے ہوئے سائے
پانی پانی ہو جائیں

☆☆☆☆

سید شکیل احمد نایاب
پشتو سے ترجمہ: ابراہیم رومان

قاتل ستارہ

شاہ پسند خان نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو جن رشتوں سے اُن کا وجود بنا تھا، اُن ہی رشتوں نے کافی حد تک اُن کی زندگی چھین لی تھی، وہ دُکھی تھے، مگر پھر بھی اُن کو احساس تھا کہ ادھوری دنیا کے یہی سلسلے ہیں جو ہر طرف رواں دواں ہیں، اُس نے صرف جوانی کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا تھا بلکہ اگلے مرحلوں میں اُس نے رسمی تعلیم کی اسناد اور ڈگریاں بھی حاصل کی تھیں پھر انھیں ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں لیکچرر کی پوسٹ بھی ملی تھی۔ وقت گزر رہا تھا، زندگی گھٹ رہی تھی اور تمنائیں بڑھ رہی تھیں۔ شاہ پسند خان نے ماڈرن سوسائٹی میں اپنے لیے ایک بنگلہ بھی تعمیر کیا۔ بہت سے لوگ اُن کی کمائی کو شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ مگر راوی کہتے ہیں کہ اُن کا فروٹ منڈی میں کاروبار تھا اور ان کی فلائنگ کوچ بھی چل رہی تھیں۔ تو شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر شاہ پسند خان نے اپنے گاؤں کے ایک خان کی بیٹی سے رشتہ جوڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو دو بیٹے اور ایک بیٹی بھی دی صبح دس بجے گہری نیند سے اُٹھا، تو دن کی روشنی میں آسمان پر اُس نے ایک ستارا دیکھا۔ جو عجیب قسم کی روشنی دے رہا تھا۔ اُسی اجالے میں سورج کا رنگ مدہم ہونے لگا۔ یہی روشنی جتنی پھیل رہی تھی اتنا آسمان سے زمین کی طرف اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ شاہ پسند خان اُسی روشنی میں ظلمت کو انگشتِ بہ دندان تھا۔ پھر یہی ستارہ، یہی اندھیرا اور سورج کی روشنی شاہ پسند خان کی زندگی کا معمول بن گیا۔

راوی کہتے ہیں کہ یہی سب حالات صرف شاہ پسند خان کو دکھائی دیتی تھی باقی لوگ اُن سے بے خبر تھے، صرف وہ لوگ باخبر تھے جن سے شاہ پسند خان کا اُٹھنا بیٹھنا تھا، یا وہ لوگ جن کا شاہ پسند خان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ ایک دن یہی ستارا شاہ پسند خان کے قریب ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ایک خوف سے نبرد آزما تھا کہ اِن فاصلوں کا ختم ہونا نقصان سے خالی نہیں۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ ستارے کی روشنی اُن کو کیا نقصان پہنچائے گی۔ جب اسی ستارے کی روشنی انگن کے قریب پہنچی تو پھر کھیل شروع ہوا۔ راوی کہتے ہیں کہ صبح گاؤں اور شہر کے ہر مرد اور عورت کی زبان پر یہی قصہ تھا کہ شاہ پسند خان کی بیوی نے خودکشی کر لی۔ کیوں کہ ان کی جوان بیٹی انٹرنیٹ کی نئی ٹیکنالوجی کی شعاعوں میں دل فریب تماشوں کا حصہ بن چکی تھی۔ اور بیٹوں نے یہی سب کچھ نئے دور کی ضرورت سمجھا۔ جو کہ شاہ پسند خان کے خیال میں ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ مگر یہ حادثہ تب

اُسے محسوس ہوا جب آسمان کے کشادہ دامن میں یہی ستارا غائب ہوا۔ راوی کہتے ہیں کہ ستارا غائب نہیں تھا مگر شاہ پسند خان کی نظر نے دھوکہ کھایا تھا۔ شاہ پسند خان تنہا رہ گیا۔ زندگی کا سرمایہ اُس نے ہارا تھا۔ کچھ مدت بعد جب وہ دوپہر کے وقت نیند سے جاگ اُٹھا تو وہ ستارا پھر اپنے مکمل فریب کے ساتھ ہنستا ہوا نظر آرہا تھا اور سورج کے چہرے پر کالے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ شاہ پسند خان ایک لمحے کے لیے بہت تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کی تصویر اُس کی آنکھوں میں ابھر آئی۔ پتہ نہیں کہ اُس ستارے میں کون سا جادو تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں اُس نے اُسے سب کچھ بھلا دیا۔ رشتوں کی تمام مٹھاس اُس پر قربان کر ڈالی۔ اور ستارے کو گلے لگا لیا۔ اور پھر راوی کہتے ہیں کہ اُس ستارے نے شاہ پسند خان کو اپنے آپ میں جذب کر ڈالا مگر اُس کے ضمیر کا آئینہ ایسا ریزہ ریزہ کیا کہ ہر ایک ٹکڑے سے خون ٹپک رہا تھا۔

☆☆☆☆

ایاز اللہ ترکزے
پشتو سے ترجمہ: ابراہیم رومان

میلا لباس

آج میمونہ نہیں چاہتی تھی کہ سکول جائے، لیکن پڑھائی کے ساتھ اتنا لگاؤ تھا کہ باوجود اس کے کہ اُس کا دل نہیں چاہتا تھا لیکن پھر بھی سکول گئی، جس وقت وہ سکول کے احاطے میں داخل ہوئی، تو اسمبلی شروع تھی، ساری لڑکیاں قطار میں کھڑی تھیں۔ ہر کلاس کی لڑکیاں ایک طرف کھڑی تھیں، تلاوت شروع تھی، تلاوت کے بعد قومی ترانہ سنایا گیا اور اس کے بعد دعا مانگی گئی، دعا کے بعد ہیڈ مس نے کہا کہ ساری لڑکیاں اپنی اپنی جگہ پر کھڑی رہیں، تاکہ صفائی چیک کریں۔ ہیڈ مس ایک ایک قطار گئی اور ایک ایک لڑکی کے لباس، ناخن، شوز اور بال دیکھ لیے۔ میمونہ اپنی کلاس فیلو کے ساتھ قطار میں کھڑی تھی، ہیڈ مس اس کے پاس پہنچی نہیں تھی کہ میمونہ اپنے لباس کو تکتی رہی اور اس پر ہاتھ پھیرتی رہی مگر ہاتھ پھیرنے سے کپڑے کہاں صاف ہوتے ہیں کیوں کہ میل کپڑوں پر چسپاں تھا۔ میمونہ کو جب علم ہوا کہ یہ تو ہاتھ ملنے سے صاف نہیں ہوتا تو پہلے ہیڈ مس کی طرف دیکھا کہ کہاں پہنچی اور پھر اپنا دامن دونوں پیروں کے درمیان پکڑ لیا تاکہ ہیڈ مس کو میلے کپڑے کو نظر نہ آئیں اور انجان سی کھڑی ہو گئی۔ جب ہیڈ مس میمونہ تک آ پہنچی تو جوں ہی ان کی طرف دیکھا، اول تو وہ ہنس پڑی اور پھر اُسے غصہ آیا، اُس نے میمونہ کو ہاتھ سے پکڑ لیا، خوب دھکے دیے اور پھر اُسے کہنے لگی کہ "تم نے کل بھی ان میلے کپڑوں سے مار کھائی تھی اور آج پھر انھیں پہن کر آئی ہو، میں نے آپ کو کل کہہ دیا تھا کہ صاف لباس پہن کر آنا ہے۔ تم نہیں سمجھتی، ہاتھ پکڑو"۔

ہیڈ مس نے پہلے ایک ہاتھ کو دو ڈنڈے رسید کر دیے اور پھر دوسرے ہاتھ کو دو ڈنڈے، میمونہ رونے لگی لیکن ہیڈ مس کے ڈر کے مارے رونے سے رہی۔ وہ اتنی زیادہ عمر کی بھی نہیں تھی، یہی سات سال کی تھی اور تیسری جماعت کی طالبہ تھی۔ اُس کے نرم و نازک ہاتھ مار کے عادی کہاں تھے۔ جب لڑکیاں اسمبلی اور چیکنگ سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کلاس روم میں چلی گئیں تو میمونہ بھی سسکتی ہوئی اپنی کلاس چلی آئی۔ کلاس کی مس سبق پڑھاتی رہی مگر وہ اداس اور کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی اور سبق کی طرف اس کا دھیان کہاں، کلاس مس کی جب اُس پر نظر پڑی تو مس میمونہ کے نزدیک آئی اور اسے دلاسہ دے کر کہنے لگی کہ میمونہ بیٹی اپنی ماں کو کہہ دینا کہ صاف کپڑے دے کر سکول بھیجا کرے۔ تو پھر تجھے ہیڈ مس نہیں ماریں گی یہ تمہارا تیسرا دن ہے کہ روزانہ مار کھاتی ہو

میمونہ نے جب مس کی باتیں سن لیں تو پھر رونے لگی مگر اس دفعہ وہ ایسی روئی کہ اُس کی گھگھی بندھ گئی چپ ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ کلاس مس نے جب میمونہ کا یہ حال دیکھا تو نہایت ہی خفا ہوئی اور کلاس سے باہر چل کر سیدھا ہیڈ مس تک جا پہنچی ۔ میمونہ کا سارا قصہ اُنھیں سنایا۔ ہیڈ مس اُسی وقت میمونہ کے پاس چلی آئی اور اُس کیساتھ بیٹھ گئی اور کلاس مس کی طرح کہنے لگی کہ ''ماں کو کہہ دینا کہ صاف کپڑے دیا کریں اور پھر سکول آیا کریں یہ تیسرا دن ہے کہ تم یہی میلے کپڑے پہن کر آتی ہو اور مار کھاتی ہو۔ صاف کپڑے پہنا کرو۔ کل جب آنا ہو تو ماں کو کہہ دینا کہ پہلے مجھے صاف کپڑے دے تب سکول جاؤں گی۔ کیوں کہ مجھے مس مارتی ہے سمجھ آئی تمھیں ''اور یہ بات کہہ کر میمونہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ پھیرتے ہی میمونہ سسکتی ہوئی کہنے لگی ''میں اپنی ماں کو روزانہ کہتی ہوں، مگر وہ لیٹی رہتی ہیں اور مجھے صاف کپڑے نہیں دیتیں''۔ ہیڈ مس نے جب میمونہ کی یہ باتیں سنیں تو کہنے لگی '' آؤ آج میں تمھاری ماں سے مل لیتی ہوں کہ وہ کیوں تم کو صاف کپڑے نہیں دیتی'' تا کہ تمہارا سچ اور جھوٹ پتہ چل سکے۔'' اول تو انھوں نے پوچھا کہ میمونہ کے گاؤں کی کوئی لڑکی کلاس میں ہے؟ کسی نے بھی آواز نہیں دی۔ اور اس طرح میمونہ اور ہیڈ مس سکول سے اُن کے گاؤں کے طرف روانہ ہوئیں۔ ہیڈ مس نے میمونہ کو کہہ دیا کہ ''تم آگے ہو جانا اور ہم تمھارے پیچھے ہیں، کیوں کہ مجھے تمھارے گاؤں کا رستہ معلوم نہیں۔''

میمونہ آگے اور ہیڈ مس اُس کے پیچھے، جب کچھ دور وہ ایک گاؤں تک پہنچنے والی تھی کہ اُس نے راستہ بدلہ اور گاؤں کے ساتھ دوسری طرف روانہ ہوگئی تو ہیڈ مس نے اُس سے پوچھا۔ '' تمہارا گاؤں کدھر ہے لڑکی'' میمونہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہیڈ مس نے سوچ لیا، ہوسکتا ہے کہ اُس کی ماں کھیتوں میں اس وقت کام کرتی ہوگی۔ اس لیے اس نے مزید میمونہ سے کچھ نہیں کہا اور اُسی طرح اُس کے پیچھے چلتی رہی۔ میمونہ کھیت کے پگڈنڈی پر چلتی رہی آخر کار کھیتوں سے نکلتی ہوئی ایک مقبرے تک جا پہنچی ۔ جب مقبرے تک پہنچی تو اول ایک قبر کے پاس کھڑی رہی (اس قبر پر پتھر وغیرہ نہیں تھے صرف مٹی کا ڈھیر تھا) ہیڈ مس بھی اُسے دیکھ کر حیران کھڑی رہی اور پھر میمونہ گھٹنوں کو ٹیک کر کے بیٹھ گئی اور سسکتی ہوئی اُس قبر سے لپٹ گئی اور چھوٹی چھوٹی سسکیوں میں کہنے لگی۔ ''ماں اٹھو، مجھے صاف لباس دے، میرا لباس میلا ہے اور مجھے ہر روز سکول میں مس مارتی ہیں تم اٹھو ماں، ماں تم کیوں نہیں اٹھتی۔ یہ دیکھ میرے ساتھ مس بھی آئی ہوئی ہے۔''

☆☆☆☆

منیر احمد

پنجابی سے ترجمہ: سید شعیب نعیم

کھوپے

نہیں ہوں اونٹ یا بیل کوئی میں
پھر بھی کیوں لگتا ہے مجھ کو
جیسے کسی نے گلے میں میرے
گھنٹی باندھ کے
مجھے کیا ہے
رہٹ چلانے پر مامور

آنکھوں پر ''کھوپے'' ہیں میرے
ناک میں نتھ ہے
اور مرے پیروں کے نیچے
روز و شب کا اک چکر ہے
جس میں تنوع کوئی نہیں
یکسانی ہی یکسانی ہے

ویسے تو یہ ہو سکتا ہے

ایک جگہ میں کھڑے کھڑے بھی
گردن اپنی ہلائے جاؤں
اپنی گھنٹی بجائے جاؤں
لیکن جس نے گلے میں میرے
گھنٹی ڈالی
آنکھوں پر رکھے ہیں "کھوپے"
جس کے ہاتھ ہے نتھ کی ڈوری
اس ہستی کا تو مسکن ہی
دل ہے میرا
یہ دل میرا

☆☆☆☆

خرم بہاولپوری

سرائیکی سے ترجمہ: سید ضیاء الدین نعیم

کیا کوئی بھی نہیں

کیا کوئی بھی نہیں
جو لے آئے اس کو اس سمت
جو مداوا ہے
میرے دکھ درد، میرے زخموں کا

غم سے کچھ ہے زیادہ ہی بے تاب
یہ طبیعت مری
مرا دل آج
ڈوب جاتا ہے گاہے اور گاہے
یوں تڑپتا ہے، یوں پھڑکتا ہے
جیسے ہو کوئی ماہی بے آب

کوئی مجھ سے نہ پوچھے حال مرا
آج ٹیسیں جو دل میں اٹھتی ہیں
میری برداشت سے
سوا ہیں بہت

غلام حسن حیدرانی
سرائیکی سے ترجمہ: سلیم شہزاد

خُدا

صغری کی آنکھ کافی دیر سے سامنے والی دیوار پر ٹکی ہوئی تھی ۔ وہ بُجھی ہوئی ایک ہی جگہ پر بیٹھی تھی ۔ پورا کمرہ عورتوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس کے دکھ میں دوبارہ شرکت کے لیے تمام بستی کی عورتیں آ کر بیٹھی ہوئی تھیں ۔ کیوں کہ آج صغری کے خاوند اکرم کے قل تھے ۔ صغری کا نزدیکی عزیز تو کوئی نہیں تھا مگر یہ جو پہاڑ ٹوٹا تھا اس کا دکھ سب کو تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی چار سال سے شادی شدہ دوشیزہ کو بیوگی کا دکھ دے کر اکرم جوانی ہی میں قبر میں جا سویا۔ چھوٹی سی عمر میں بیوگی اس کے دامن سے چمٹ گئی تھی ۔ سال ڈیڑھ سال کا سعید ابھی اچھی طرح چلنا بھی نہیں سیکھا تھا کہ اکرم گزر گیا ۔ صغری اور سعید نے اس دنیا کا سکھ دیکھا ہی تھا کہ غم کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا۔ اللہ بے نیاز جو ہوا۔

آج صغری کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں تھا۔ شاید ان تین دنوں میں اتنا رو چکی تھی کہ سارے دریا خشک ہو گئے تھے ۔ وہ دیوار پر آنکھیں ٹکائے سوچ رہی تھی کہ یہ پہاڑ جتنی زندگی کیسے گزرے گی؟ یہ معصوم بچہ کیسے پلے گا؟ اس نے تو باپ کو جی بھر کر دیکھا بھی نہیں، نہ باپ نے اس کو دل بھر کر پیار کیا، نہ گود کھلایا۔ باپ بیٹا ایک دوسرے کو تڑستے اللہ میاں کی تقدیر مان کر بچھڑ گئے ۔ ایک ایک کر کے بستی کی عورتیں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں ۔ اب صغری اپنے ویران اور اداسی بھرے کمرے میں اکیلی رہ گئی ۔ سعید گرتا پڑتا ماں کی گود میں آ گیا ۔ بیٹھی تو تلی زبان سے بولا: ''اماں ..... بابا تہاں ہے؟''

صغری کا دل حلق میں آ گیا ۔ سینے پر چھریاں چل گئیں ۔ دل میں سوچا اور پھر چیخیں نکل گئیں ۔ میرے چاند جیسے جگر پر یتیمی کی دھوپ آن پڑی ہے ۔ اس کا منہ کُملا گیا ہے ۔ وہ سعید کو پیار کرتے ہوئے کافی دیر تک چومتی رہی اور کہنے لگی۔ ''تمہارا بابا اللہ میاں کے پاس گیا۔'' یہ سن کر سعید خوشی سے ماں کی گود میں ناچنے لگا ۔ نادان کو کیا پتہ تھا کہ اصل بات کیا ہے؟ سب نے مرجانا ہے، باقی تو اللہ کا نام ہی رہ جائے گا مگر اکرم کے مرنے سے جو بھار صغری کے کمزور کندھوں پر آ پڑا تھا اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ۔ نہ یہ کاغذ کے ورق اس بھار کے بوجھ کو اٹھا سکتے ہیں ۔ اللہ میاں کسی پر ایسا بوجھ نہ ڈالے ۔

آج صغری کے سر پر خزاں رسیدہ جوانی اور معصوم امانت کا بار آ پڑا ۔ سچ ہے جس کا کوئی نہ ہو اس کا

خدا خود مددگار ہوتا ہے۔ اس طرح صغری کو بھی اللہ نے ہمت دی۔ اٹھ کر گھر کو سنبھالا، اکرم کا چھوڑا ہوا ترکہ ڈھونڈا۔ دو چار روپے کی بھان... چار پانچ سیر آٹا... سیر آدھ سیر دال... چاندی کے کنگن اور ہسی چار پانچ کپڑے، جواب بستی کی عورتیں بیوگی پہ دے گئیں تھیں۔ ہر چیز کو دیکھ بھال کے، دل پہ پتھر رکھ کر، دو روٹیاں پکائیں، کھائیں اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

دعا مانگی اللہ کرے سب اپنے جنے ہوؤں کی خود ہی پال سنبھال کریں۔ صغری ماں کے ساتھ ساتھ سعید کا باپ بھی بن گئی، سعید کو اللہ کے بھروسے پہ پالنے لگ پڑی۔ ایک اللہ کا بھروسہ دوسرا اللہ کے بنائے ہوئے ہاتھوں کے آسرے پر لوگوں کے کپڑے سینے پرونے لگی۔ پرائے گھروں میں جا جا کران کے کپڑے دھوتی، برتن مانجھتی، فصل کے موقع پر کٹائی کرتی، مزدوری کرنے لگی۔ اس طرح اپنا اور سعید کا پیٹ پالنے لگی۔

بستی کی عورتوں نے کئی مرتبہ کہا، کل کی لڑکی ہو، کب تک محنت کر کے کھاؤ گی؟ نکاح کرلو، مگر صغری نے ٹھان لی تھی کہ اپنے لیے تو ہر کوئی جیتا ہے کسی اور کے لیے بھی تو کوئی جی کر دکھائے۔ اب جتنی زندگی ہے سعید کے لیے جیوں گی۔ اس لیے صغری نے نہ شادی کی اور نہ ہی کسی جگہ پہ پکی نوکری۔ صرف مزدوری کرتی رہی تا کہ سعید اس سے جدا ہو کر مایوس نہ ہو جائے۔ وہ اکرم کی نشانی اور امانت کو دل سے لگائے اکٹھے گزارے۔ چار سال کے زمانے کو یاد کر کر کے وفا کی لاج پالتی رہی۔

بھلا وقت تھا کہ گزرتا رہا۔ سعید خیر سے اب چھ سات کا ہو گیا تو اس کی ماں نے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ سعید بھی لوگوں کے بچوں کے ساتھ پڑھنے لگا۔ صغری اکرم کی روح کو خوش کرنے میں یوں مست ہوئی کہ اس کے ذہن سے یہ بات بھی اتر گئی کہ وہ مرد ہے یا عورت، بوڑھی ہے یا جوان۔ اسے ایک ہی خبط تھا کہ کسی طرح اکرم کی امانت پل جائے تو قیامت کے دن وہ اس کے سامنے سرخرو ہو کر اٹھے۔

اب آپ اندازہ لگائیں جو عورت اس دل و دماغ کی مالک ہو اس نے بیٹے کو کیسی عقل دی ہوگی۔

سعید بہت شریف اور بھلا مانس نکلا۔ اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ رہ رہے ہیں۔ کچھ لڑکے سعید کو طعنے دیتے کہ سعید کی ماں مزدوری کر کے کھاتی ہے۔ مگر کچھ سعید کے ساتھ مکمل ہمدردی اور محبت بھی رکھتے، ہمت بھی بندھواتے، تگڑے بنو... مایوس نہ ہو... یہ دن سدا نہیں رہنے۔ لڑکوں کے طعنوں سے زچ ہو کر ایک مرتبہ سعید نے ماں کو کہا بھی کہ اماں تم مزدوری نہ کیا کرو۔ مجھے سکول کے لڑکے طعنے دیتے ہیں۔ نا سمجھ بچے نے نہ سوچا نہ سمجھا کہ ماں مزدوری نہ کرے گی تو کھائیں گے کہاں سے؟ ماں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ سعید بیٹا اگر تمھیں طعنے برے لگتے ہیں تو اس کا علاج یہ نہیں کہ میں مزدوری چھوڑ دوں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تم بہت زیادہ پڑھ کر کوئی بڑی نوکری کر لو پھر ہم لوگوں میں عزت کے ساتھ رہ سکیں گے۔ کوئی تمھیں طعنہ نہ دے گا۔ سعید کو ماں کی

یہ بات بہت بھلی لگی۔ اس نے اس طرح ذوق شوق سے محنت کی کہ پانچویں اور آٹھویں میں وظیفہ لیا۔ بستی کے کئی لڑکے قصبے کے ہائی سکول میں پڑھنے لگے۔ سعید بھی ان کے ساتھ پڑھنے لگا۔ سعید ماں کی بات نہ بھولا۔ وہ محنتی اور بھلا مانس بچہ تھا۔ سارے استاد اس کی عزت کرتے تھے۔ ہم جماعت بھی اسے اچھی نظروں سے دیکھتے تھے۔ عقل کے ساتھ ساتھ محنت رنگ لائی تو سعید نے پھر دسویں میں وظیفہ حاصل کیا۔ صغری نے اسے کہا کہ اب تم ملتان کے بڑے کالج میں پڑھنے چلے جاؤ۔ سعید نے جواب دیا: نہ اماں کالج میں امیروں کے بچے پڑھتے ہیں کیوں کہ وہاں فیسیں زیادہ ہوتی ہیں۔ خرچے کی وجہ سے میں بھی پریشان ہوں گا اور تم بھی۔ کالج کی تعلیم اور غریب کا بچہ۔ واہ دکھ کے ساتھ سکھ ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ دل چھوٹا مت کرو۔

نہیں اماں میں اب بڑا ہوں۔ کمانے لائق ہو گیا ہوں۔ کلرکی تو مل ہی جائے گی۔ کب تک میں تمھاری ہڈیاں توڑ توڑ کر کھاتا اور پڑھتا رہوں گا؟ میں تمھاری کوئی بات نہیں سنتی۔ تم یہ بتاؤ ابتدائی طور پر کتنی فیس لیں گے؟ سعید نے بتایا تو صغری نے ہنسی کنگن بیچ کر سعید کو پیسے دیے اور روانہ ہونے سے پہلے کہنے لگی۔ بیٹا تم فکر نہ کرو میں ہر ماہ تمھیں خرچہ بھیجتی رہوں گی۔ تم محنت کر کے پڑھتے رہو، میری خواہش ہے کہ تم بہت زیادہ پڑھ لو۔

سعید خاموشی سے ملتان چلا آیا۔ کالج میں داخل ہو گیا۔ پہلے تو وہ ہوسٹل میں رہتا تھا مگر وہاں مزہ نہ آیا کیوں کہ وہاں پڑھائی نہیں ہوتی تھی، کالج کے لڑکے شرارتیں کرتے تھے۔ بہت غصہ آیا۔ سڑک کے ساتھ ایک کمرہ پانچ روپے کرایہ پر مل گیا۔ کمرہ تھا تو چھوٹا مگر سکون تو تھا۔ بازار گیا، ایک چارپائی اور کباڑیے سے میز کرسی بھی لے آیا۔ ایک طرف چارپائی تو دوسری طرف میز کرسی لگا دی۔ ایک دن خیال آیا بوڑھی ماں سارا سارا دن محنت مزدوری کرتی رہتی ہے۔ میں جوان جہان ہو کر بھی چند ٹکوں کا کام بھی نہیں کرتا۔ کچھ سوچ کر بازار گیا۔ دو برش، دو پالش کی کالی اور لال ڈبیاں لے آیا۔ کالج سے آتا، کپڑے تبدیل کر کے اسٹیشن پر چلا جاتا۔ اس طرح روپیہ دو روپے کما لیتا۔ پھر رات کو دیر تک پڑھتا رہتا۔ اس طرح بہت اچھا وقت گزرتا رہا۔ کبھی کبھی چھٹی لے کر ماں کو بھی مل آتا۔ ماں کی ایک ہی بات، سعید بیٹا محنت کرو، محنت کر کے پڑھتے رہو۔

سعید اب بارھویں میں پڑھتا تھا۔ اس کا یہ وطیرہ بن گیا تھا کہ صبح کالج جاتا وہاں سے واپس آ کر بوٹ پالش کرنے اسٹیشن چلا جاتا۔ پھر مٹی کے تیل کے دیے پر آدھی رات تک پڑھتا رہتا۔ شدید سردی کے دن تھے۔ ایک دن بارش برسنے لگی۔ بادل برستے رہے، خار گرتے رہے۔ تمام دن سورج نہ نکلا۔ سعید کالج سے واپس آ کر رضائی اوڑھ کر سو گیا۔ آج بوٹ پالش کرنے بھی نہ جا سکا۔ شام کو اٹھ کر دوائی سے دو روٹیاں خریدیں۔ آنے کی دال کے ساتھ کھا کر کمرے میں آ کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، بارش بڑھتی گئی۔ کوئی دس بجے کا وقت ہو گا کہ دروازہ بجا۔ سعید نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک سولہ سترہ سال کی نوجوان لڑکی

جس کے قیمتی ریشمی کپڑے بارش سے بھیگ کر اس کے تن سے چپٹے ہوئے تھے۔ اس کا جسم ننگے ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ سردی سے کھڑی کانپ رہی تھی۔ سعید اس کی آنکھوں میں ڈر اور خوف کی پرچھائیاں دیکھ کر بولا۔ ”اندر آ جائیں۔“

وہ ڈرتی کانپتی اندر آ گئی۔ سعید نے اپنا پرانے ٹین کا ٹرنک کھولا۔ ایک شلوار قمیض نکالی۔ شلوار میں آزار بند ڈال کر کپڑے اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ”میں باہر کھڑا ہو جاتا ہوں، تم کپڑے بدل لو۔“

سعید باہر نکل آیا۔ نوجوان لڑکی نے کپڑے بدلے۔ آہستہ آہستہ کنگھی کی۔ سعید نے پوچھا۔ ”اندر آ جاؤں؟“

بڑی مشکل سے اس نے کہا۔ ”ہاں“

سعید نے اندر آ کر کپڑے نچوڑ کر دیوار کے ساتھ لٹکا دیے کہ صبح تک سوکھ جائیں۔ یہ کام نمٹا کر سعید نے لڑکی سے کہا۔ ”میرے نوماہی امتحان ہونے والے ہیں، ویسے بھی دیر تک پڑھتا ہوں۔ دوسرا یہ کہ آج کالج کے بعد میں نے کافی سو لیا ہے۔ تمھیں کافی ٹھنڈ لگ رہی ہے تم بستر پر سو جاؤ۔ میں آج تمام رات پڑھتا رہوں گا۔“

وہ لڑکی لیٹ تو گئی مگر دل کے خدشے، ڈر، پریشانی نے آنکھ نہ لگنے دی۔ نیند نہ آئی۔ وہ رضائی میں سے منہ نکال کر شکستہ کرسی پر بیٹھ کر سردی میں پڑھتے ہوئے اس خوبصورت نوجوان کو دیکھتی رہی۔

ایک دو بجے کا وقت ہوگا، سعید کے اندر نفس اور ضمیر کی جنگ چھڑ گئی۔ سعید بے قراری سے پہلو بدلتا رہا۔ اس کے ہلنے سے بڑی اور ٹوٹی پھوٹی کرسی چیختی تو اس لڑکی کی جان نکل جاتی۔ سعید نے ایک مرتبہ چارپائی کی جانب دیکھا۔ وہ لڑکی رضائی سے منہ نکالے سعید کی حالت دیکھ دیکھ کر پہلے ہی دہشت زدہ تھی۔ اب جو اس کی لال لال آنکھیں دیکھیں تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سعید نے اسے دیکھ کر پھر دیے کو دیکھا۔ پھر بائیں ہاتھ کی انگلی دیے کی لو پر رکھ دی۔ جب چمڑی تڑتڑ کرنے لگی تو انگلی ہٹالی۔ سر کو جھٹکا دے کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ گزرے ہوں گے کہ پھر سعید کی حالت خراب ہو گئی اس نے دوسری انگلی دیے پر رکھ دی۔ زیادہ جلی تو جُھر جُھری لے کر اٹھالی۔ پھر پڑھنے لگا۔ سعید کی حالت ایسے ہی بگڑتی رہی اور وہ اپنی انگلیاں جلاتا رہا۔ وہ لڑکی مجبور ہو کر ایک مجبور کا تماشہ دیکھتی رہی۔ اب خوف کی جگہ اس لڑکی کے اندر ہمدردی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ وہ مجبوری کی مجبوری کا تماشہ مجبور ہو کر دیکھتی تو رہی مگر کچھ کہنے سے مجبور ہی رہی۔

سچ ہے وقت کسی کی پروا نہیں کرتا۔ یہ قیامت اور طوفان بھری لمبی رات بھی گزر گئی۔ صبح طلوع ہو گئی۔ بارش رک گئی۔ بادل بکھر گئے، شاید ان کا کام ختم ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی رضائی سے نکل آئی۔ تو سعید باہر نکل گیا۔

وہ کپڑے بدل کر باہر آئی، سعید کو دیکھا۔ جاگنے کی وجہ سے جس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ، منہ کملایا ہوا اور زرد ہو رہا تھا۔ اس لڑکی کے دل سے چیخیں نکل گئیں۔ ہونٹ ہلے مگر الفاظ گلے میں پھنس گئے۔ صرف دو آنسو ٹپک کر گرے اور وہ آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد سعید نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے یوں لگا کہ ساری رات مَنوں بوجھ تلے دبا پڑا رہا ہو۔ وہ گئی تو جیسے سارا بوجھ اتر گیا۔ اب عقل ٹھکانے آئی اور ہاتھ کے درد نے بے تاب کیا۔ پرانی چادر پھاڑ کر پٹیاں باندھیں۔ اس وقت سعید کو ماں یاد آئی۔ خیالوں میں سعید ماں سے باتیں کرنے لگا۔

''ماں ... میری اچھی ماں ... آج آ کر دیکھو ... تمہارا بیٹا کتنا محنتی ہے ... بھلے ہاتھ کی ساری انگلیاں کوئلہ ہو گئی ہیں ... اس امتحان میں نمبر تو ... سو کے سو لیے ہیں۔''

خوشی کے مارے سعید کے آنسو بہنے لگے۔ ہاتھ میں جلن بہت بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر سعید کو بخار ہو گیا۔ رضائی اوڑھ کر سو گیا۔ آج کالج بھی نہ جا سکا۔

وہ لڑکی ایک امیر کبیر شخص میاں دلاور کی بیٹی نسرین تھی۔ گھر والے تمام رات سو نہ سکے۔ ہر طرف فون کھڑکایا۔ کاریں بھگائیں مگر نسرین کا کوئی اتا پتا نہ ملا۔ صبح نسرین گھر پہنچی وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔ نسرین کو ماں نے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''میری تو جان نکل گئی، تم کہاں رہ گئی تھی؟''

نسرین نے جواب دیا۔ ''اماں میں رات خدا کے پاس رہ گئی تھی۔''

یہ بات سن کر سارے گھر والے پریشان ہو گئے۔ یہ فکر کہ نسرین کا دماغ تو ٹھیک ہے؟ نسرین دوبارہ بولی۔ ''سچ اماں! رات خدا کے ساتھ گزاری ہے۔ وہ تمام رات سردی میں کرسی پر بیٹھا رہا۔ میں رضائی اوڑھ کر سوئی رہی۔''

نسرین کی ماں رونے پیٹنے لگی۔ ''ہائے ہائے میری بیٹی پاگل ہو گئی ہے۔ خدا کے لیے ڈاکٹر کو بلاؤ!''

میاں دلاور نے بڑے حوصلے سے پوچھا۔ ''نسرین بیٹی تم کیا کہہ رہی ہو؟''

نسرین بولی۔ ''بابا ٹھیک تو کہہ رہی ہوں۔ قرآن پاک میں نہیں آیا، اللہ میاں نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ انھیں آدمیت اور انسانیت کا شرف بخشا۔ بے شک فرشتے شور مچاتے رہے۔ اللہ میاں نے آدم علیہ السلام کو زمین کی خلافت بھی دے ڈالی۔ اسی طرح بے شک اس کی انگلیاں جل کر کوئلہ ہو گئیں۔ اس نے انسانیت کو شرف بخشا۔ آدمیت کی عزت کی۔ خود ساری رات سردی میں ٹھٹھرتا رہا مگر مجھے گرم گرم بستر دے دیا۔ اسی خدا کے پاس تو رہ گئی تھی۔''

میاں دلاور کے پلے کچھ نہ کچھ بات پڑی۔ وہ نسرین کو اندر لے آیا۔ تمام لوگ صوفوں پر بیٹھ گئے۔

دلاور خان بولا۔ ”بیٹی اب تم تمام باتیں تسلی سے بتاؤ۔“

”بابا کل جس وقت کالج سے چھٹی ہوئی مجھے نرگس اور رابعہ نے کہا ہمارے گھر چائے پی کر چلی جانا۔ میں کہتی رہی میری کار آئے گی اس پر چلے جائیں گے مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔ ہم تانگے پر بیٹھ کر چلی گئیں۔ چائے پی کر سب کا فلم دیکھنے کو جی چاہا۔ پھر ہم فلم دیکھنے چلے گئے۔ ایک تو فلم بے ہودہ تھی۔ دوسرا نرگس اور رابعہ کا گندا مذاق۔ مجھے جو غصہ آیا اٹھ کر چل پڑی۔ غصے میں کوئی بات نہ سوجھی۔ ہوش آیا تو بارش سے تمام کپڑے بھیگ گئے تھے۔ ایک تو راستے کا پتہ نہ تھا اوپر سے بجلی چلی گئی۔ پھر تو بہت ہول اٹھا۔ ایک دروازے سے روشنی کی جھلک دیکھی۔ سردی لگی ہوئی تھی۔ مجبور ہو کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک نوجوان شاید بارھویں میں پڑھتا ہے نے دروازہ کھولا۔ مجھے اندر لے گیا۔ چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ ایک طرف چارپائی اور دوسری جانب میز کرسی پڑی تھی۔ اس نے مجھے اپنے کپڑے دیے اور باہر چلا گیا۔ میں کپڑے بدل کر رضائی میں پڑ رہی وہ ساری رات سردی میں مٹی کے تیل کے دیے میں پڑھتا بیٹھا رہا۔ اس پر شیطان نے بڑے حملے کیے وہ اپنی انگلیاں دیے پر جلاتا رہا۔ اس طرح اس کی بائیں ہاتھ کی انگلیاں جل کر کوئلہ ہو گئیں۔“

”بابا تم بتاؤ! کیا میں نے جھوٹ کہا ہے؟ آدمی تو وہ ہوتے ہیں جو بھائیوں کے گلے کاٹتے ہیں۔ بہنیں بھی ممتا پر کلہاڑیاں چلاتی ہیں۔ آدمی تو آدمی کا لہو پیتا ہے۔ نقب لگاتا ہے۔ قتل کرتا ہے۔ خون پسینے کی کمائی چھین لیتا ہے۔ دوسرے کی عزت خوار کرتا ہے۔ دودھ میں پانی ملاتا ہے۔ آٹے میں مٹی۔ گھی میں تیل۔ تیل میں ڈیزل۔ مرچوں میں سرخی ملاتا ہے۔ آدمی آدمی کی کمائی پر خود عیش کرتا ہے۔ محلات اسارتا ہے۔ دوسروں کی کمائی سے اپنے کتوں کو دودھ ملائیوں سے موٹا تازہ کرتا ہے۔ ہر کمانے والے سے سوکھی روٹی بھی چھین لیتا ہے۔ آدمی تو بابا یہ ہوتے ہیں۔“

”اس نے تو انسانیت کو شرف بخشا ہے۔ آدمیت کی عزت کی ہے۔ وہ آدمی نہیں ہو سکتا بابا! وہ خدا ہے۔ میں نے اچھی طرح دیکھا ہے۔ وہ خدا تھا۔“

میاں دلاور آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ”ہاں میری بیٹی، تم سچی ہو۔ تم سچ کہتی ہو۔“

☆☆☆☆

محمد ظہیر احمد
سرائیکی ترجمہ: ضیاءالدین نعیم

خواب

(بیچوں بیچ کہیں کھیتوں کے)
یوں لگتا ہے کنواں ہے کوئی
کوا بولتا ہے شیشم پر
چڑیوں کی چہکار ہے ہر سو
لوٹے، کنویں پر گردش میں ہیں
بیلوں کا جوڑا بھی ایک
اک چکر میں گھوم رہا ہے
رقص میں پودے باجرے کے ہیں
گھاس پہ شبنم چمک رہی ہے
عورتیں بھینسیں دوہ رہی ہیں
دھواں ہر اک گھر سے اٹھتا ہے
چولہوں پر بنتی ہے چائے
ایسے میں یک بیک کہیں سے
گھن گرج آتی ہے توپوں کی -----
اور سہانا خواب یہ میرا
ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے

سندھی تخلیق و ترجمہ: ادل سومرو

جوگی نے کہا وہ آئے گا

یہ دھوپ تو بڑھتی جائے گی
کب سورج ریت میں ڈوبے گا
سب گیت ادھورے بھاگی کے
یہ تھر دکھیارا آج بھی ہے
کھارا ہی سہی پانی تو ملے
یہ چیڑہ پڑا ہے بالوں میں
اب کون کرے کنگھی اے سکھی!
اک بوند نہ برسی دھرتی پر
بادل کو منائے کون یہاں
گندم کو ترستے چھاج سبھی
وہ آنکھیں ساری ڈوب گئیں
اب ڈورے ہم پر ڈالے کون
میں دھاگا باندھ کے آئی تھی
کیکڑ کی سُوکھی بانھوں میں
جوگی نے کہا: وہ آئے گا

اس پھٹے پُرانے آنچل میں
یہ دھرتی سرتی ہے اپنی
کیوں چھوڑ کے اس کو جائیں ہم
یہ غم والم ہیں ڈاج سبھی
یہ درد کہانی کون سُنے
ہر بندہ ہے مصروف یہاں
یہ ریت کا رستہ آنکھوں میں
کوئی مور اُڑا تھا سپنوں میں
اپنوں میں ڈھونڈا تھا اُسے
وہ ایک مسافر پردیسی
کس شہر میں جا کر وہ ہے بسا
جو، تھر کا دُکھ سمجھتا ہے
وہ میرا درد بھی جانے گا
اک روز ہوا کے رتھ پر وہ
بادل بن کر آئے گا

☆☆☆☆

سندھیا شاہ
سندھی سے ترجمہ: سدرۃ المنتہٰی جیلانی

آوارہ گرد

ایک بے یقین صبح پھر اس کے سر پہ کھڑی تھی۔ روشنی در و دیوار پھلانگتی ہوئی اس تک پہنچ رہی تھی۔ کانوں میں سرگوشیاں کرتی آنکھوں میں چبھتی رہی۔ کھڑکیاں دونوں کھلی رہ گئیں تھی۔

اس نے چادر سر سے ہٹا کر روشنی کو دو آنکھوں سے گھورا تو وہ کھلکھلائی اسے پتہ تھا روشنی کس کے تابع چلتی ہے---تم بھی مجھے چھیڑنے لگی ہو---وہ شکایت سے بڑبڑایا---اس کا کہا مانتی ہو---میری طرح احمق ہوتا---پر آج نہیں---وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے بستر پہ لیٹے لیٹے آج پھر اس کی مسکراہٹ کو محسوس کیا تھا۔

مگر آج نہیں---وہ بڑبڑاتا--- بکتا جھکتا---اٹھا---چادر دور پھینکی---تکیہ الٹا۔ الماری کھولی سوٹ نکالا واش روم میں گھس گیا۔ وہ تب بھی مسکراتا رہا۔ اس نے محسوس کیا۔

وہ اس کی مسکراہٹ کو پوری طرح سے نظر انداز کر کے باہر آیا چہرہ صاف کیا۔ کف بند کیے--- بالوں میں برش کیا---پرفیوم کی آدھی شیشی خود پہ چھڑک دی اور آئینے میں خود کو آنکھ ماری۔ وہ تب بھی مسکرا رہا تھا آسمان پہ---اور اس نے کہا: آج نہیں---آج سارنگ تیرے نہیں ہاتھ آنے والا۔

ایک نہیں سنوں گا---ایک بھی نہیں---کئی صدیاں تکلیف کی گزار کر آیا ہوں---اب نہیں---اسے ہر رات کی تکلیف نے ہرا دیا تھا۔ اس رات بھی جب خود سے ہارتے ہوئے سوال کیا تھا--- تب بھی وہ وہیں تھا---سن رہا تھا---مگر اس نے کچھ نہیں کہا---نہ کیا---وہ دکھ کی شدت سے آگ کے الاؤ میں جل رہا تھا---اور نیند آنکھوں سے دور تھی---وہ تھا اور اس کی تنہا رات تھی---ویسے بھی وہ راتوں کو کہاں سوتا تھا---رات ہی میں تو اس کے اندر کا دن ابھرتا تھا---جاگتا تھا---

کتاب قلم اور کتابیں تھیں---مصلی اور تسبیح تھی۔ وہ اپنے سارے بے ترتیب کام رات میں ہی سمیٹا کرتا اور ہر دفعہ ہر کام ادھورا چھوڑ کر سو جاتا جب صبح کی پہلی کرن پھوٹتی تھی---کچھ گھنٹوں بعد الارم بجتا---دفتر جانے کا وقت ہوتا---وہ اٹھتا لڑکھڑاتا ہوا بمشکل تیار ہوتا دفتر جاتا۔

دوپہر میں بریک---شام میں مسجد---اور رات وہی---پھر وہی---قلم، کتاب، کاغذ اور مصلے، نماز، تسبیح---اس کے استغفار کی تسبیح بڑھتی جا رہی تھی---مگر اس کے گناہ تھے کہ گھٹنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے---اسے لگتا جیسے گناہوں کا پہاڑ بن گیا ہے---اور وہ جتنی بھی کوششیں کر لے وہ پہاڑ اپنی جگہ سے نہیں

ہٹ سکتا۔ اب پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹتے ہیں کیا؟ یہ خود سے اس کا سوال تھا جس کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسے سال نہیں جیسے صدیاں بیت گئیں تھیں۔۔۔

وہ پینتیس سال کی عمر گزار کر نہیں آیا تھا۔۔۔ وہ پینتیس صدیاں گزار آیا تھا اور ابھی جانے کتنی صدیاں باقی تھیں۔۔۔ بظاہر ایک تگڑا مرد۔۔۔ اور اندر سے پچھتر صدیوں کا بڈھا بن چکا تھا۔ جبھی گوٹھ کی گلیوں میں خود کو سائیں کہلوانے لگا تھا۔۔۔ اور سائیں کہلواتے وقت جی چاہتا بڑے سائیں کا حجرہ بسا کر گوشہ نشینی اختیار کر لے۔۔۔ مگر اسے پتہ تھا سکون تو اسے وہاں بھی نہیں ملنا تھا۔۔۔

اسے اب یقین ہو چلا کے اس کے سکون کی جگہ بس وہی دو گز زمین ہی ہے جہاں اس کا آخری محل تعمیر ہونا ہے اور تبھی موت کا آخری احساس اس کی جان لے لیتا تھا۔۔

موت سے مفر کسے تھا۔۔۔ ڈرتا بھی کون تھا۔۔۔ پر کیا کیا جائے کہ جینے کی چاہ باقی تھی۔۔۔ اور اسی لیے۔۔۔ اس نے کہا بس آج نہیں۔۔۔ بس بہت ہو گیا۔۔ کتنے کیے سجدے لمبے لمبے۔۔ راتیں گزار دیں اک تیری یاد میں تجھے منانے کو۔۔ پر تو نہ مانا۔ اک صدا تک نہ سنی میری۔۔۔ اک آواز تک نہ دی مجھے۔۔۔ میں تیرے لیے ایک دنیا بھلا کر آیا تھا۔۔۔ سارے زخموں کو بھلائے۔۔۔ ساری شکایتیں بحیرہ عرب میں ڈبو کر۔۔۔ میں تیرے پاس لوٹنا چاہتا تھا۔۔۔ میں تیرا ہو کے رہنا چاہتا تھا۔۔۔ پر آج نہیں۔۔۔ بس اب نہیں۔۔۔ اس نے کھلا بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔

آج میں اس سے بھی ملوں گا، جسے تیرے لیے چھوڑا تھا۔۔۔ تیرے مذہب نے جس کے دروازے مجھ پہ بند کر دیے تھے۔۔۔ پر اب نہیں۔۔۔ میں اپنے سارے دروازے کھول دوں گا۔۔۔ آج میں گیتی آرا سے ملوں گا۔ اس نے آئینے میں خود کو آنکھ ماری۔۔۔

گاڑی کی چابی اٹھائی اور سیٹی بجاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ وہ تب بھی مسکرا رہا تھا اور اس نے کہا آج نہیں، آج اس کی عید کا دن تھا۔ گاڑی میں فل میوزک چلائے، وہ سیٹیاں بجاتا ہوا، گیتی کے گھر پہنچا۔۔۔

گیتی کسی ادھیڑ عمر آدمی کے ساتھ کہیں تیار ہو کر باہر نکل رہی تھی۔۔۔ محبت نے بے وفائی کا چولا پہن لیا تھا۔ اس نے دیکھا وہ وہیں مسکرایا۔

تو نے پھر مجھے ہرا دیا۔۔۔ اس نے گاڑی موڑ دی۔۔۔ پر آج نہیں۔۔۔ وہ روہانسا ہو گیا مگر رونے نہ دیا خود کو۔۔۔ کہنے لگا بس آج نہیں۔۔۔ آج شام فرید کے ساتھ خوب چڑھائی۔ اتنی پی کے حد ہو گئی۔۔۔ ایک نہیں۔۔۔ چار چار بار۔۔۔ سمندر کے کنارے کسی سبز اوڑھنی والی اداس آنکھوں سے گھورتی ہوئی شبنم جیسی پھوار پڑتی ہوئی دل کشی کو چھوا اور مستی میں آ کر سمندر کی لہر کو اس کے اوپر اچھالا۔۔۔ وہ کھلکھلائی۔۔۔ اسے سمندر کی لہر میں دھکیلا۔۔۔ وہ ہنسا۔۔۔ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔۔۔ وہ مستانہ لگنے لگا۔

ساحل سمندر پر دوڑتے بھاگتے لہروں سے کھیلتے ہوئے تھکے تو خشکی پہ بیٹھے مٹی کے گھر بنانے لگے تھے۔۔۔ جو ایک لہر نے مٹایا۔۔۔ وہ اس کو مسمار کر رہا تھا۔ اس نے شکایت سے آسمان کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرا رہا تھا اور اس نے آنکھوں میں آئی ریت کی وجہ سے آنکھیں رگڑتے ہوئے خفگی سے ناراض بچے کی طرح منہ بسورا اور کبھی نہ بات کرنے کا کمزور عہد کر کے کپڑے جھاڑ کے اٹھا۔۔۔ اسے دیکھنے لگا جو۔۔۔ جو تھک کر بینچ پر جا کر بیٹھ گئی تھی اور اسے ان ہی معصوم نگاہوں سے دھیمی مسکراہٹ سے ٹانگیں جھلاتے ہوئے اک ادا سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔۔۔

اس نے مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔۔۔ اور اس کی طرف پلٹا۔ وہ اٹھ کر بھاگی۔۔۔ اس نے کہا آج نہیں۔۔۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔۔۔ وہ بھاگی۔۔۔ بھاگتی رہی۔۔۔ ہنستی رہی۔۔۔ مگر درحقیقت اس کے جنون سے گھبرا گئی تھی۔۔۔ وہ گھبرا گئی تھی اور اس کی وہی رٹ تھی۔۔۔ کے آج نہیں۔۔

وہ ہاتھ تھام کر سب کچھ کہ دینا چاہتا تھا۔ وہ آج خود کو مکمل کرنا چاہتا تھا۔ وہ احساس محرومی کی موت اپنے ہاتھوں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے تنہائی کا گلہ دو ہاتھوں سے گھونٹنا چاہا، خوب مستی کی، کچھ آدھی ادھوری۔۔۔ خواہشوں کا دھواں اٹھتا رہا۔۔۔ وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔ ابھی کیا کچھ رہتا تھا۔

اس نے پھر چڑھا دی۔۔۔ اتنی کہ ہوش نہ رہا۔۔۔ فجر تو گئی تھی۔ ظہر عصر مغرب بھی۔۔ اور عشا آخری مراحل میں تھی۔۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔۔۔ کہنے لگا آج نہیں۔ دن بھر کی آوارہ گردی۔۔۔ اور دنیا بھر کی ٹھوکروں کے بعد فریدا سے اس کے گھر چھوڑ گیا نیم بے ہوشی کی حالت میں وہ بستر پر اوندھے منہ گرا تھا۔۔۔ گیتی کا چہرہ نظر کے سامنے آیا۔۔۔ پھر اس سبز اوڑھنی والی کا ہاتھ چھڑانا۔۔۔ بھاگتے رہنا۔۔۔ دن بھر کی خواری۔۔۔ دنیا بھر کی رسوائی۔۔۔ لعنت ملامت۔۔۔ وہ سب اسی کو برا بھلا کہہ گئے تھے۔ جو اس کی پاک بازی کی بڑی بڑی مثالیں دیتے تھے۔

اس کے اندر سے دکھ کا لاوا پھٹ پڑا۔ وہ لڑھکتا ہوا اٹھا۔ میز سے ٹکرایا۔۔ تسبیح مصلے ایک طرف پھینکے۔۔۔ کتابیں قلم کاغذ اڑا دیے۔۔۔ سب چیزیں اٹھا اٹھا کر پٹخنے لگا۔۔۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔۔۔ زمین آسمان ایک کرنے لگا تھا۔۔۔ میز سے ٹکرانے کے سبب چوٹ آئی۔ کوئی کیل گھٹنے میں چبھی تھی۔۔۔ خون رسنے لگا۔۔۔ درد ہوا۔۔۔ رونے میں تیزی آئی۔۔۔ تیزی میں شدت۔

گیتی آرا۔۔ سرخ ساڑھی۔۔ ادھیڑ عمر آدمی۔۔ سبز اوڑھنی۔۔ کھلکھلاتی ہنسی۔۔ ہاتھ چھڑا کر بھاگ جانا۔۔ لعنت ملامت۔۔ برا بھلا۔۔ دن بھر کی خواری۔۔ ساری چوٹیں تازہ۔۔ سارے سوال زندہ ہو گئے۔۔ شکایتیں منہ زور گھوڑے کی طرح ہنہنائیں اور وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا اتنا رویا کے آنسوؤں کا سمندر بن گیا اور جب اتنا رویا تو وہ مہربان مسکراہٹ والا بھی اس کے ساتھ رو پڑا اور اسے اپنی مہربان بانہوں میں سمیٹ لیا۔

بخش مھرانوی

سندھی سے ترجمہ: فہیم شناس کاظمی

روایت نہیں بدلتی

گھر کی دیوار پر خوابوں کے دشمن ہیں
انا کی تیز چھریاں
احساسات کو قتل کرتی ہیں
فاصلے
فیصلوں سے زیادہ لمبے ہیں
کشادہ آنگن میں
تنگ اور بے رحم دل
مبارک باد کی کھجوریں کھاتے ہیں
ہر پس منظر میں
ایک دردناک منظر جاگتا ہے
آہوں کے تاش
احتجاجی ریلیاں
نیند میں ڈوبی مامتا کو جھنجھوڑتی ہیں
ماں کے سب حواس
باپ کی پگڑی میں قید ہیں
معصوم چاہت کی نیلامی

خودکشی کے آخری خط کا
عنوان مخفی ہے
اور ایک چڑیا
اپنے آشیانے سے
گہری خموشی
گمبھیر اداسی
چھوڑ کر
اجنبی دیس کو اُڑ جاتی ہے

☆☆☆☆

گوجری تخلیق وترجمہ: احمد سلیم سلیمی

ہاشم بیگم

موسمِ بہار کی آمد آمد تھی۔ افسردہ اور بوجھل لمحے رخصت ہو رہے تھے۔ ہر وجود پہ بہاری ہواؤں کی آمیزش سے نشے کی سی کیفیت طاری تھی۔ سانس سانس میں گویا مہکاری اُتر رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے، خوشبو کے بوجھ سے جیسے لڑکھڑا رہے تھے اور چاروں طرف مستی بکھیر رہے تھے۔

وہ ایک ایسی ہی بہاراں بہاراں شام تھی۔ ریاست گوپس کے حاکم کے قلعے کا بڑا سا پھاٹک کُھلا، چند گھڑ سوار قلعے کے اندر سے نمودار ہوئے اور ہلکی ہلکی رفتار سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے مغربی سمت روانہ ہوئے۔ گھوڑوں پہ شہزادی ہاشم بیگم اور اس کی سہیلیاں سوار تھیں۔ اگلے دن جشن نوروز تھا۔ وہ جشن نوروز کے لیے پھول چننے پہاڑی باغ کی طرف جا رہی تھیں۔

شہزادی ہاشم بیگم، حاکمِ گوپس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بڑے ہی نازوں کی پلی تھی۔ بہت ہی حسین تھی۔ اس کی خوب صورتی کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ چترال سے لے کر ہنزہ گلگت تک، راجوں اور میروں کے بیٹے اسے اپنانے کے آرزومند تھے لیکن حاکم گوپس نے کسی کو بھی مثبت جواب نہیں دیا تھا۔

شہزادی ہاشم بیگم اور اس کی سہیلیاں، آہستہ آہستہ گھوڑے دوڑاتی ہوئی پہاڑی باغ میں پہنچ گئیں۔ پہاڑی باغ قلعے کے مغربی سمت ایک سرسبز پہاڑی پہ تھا۔ پہاڑی چھاتی پر سے کسی چشمے سے پانی بہتا پتھروں سے ٹکراتا ہوا نیچے آتا تھا۔ باغ میں داخل ہو کر ندیوں کی شکل میں گُنگناتا، پھولوں اور پیڑوں کو آئینہ دکھاتا، تازگی اور ہریالی کو بڑھاتا گزرتا تھا۔

شہزادی ہاشم بیگم اور اس کی سہیلیاں باغ میں آ کر چاروں طرف پھیل گئیں اور خوشنما ٹوکروں میں مختلف قسم کے پھول توڑ کر بھرنے لگیں۔ ہاشم بیگم اور اس کی خالہ زاد بہن صحیفہ پھول چُنتی، ہنسی مذاق کرتی ہوئی باغ کے کونے تک آ گئیں۔ وہاں سے نیچے نشیب میں گوپس کی آبادی نظر آ رہی تھی۔ بڑا ہی دل فریب منظر تھا۔ دور دور تک سرسبز کھیت اور اونچے اونچے درخت دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے درمیاں وادیِ گوپس کے کچے پکے مکانات بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ کچھ دور دریا کا نیلگوں پانی، بڑے ہی سکون سے بہتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شہزادی اس جادوئی منظر سے دم بخود سی نیچے گوپس کی آبادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صحیفہ نے اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کر اسے دھیرے سے پکارا تو وہ چونک پڑی اور سر گھما کر بولی۔ ''صحیفہ! ذرا دیکھو تو کیسا حسین منظر ہے! یوں لگتا ہے جنت کی کوئی کھڑکی کھلی ہے۔''

صحیفہ بولی۔ ''ہاشم! بے شک یہ بہت ہی حسین منظر ہے لیکن مجھے سخت ڈر لگ رہا ہے۔ ابھی میں نے کسی اجنبی کی جھلک دیکھی ہے۔ وہ ایک درخت کے پیچھے سے نکل کر دوسری طرف جا رہا تھا۔''

شہزادی بے نیازی سے بولی۔ ''پھر کیا ہوا۔ نیچے آبادی سے کوئی آیا ہوگا۔ جشن نوروز کے لیے پھول چُن رہا ہوگا۔''

صحیفہ کو یوں خوف زدہ دیکھ کر ہاشم بیگم کھل کھلا کر ہنس پڑی اور اسے مزید ستانے کے لیے دوسری طرف دوڑتی ہوئی بولی۔ ''مجھے تو ابھی نہیں چلنا۔ میرا ٹوکرا ویسے تو پھولوں سے بھر گیا ہے لیکن ابھی میں جی بھر کے ان نظاروں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ کچھ دیر اور ان پھولوں کے بیچ رہنا چاہتی ہوں۔''

صحیفہ اسے آواز دیتی ہوئی پیچھے پیچھے دوڑنے لگی۔ ہاشم بیگم درختوں کے پیچھے چھپتی ہوئی، صحیفہ کی بے تابی پہ ہنستی، دوڑتی ہوئی دوسری طرف جا رہی تھی۔ یکا یک وہ ٹھٹھک کر رُک گئی۔ چند قدموں کے فاصلے پر ایک اجنبی کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ ہر چیز کا عکس دھندلا دھندلا لگ رہا تھا۔ وہ اجنبی بھی دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ کچھ تو شام کی سیاہی تھی، اس پہ اس شخص کا رنگ ایسا سیاہ تھا کہ بہت ہی خوف ناک لگ رہا تھا۔ رنگت کے ساتھ ساتھ چہرے کے خطوط بھی بے ڈھنگے سے تھے۔ چہرے کی نسبت سر بہت بڑا تھا۔ لمبے لمبے بال سامنے چہرے پر اور پیچھے کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ شہزادی اس کی صورت دیکھ کر ایک لمحے کو ڈری گئی تھی۔ پھر ہمت کر کے اس سے ذرا سا کترا کے گزرنے لگی۔ اس سے گزر کر دو ہی قدم اُٹھائے تھے کہ دِل دھک سے رہ گیا۔ پیچھے سے اس کی بھاری سی، گونجتی ہوئی آواز سنائی دی، ''اے لڑکی! ذرا ٹھٹ...... ٹھہرو۔''

شہزادی کے دِل پہ خوف کا بوجھ سا پڑا۔ اسی وقت اسے صحیفہ کی آواز سنائی دی، وہ اسے پکارتی ہوئی اسی طرف آ رہی تھی پھر اس اجنبی کو دیکھ کر وہ بھی چونک گئی۔ سہمی سہمی نظروں سے کبھی اسے اور کبھی شہزادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہاشم بیگم نے ہمت کر کے اجنبی کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی ہی محویت سے اسے گھور رہا تھا۔ سیاہ بدصورت چہرے پر اس کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں بڑی ہی ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔ ہاشم بیگم نے ذرا سا انتظار کیا کہ شاید وہ بولے گا۔ مگر وہ خاموشی سے اسے گھورتا جا رہا تھا۔

ہاشم بیگم نے حوصلہ کر کے ذرا تیز اور بارُعب لہجے میں پوچھا...... ''کون ہو تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟''

اس کی بات پہ وہ اجنبی چونک سا گیا پھر لکنت زدہ آواز میں بولا۔ ”مم...... میں مسافر ہوں۔ وادیِ چچ...... چترال کا رہنے والا ہوں۔ دو...... دوستوں کے ساتھ شش...... شکار کھیلتا ہوا ادھر آ نکلا ہوں۔“

شہزادی غصے سے بولی۔ ”شکار اس باغ میں تو نہیں ملتا۔ اوپر پہاڑ کی طرف چلے جاؤ۔ یہاں کیوں آئے ہو؟“

اجنبی نے کہا۔ ”ہم پہاڑ پہ ہی شش...... شکار کھیل رہے تھے۔ ایک چکور کو تت...... تیر لگا اور زخمی ہو کر اڑتا ہوا بب...... باغ کی طرف آیا۔ مم...... میں نے ہی تیر چلایا تھا۔ اس لیے دو...... دوستوں کو چھوڑ کر خود تلاش کرتا ہوا ادھر آ نکلا ہوں۔ تم کک...... کون ہو؟ انسان ہو یا اس باغ کی پپ.... پریاں ہو؟“

صحیفہ تب تک خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”یہ شہزادی ہاشم بیگم ہے۔ گوپس کے راجہ کی بیٹی ہے۔ تم اجنبی ہو اس لیے معاف کیا جاتا ہے ورنہ یوں منہ اُٹھائے باغ میں آنے کی ہر کسی کو اجازت نہیں۔“

اجنبی نظر بھر کے شہزادی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مم...... میرا دِل گواہی دد...... دیتا تھا تم کوئی عام لڑکی نہیں ہو۔ میں تجھے کوہِ قاف کی پری سمجھ بب...... بیٹھا تھا۔ تجھے دیکھ کر ایسا لل...... لگ رہا تھا کہ تیر چچ...... چکور کو لگا ہے مگر زخمی مم...... میں ہوا ہوں۔“

شہزادی غصے سے چلا کر بولی۔ ”اے، زبان سنبھال کر بات کرو۔ اپنی صورت دیکھی ہے۔ کوئلے کی کان سے نکلے ہوئے بلے جیسے لگتے ہو۔ اس پہ باتیں یوں کرتے ہو جیسے گُل فام ہو۔“

اجنبی کے ہونٹوں پہ زخمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ بڑا ہی سیاہ نصیب تھا۔ چہرہ اتنا بدصورت تھا کہ دوسری دفعہ دیکھتے ہوئے ہول اُٹھنے لگتا تھا۔ اس پہ آواز بھی صاف نہیں تھی۔ رُک رُک کر بولتا تھا وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”مم...... مجھے علم ہے کہ میں بب...... بہت بدصورت ہوں۔ مگر اس بب...... بدصورت جسم کے اندر جو دِل ہے وہ بڑا ہی حُسن پرست ہے۔ تت...... تم کچھ بھی کہو بس بات اتنی سی ہے کہ پپ...... پہلی نظر میں تت...... تجھ پہ قربان ہوا ہوں۔“

شہزادی ہاشم بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس گستاخ کی بوٹی بوٹی کر دے۔ بڑے بڑے شہزادوں کی یہ ہمت نہیں ہوئی تھی کہ ایسے انداز میں اس سے بات کرتے۔ وہ غصے کی شدت سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”بدبخت! نامراد! شاید تجھے اندازہ نہیں کہ تمھاری اس بدتمیزی کی کتنی شدید سزا ملے گی۔ میرے ایک اشارے پہ میرے ابا حضور تمھارے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیں گے۔“

اجنبی دھیرے سے ہنس کر بولا۔ ”زیادہ غغ.... غصہ مت دکھاؤ پپ...... پیاری شہزادی! تجھے یہ پسند نہیں تو چچ...... چلا جاتا ہوں، مم...... مگر جہاں بھی جاؤں تم میرے سس...... ساتھ رہو گی۔ جب ان پہاڑوں پہ برف

کی سفید چادر بچھے گی اور او نچے او نچے پپ... پہاڑوں سے جنگلی جانور نیچے خوراک کی تت..تلاش میں اتریں گے.... میں پھر لوٹ آؤں گا۔“

اجنبی نے یہ کہا، اسے نظر بھر کر دیکھا پھر پلٹ کر چلتا ہوا درختوں کے درمیان غائب ہوگیا۔ شہزادی ہاشم بیگم اور صحیفہ بھی تیز تیز چلتی ہوئی سہیلیوں کی طرف آگئیں جو بڑی بے قراری سے چشمے کے پاس ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کے پہنچتے ہی وہ سب گھوڑوں پہ سوار ہو کر آبادی کی طرف چل پڑیں۔

اگلے دن جشن نوروز تھا۔ گوپس کے سب لوگ طرح طرح کے کپڑوں میں ملبوس خوشی اور مسرت کا اظہار مختلف کھیل تماشوں سے کر رہے تھے۔ ایک جگہ زبردست میلہ لگا ہوا تھا۔ بچے، بوڑھے، عورتیں مرد سب میلے میں شریک تھے۔ شہزادی ہاشم بیگم بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ میلے میں آئی تھی۔ وہ مختلف قسم کے کھیل تماشے دیکھتے ہوئے ایک جگہ آگئی۔ وہاں علاقے کے بوڑھے ایک خاص قسم کا روایتی رقص پیش کر رہے تھے ان بوڑھوں نے مقامی طرز کا دنبے اور بکری کے بالوں سے بنایا گیا چوغہ پہن رکھا تھا جسے مقامی زبان میں ”شُوقہ“ کہتے ہیں۔ یہ ایسا دلچسپ تماشا تھا کہ لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ شہزادی سہیلیوں کے ساتھ بوڑھوں کا رقص دیکھنے لگی۔ لوگ احترام کی وجہ سے اس کے قریب نہیں آتے تھے۔ دور دور سے اسے دیکھتے، سلام کرتے اور ادب سے سر جھکا کر تعظیم دیتے ہوئے گزر جاتے تھے۔

ایسے ہی وقت اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پاس ہی ہے۔ اس نے چونک کر سر گھما کر دیکھا۔ پھر غصے اور نفرت کی ایک شدید لہر اس کے دِل میں اُٹھی۔ اس کے قریب ہی وہ بدصورت اجنبی کھڑا تھا اور بڑی ہی میٹھی میٹھی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہاشم بیگم کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ جانتی تھی اس کے ایک ہی اشارے پہ یہ سب لوگ اجنبی کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتے تھے۔ ہاشم بیگم کے جی میں آیا کہ چیخ چیخ کر لوگوں سے کہہ دے۔ ابھی وہ یہ سوچ رہی تھی، اجنبی دھیرے سے بولا۔ ”پپ...... پیاری شہزادی! میں جج...... جانتا ہوں مجھے دیکھ کر تمھیں سخت غص...... غصہ آیا ہے۔ لل...... لیکن میں کیا کروں خود پہ میرا اختیار نن...... نہیں رہا ہے۔ تت...... تمھاری صورت آنکھوں کے سامنے پھرتی رہی اور مم...... میں تجھے ڈھونڈتا ہوا آیا ہوں۔ تجھے زز...... زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ مم...... میں ابھی چلا جاتا ہوں۔ ہم نے واپس چچ...... چترال جانے کا فف...... فیصلہ کیا ہے۔ لیکن میں پھر آؤں گا۔ اگر نہیں آسکا تو تجھے لے جاؤں گا“ اس نے یہ کہا اور لوگوں کی بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ شہزادی غصے سے ہونٹ کاٹتی ہوئی سوچنے لگی کہ اپنے لوگوں سے کہہ کر اسے تلاش کرائے اور اس کی بدتمیزی کی سخت سزا دے۔ مگر وہ فطری طور پر بہت رحم دِل تھی۔ اس لیے اس کی گستاخی پر محض ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

شہزادی ہاشم بیگم کافی دنوں تک ذہنی طور پر پریشان رہی۔ اس اجنبی کی گستاخی اور دلیری رہ رہ کے اسے کچوکے لگاتی۔ شہزادی کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس اجنبی کا منہ نوچے، اس کی گستاخ زبان حلق سے باہر کھینچ لے۔ جب کچھ بھی کرنا ممکن نہ ہوتا تو غصے اور نفرت سے مٹھیاں بھینچ کر خاموش رہتی۔

دن گزرتے رہے۔ دور ونزدیک کی ریاستوں کے بڑے بڑے گھرانوں کے لیے اس کا رشتہ مانگا گیا۔ لیکن وہ انکار کرتی رہی۔ راجہ گوپس بھی ہاشم بیگم کو خود سے دور کرنے کے تصور سے ہی گھبرا جاتا تھا۔

ایک روز ریاست چترال سے ایک وفد آیا۔ اس وفد میں چترال کے حکمران خان رئیس کے دربار کے مصاحبین اور وزراء شامل تھے۔ وفد خان رئیس کی طرف سے قیمتی تحفے لے کر آیا تھا۔ اس کے علاوہ خان رئیس کے بیٹے شہزادہ بختور کے لیے شہزادی ہاشم بیگم کا رشتہ بھی مانگا تھا۔ حاکم گوپس نے فوری طور پر اس رشتے سے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس زمانے میں چترال ایک بڑی ریاست تھی۔ خان رئیس کا اس پورے کوہستانی علاقے میں بڑا دبدبہ تھا۔ دور دور تک اس کی طاقت اور خوش حالی کا رُعب چھایا ہوا تھا۔ حاکم گوپس نے اپنے قریبی عزیزوں اور ملکہ سے مشورہ کیا۔ پھر شہزادی ہاشم بیگم سے بھی پوچھا۔ شہزادی نے شروع میں بہت انکار کیا۔ لیکن ماں باپ اور دیگر بزرگوں کا اصرار دیکھ کر خاموش ہوگئی۔ اور نیم رضامندی سے سر جُھکا کر اپنا عندیہ دیدیا۔ حاکم گوپس نے اگلے چاند کی دس تاریخ مقرر کی کہ اس روز چترال سے برات گوپس پہنچے گی۔ اور تیرھویں چاند کی رات دُلہن کی رخصتی ہوگی۔

حاکم چترال خان رئیس کا وفد خوشی خوشی واپس چترال روانہ ہوا۔

شہزادی ہاشم بیگم بڑی ہی شوخ طبع اور شگفتہ مزاج تھی۔ اس کا زیادہ وقت سہیلیوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور شرارتوں میں گزرتا۔ لیکن جب سے اس کا رشتہ طے ہوا تھا اس کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ مزاج کی شوخی اور تیزی بالکل غائب ہوگئی تھی۔ ایک طرح کی سنجیدگی اور متانت زندگی میں شامل ہوگئی تھی۔

دوسری طرف حاکم گوپس بیٹی کی رخصتی کے سلسلے میں زبردست تیاری کررہا تھا۔ جوں جوں چاند کی دس تاریخ قریب آرہی تھی تیاریاں بھی مزید زور وشور سے ہونے لگی تھیں۔ پھر وہ دن بھی آیا۔ شہزادہ چترال کی برات گوپس پہنچی۔ برات بہت سے گھوڑوں اور خچروں کے قافلے پر مشتمل تھی۔ جس میں شہزادے کے قریبی رشتہ دار مرد وخواتین کے علاوہ چترال کے معززین کی بھی ایک کثیر تعداد تھی۔

حاکم گوپس نے قلعے سے باہر نکل کر مہمانوں کا استقبال کیا۔ خوبصورت لباس پہنے ہوئے مسلح محافظوں کے ایک دستے نے مہمانوں کو سلامی دی۔ زرق برق لباس میں ملبوس ایک دستہ ڈھول بجاتے ناچتے ہوئے قافلے کے آگے آگے چلنے لگا۔ چھوٹی عمر کے لڑکے لڑکیاں، درختوں اور چھتوں پر سے مہمانوں پر گُل پاشی کرنے لگے۔

گوپس کے لوگ بڑی بے تابی سے قافلے کے ایک ایک فرد کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی بے چین نظریں شہزادہ چترال کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ہاشم بیگم جیسی خوبصورت اور نازک شہزادی کا جو جیون ساتھی بننے والا ہے وہ اس کے معیار کا ہے کہ نہیں۔ لیکن گوپس والوں کی بے قراری برقرار رہی۔ وہ شہزادہ چترال کو نہیں پہچان سکے۔ چوں کہ قافلہ کئی دن کی مسافت طے کر کے آیا تھا اور سارے براتی دُھول مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ شہزادہ چترال نے دُلہے کا مخصوص لباس بھی اتار لیا تھا اس لیے کوئی بھی اسے شناخت نہیں کر سکا۔

مہمانوں کو بڑی عزت کے ساتھ قلعے میں لے جایا گیا۔ سب سے پہلے سارے براتیوں کے لیے نہانے دھونے کا انتظام کیا گیا۔ پھر بڑے سے کمرے میں شہزادہ چترال بختور کی رونمائی ہوئی۔ شہزادہ بختور کو ایک اونچی نشست پر بٹھایا گیا اور گوپس کے لوگ قطار کی شکل میں آتے اسے سلامی دیتے اور تحفے اس کی نذر کرتے ہوئے دوسری طرف چلے جاتے۔ وہ سب پہلی دفعہ شہزادے کو دیکھ رہے تھے اور شہزادی ہاشم بیگم کی قسمت پہ رشک کر رہے تھے۔ شہزادہ بختور کا باوقار اور خوب رو چہرہ سب کو متاثر کر رہا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں، کشادہ پیشانی اور مضبوط جسم کے ساتھ ایسا جاذب نظر دکھائی دیتا تھا کہ جس کی نظر اس پہ پڑتی بے اختیار تعریف کرنے لگتا۔ شہزادہ بختور کو دیکھنے سے پہلے ان کے دلوں میں مختلف شکوک اور وسوسے پیدا ہونے لگے تھے اب جو شہزادے کو دیکھا تو سارے اندیشے اور وسوسے دم توڑ گئے۔

…… ………… ……

زنان خانے کے ایک کمرے میں ہاشم بیگم کو اس کی سہیلیاں گھیرے میں لیے بیٹھی تھیں۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اس کا دِل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی زندگی کا ساتھی قلعے میں پہنچ گیا تھا۔ اور چند ہی دن میں وہ اس کے ساتھ اجنبی منزل کی جانب روانہ ہونے والی تھی۔ اس کی ساری سہیلیاں بڑی بے تابی سے دروازے کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے کسی نے بھی شہزادہ بختور کو نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت صحیفہ شہزادے کو دیکھنے گئی تھی اور ساری لڑکیاں بے تابی سے اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد صحیفہ کمرے میں داخل ہوئی وہ بڑی ہی پُر جوش اور خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سب لڑکیاں اس کے گرد اکٹھی ہوئیں اور شہزادہ چترال کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

صحیفہ خوشی سے بھری لرزتی آواز میں بولی۔ "ہماری ہاشی لاکھوں میں سے ایک ہے تو شہزادہ چترال بھی کسی سے کم نہیں۔ ایسا باوقار اور خوبصورت چہرہ میں نے کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔"

ہاشم بیگم شرم سے گُل گوں چہرے کے ساتھ سر جھکائے یہ سب سن رہی تھی۔ اس کا دِل اور بھی زور

زور سے دھڑ کنے لگا۔ صحیفہ اس کی محرم راز تھی۔ اس کے ذوق اور پسند سے واقف تھی۔ وہ تعریف کر رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا شہزادہ چترال اس کے معیار کے مطابق تھا۔ کچھ دیر پہلے تک اس کا دِل نا معلوم اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ صحیفہ کی زبانی یہ سن کر اس نے اطمینان اور سکون سے آنکھیں موند لیں۔

…… ………… ……

چاند کی تیرہ تاریخ کو شہزادی ہاشم بیگم کی رخصتی طے تھی۔ شہزادہ چترال کی برات دس تاریخ کو پہنچی تھی۔ اسی رات حاکم گوپس نے نکاح پڑھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ لیکن چترال والوں نے ایک عذر پیش کیا۔ براتیوں کے قافلے کا سردار کرم رئیس تھا۔ وہ حاکم چترال کا وزیر تھا۔ اس نے راجہ گوپس سے کہا کہ چترال کے دستور کے مطابق نکاح دُلہا کے گھر میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس لیے گوپس میں نکاح کی رسم ادا کرنے کا فیصلہ واپس لیا جائے۔ یہ بات گوپس والوں کو پسند نہ آئی۔ شہزادی کے قریبی بزرگوں نے بھی اعتراض کیا۔ لیکن راجہ گوپس نے مہمانوں کو ناراض کرنا مناسب نہیں جانا۔ اس نے فیصلہ سنایا کہ نکاح کی رسم چترال کے دستور کے مطابق ہی ادا کی جائے گی۔

…… ………… ……

شہزادہ چترال نے ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس کا خوبصورت اور باوقار چہرہ، میٹھی میٹھی باتیں، اور مزاج کی باوقار سنجیدگی سے ہر کوئی متاثر ہوا تھا۔ سب کی زبان پہ شہزادے کا ذکر تھا۔ ہاشم بیگم نے بھی صحیفہ اور دوسری سہیلیوں کی زبانی شہزادے کا ذکر اتنا سنا تھا کہ اسے بھی شہزادہ چترال کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ اس نے صحیفہ سے اپنی خواہش کا ذکر کیا۔ صحیفہ نے وعدہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح اسے شہزادے کا دیدار کرائے گی۔ شام کے وقت شہزادی اپنے کمرے میں تھی کہ صحیفہ داخل ہوئی۔

"ہاشی! اُٹھو، تجھے تیرا شہزادہ دکھاتی ہوں۔"

ہاشم بیگم کا دِل زور زور سے دھڑ کنے لگا۔ شہزادے کو دیکھنے کی آرزو بھی تھی، لیکن خوف اور شرم کے جذبات بھی دِل میں تھے۔ وہ اِک ذرا ہچکچائی۔ صحیفہ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر ہنستی ہوئی بولی۔ "ارے ہاشی پیاری! ڈرتی کیوں ہو؟ شہزادہ تجھے کھا نہیں جائے گا۔ ویسے بھی وہ تجھے نہیں دیکھ سکے گا۔ ہم دور سے ہی اسے دیکھیں گے۔"

ہاشم بیگم دھڑ کتے دِل کے ساتھ صحیفہ کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر آئی۔ صحیفہ اسے قلعے کی چھت پہ لے آئی۔ چھت پہ آ کے ہاشم بیگم نے دیکھا۔ باغ میں راجہ گوپس کے ساتھ ایک جوان بیٹھا تھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ بالکل واضح نظر آ رہا تھا۔ اس پہ نظر پڑتے ہی ہاشم بیگم کی نگاہوں کے سامنے خوش رنگ پھول کھل

اٹھے۔ تعریف سن سن کے اس نے چپکے سے دِل میں ایک شبیہہ بنا رکھی تھی لیکن وہ جوان اس کی بنائی ہوئی ہر شبیہہ سے زیادہ خوبرو اور باوقار تھا۔ اس کا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا اور دھڑکنوں کی تال پہ گویا رقص کرنے لگا۔ اس نے مسرت اور طمانیت سے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔ صحیفہ اس کی حالت دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی اور آہستہ سے بولی۔ ''کیوں ہاشی کیسا لگا؟ کیا اپنی زندگی کا ساتھی پسند آیا؟''

ہاشم بیگم کچھ نہ بولی۔ شرم سے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر مسکرانے لگی۔

……

چاند کی تیرھویں تاریخ کو ہاشم بیگم کی رخصتی ہوئی۔ وہ اپنے عزیزوں سے، اپنی سہیلیوں سے، اپنے علاقے سے جُدا ہو رہی تھی۔ ان سب سے جُدا ہونے کا دُکھ بھی تھا۔ ساتھ ہی ایک مسرت آگیں سرور چھایا ہوا تھا۔ وہ ایک اجنبی دیس میں، ایک اجنبی کی بن کے جا رہی تھی۔ ایک ایسا اجنبی، جس پہ پڑنے والی پہلی ہی نظر نے، اسے اپنا بنا لیا تھا اور اپنائیت کا یہ میٹھا میٹھا احساس، ہر دُکھ اور اندیشے پہ غالب آ چکا تھا۔

ہاشم بیگم صرف اپنے ماں باپ کی لاڈلی بیٹی نہیں تھی بلکہ وادیِ گوپس کے تمام لوگ اس پہ جان چھڑکتے تھے۔ اس کی جُدائی سے ملول بھی تھے ساتھ ہی خوش بھی تھے۔ شہزادہ بختور کی وجاہت اور وقار نے سب کے دلوں کو موہ لیا تھا اور اس وقت اپنی محبوب شہزادی کو رخصت کرنے کے لیے گوپس کے تمام لوگ قلعے کے باہر جمع تھے۔ سب کی نظریں محل کے بیرونی دروازے پہ لگی ہوئی تھیں۔ کسی بھی وقت شہزادی کی برات اندر سے نکلنے والی تھی۔

لوگوں کی بے تاب نگاہیں قلعے کی دیواروں پہ اور دروازوں پہ بھٹک رہی تھیں۔ پھر قلعے کا پھاٹک کُھلا اور سواروں کا ایک دستہ باہر نکلا۔ اس دستے میں حاکم گوپس کے امراء اور معززین تھے۔ ان کے پیچھے شہزادہ چترال اور امراء و مصاحبین کا دستہ نمودار ہوا۔ پھر سب سے آخر میں بہت سی خواتین کے جلو میں شہزادی ہاشم بیگم کی سواری نمودار ہوئی۔ چترال سے آئی ہوئی خواتین اپنے مخصوص لباس میں شہزادی کے آگے آگے گھوڑوں پہ سوار تھیں۔ ان کے پیچھے گوپس کی خواتین اپنے روایتی کپڑوں میں ملبوس، شہزادی کے ساتھ ساتھ قلعے سے باہر نکل رہی تھیں۔ شہزادی اور اس کی ساتھی خواتین کے گھوڑے بہت خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ خاص کر شہزادی کا گھوڑا اپنی خوبصورتی اور سجاوٹ کی وجہ سے دور سے ہی پہچانا جاتا تھا۔ شہزادی کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ ایک بڑی عمر کے مرد کا گھوڑا تھا۔ وہ شہزادی ہاشم بیگم کا شیر تت (رضاعی باپ) سینگ تھا۔ قلعے سے باہر جمع لوگوں نے جوں ہی شہزادی کو دیکھا تو وہ خوشی سے چیخنے چلانے لگے۔ ڈھول اور بانسری کی لے پہ ناچنے لگے۔ راستے کے دونوں طرف موجود مرد، عورتیں اور بچے شہزادی اور شہزادے پہ پھول نچھاور کر رہے تھے۔

قلعے سے ایک کوس کے فاصلے پر برات رُک گئی۔ حاکم گوپس، امراء اور عام لوگ شہزادی اور باقی قافلے کو الوداع کہہ کر واپس لوٹ آئے۔ اور شہزادے کی برات چترال کی طرف روانہ ہوئی۔

ان کا سفر بڑا طویل تھا۔ آٹھ دس دنوں میں چترال پہنچا جا سکتا تھا۔ لیکن براتیوں کو آرام اور سکون پہنچانے کے لیے جگہ جگہ قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ دو انسانوں کے ملاپ کا یہ حسین سفر آہستہ آہستہ منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ سفر بہت ہی کٹھن تھا۔ گوپس سے چترال تک راستہ، پہاڑوں اور ویرانوں سے گزرتا تھا۔ نیچے گہرائی میں تیزی سے بہتا ہوا دریا، وہ راستہ کبھی اس کے ساتھ ساتھ کبھی اس سے بلند پہاڑوں کے اندر سے ہوتا وادی چترال کی طرف جاتا تھا۔ درمیان میں کہیں کہیں چھوٹی موٹی آبادیاں تھیں۔ زیادہ تر علاقہ پہاڑی تھا۔

شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ دن کا اُجالا بڑی خاموشی سے میلا ہوتا جا رہا تھا۔ کسی بھی وقت تاریکی پھیلنے والی تھی۔ اس وقت یہ باراتی قافلہ ایک ہموار اور سرسبز جگہ سے گزر رہا تھا۔ قافلے کے سردار کرم رئیس کے حکم سے برات رُک گئی۔ سارے قافلے میں یہ اعلان کروایا گیا کہ رات اسی جگہ بسر کی جائے گی۔ خدمت گار فوراً ہی خیمے نصب کرنے لگے۔ ایک جگہ طعام کا بندوبست کیا جانے لگا۔ بڑے بڑے دیگچوں میں ہرن کا، بکری کا اور پہاڑی پرندوں کا گوشت پکنے لگا۔ ساتھ ہی بہت سی خادمائیں بڑے بڑے توؤں پر روٹیاں پکانے لگیں۔ شہزادی ہاشم بیگم کے لیے ایک خوبصورت اور وسیع و عریض خیمے میں رات گزارنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ سہیلیاں بھی تھیں۔ سب تھکی ہاری تھیں۔ کھانا کھا کے سب پہ غنودگی چھانے لگی۔ شہزادی کی سہیلیاں آہستہ آہستہ سو گئیں۔ ہاشم بیگم بھی تھکی ہوئی تھی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے ساتھ صحیفہ بھی جاگ رہی تھی۔ دونوں دھیمی دھیمی آواز میں آئندہ کے حالات اور اجنبی دیس کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد صحیفہ بھی سو گئی۔ ہاشم بیگم تنہا ہی اپنی سوچوں میں گُم آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ بڑی کوشش کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کے وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ خیمے کے دروازے پہ آ کے باہر دیکھنے لگی۔ دور دور تک خیمے نظر آ رہے تھے۔ کہیں کہیں مشعلیں روشن تھیں جن کی ہلکی ہلکی روشنی میں پہریدار اِدھر سے اُدھر چلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف ایک پُراسرار سکوت چھایا ہوا تھا۔ سب قافلے والے سوئے ہوئے تھے۔ شہزادی کے خیمے کے سامنے ہی کچھ فاصلے پر شہزادہ بختور کا خیمہ نصب تھا۔ اس خیمے میں روشنی تھی۔ اس کا مطلب تھا شہزادہ چترال ابھی سویا نہیں تھا۔ ہاشم بیگم کی آنکھوں کے سامنے دھنک رنگ سے پھیل گئے۔ تصور کی زمین پہ رنگ رنگ کے پھول کھلنے لگے اور ہر پھول کی پتی پہ وہی بے حد خوب رو جوان دکھائی دینے لگا۔ اس پر بے خودی سی چھا گئی۔ نظریں خیمے پر لگی تھیں مگر خیال اسے دلکش باغوں کی سیر کرا رہا تھا۔ یکا یک وہ چونک پڑی۔ دِل بڑے زور سے دھڑکنے لگا۔ شہزادہ چترال کے خیمے کا پردہ ایک طرف

سرک گیا تھا اور اس کا چاند چہرہ طلوع ہو رہا تھا۔ مشعلوں کی ہلکی ہلکی روشنی میں دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو دونوں ساکت رہ گئے۔ بس نظریں ایک دوسرے میں جذب ہو گئی تھیں۔ پھر ہاشم بیگم جیسے بیدار ہوئی۔ ایک دم پلٹ کر خیمے میں آ کر پر دہ گرایا اور آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ دِل یوں دھک دھک کر رہا تھا جیسے سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ ذرا دیر بعد اس نے پردے کی ایک جھری سے دیکھا شہزادہ ابھی تک اپنے خیمے کے دروازے کے پاس کھڑا اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ حرکت کرنا بھول گیا ہو۔ ہاشم بیگم اسے دیکھتی رہی۔ یوں چھپ کر دیکھنے سے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ شہزادہ بھی اسے دیکھ رہا ہو۔ اس لیے وہ نظروں کو آئینہ بنائے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بڑی دیر بعد شہزادے نے ایک گہری سانس لی اور اپنے خیمے کے اندر چلا گیا۔ پھر خیمے کی روشنی بھی گُل ہو گئی۔ ادھر شہزادی کی آنکھیں بھی ویران ہو گئیں۔ وہ بھی پلٹ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی اور میٹھی میٹھی سوچوں سے لپٹ کر سو گئی۔

ان سے ذرا فاصلے پر قافلے کے سردار کرم رئیس کا خیمہ تھا۔ کرم رئیس حاکم چترال خان رئیس کا وزیر تھا۔ لیکن حاکم چترال کی نسبت ملکہ رئیس کا زیادہ وفادار اور معتمد تھا۔ کئی ایک محلاتی معاملات میں اس نے خان رئیس کے بجائے ملکہ رئیس کی طرف داری کی تھی۔ اس وقت وہ اپنے خیمے میں جاگ رہا تھا۔ اس کے سامنے چار افراد بھی ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ کرم رئیس انھیں کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ یہ چاروں افراد اسی وقت کرم رئیس کا ایک اہم پیغام لے کر چترال روانہ ہونے والے تھے۔ ان کے لیے تیز رفتار گھوڑے بالکل تیار حالت میں موجود تھے۔ کرم رئیس نے زبانی تو یہ ہدایت کی کہ حاکم چترال کو ان کی آمد کی اطلاع دی جائے پھر اس نے ایک کاغذ پہ ملکہ رئیس کے نام اہم خفیہ پیغام لکھا۔ جس میں اس نے تحریر کیا تھا..... "ملکہ رئیس آداب! آپ کے حکم اور خواہش کے مطابق ہی سارے معاملات طے ہوئے ہیں۔ شہزادی ہاشم بیگم چند دن بعد آپ کے بیٹے کی شریکِ حیات بننے والی ہیں۔ اگلے چاند کی ابتدائی تاریخوں میں ہم چترال پہنچ جائیں گے۔ یہاں حالات سازگار ہیں اور منصوبے کے مطابق ہی ہمارا سفر جاری ہے۔ آپ وہاں کے معاملات پہ توجہ دیں۔ خان رئیس کو اس سارے کھیل کا علم نہیں ہونا چاہیے ورنہ بہت مشکلات پیدا ہوں گی۔"

کرم رئیس نے یہ تحریر ان میں سے ایک شخص کے حوالے کی۔ ایک دو مزید ہدایات دے کر انھیں رخصت کیا۔ وہ چاروں افراد خیمے سے باہر نکلے اور پہلے سے تیار کیے ہوئے تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر، رات کی تاریکی میں گھوڑے دوڑاتے ہوئے وادی چترال کی طرف روانہ ہو گئے۔

اگلی صبح برات کے قافلے نے پھر سے سفر شروع کیا۔ دشوار گزار اور پہاڑی علاقوں سے گزرتا ہوا رنگ وخوشبو کا یہ سفر جاری رہا۔ قافلہ بہت بڑا تھا۔ سب سے پیچھے چلنے والا آگے والوں کو پہچان نہیں سکتا تھا۔

رواج کے مطابق گوپس والے قافلے کے پیچھے تھے۔ جب کہ شہزادہ چترال اوران کے براتی آگے آگے چل رہے تھے۔ ہاشم بیگم نے کئی بار شہزادے کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ نظر نہیں آیا۔ براتیوں کے ہجوم میں وہ بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

دوپہر کے وقت قافلے نے پڑاؤ ڈالا۔ ایک پہاڑی نالے کے ساتھ درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ زمین پر سرسبز گھاس بچھی ہوئی تھی۔ کھانا پکانے والے ایک طرف دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنے لگے۔ کھانا تیار ہونے تک مرد عورتیں اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ نوجوان لڑکے نالے کے شفاف اور ٹھنڈے پانی میں نہانے لگے۔ عورتیں ٹولیوں کی شکل میں باتوں میں مصروف ہوگئیں۔ ہاشم بیگم بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کافی دور نکل آئیں۔ پھر ایک جگہ نالے کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈال کر ایک دوسرے کو پانی کے چھینٹے مارنے لگیں۔ شہزادی کے احترام کی وجہ سے کوئی مرد اس طرف نہیں آرہا تھا اچانک وہ ٹھٹھک گئی۔ کچھ فاصلے سے شہزادہ چترال اس طرف آتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا چترالی بھی تھا۔ شہزادی شرم سے گُلنار ہوگئی۔ اسے نہ دیکھ کر دل بے قرار رہتا تھا اب اسے دیکھ کر بھی دھڑکنوں کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ شہزادہ قریب آیا۔ جھجکتا ہوا بولا۔ ”شہزادی صاحبہ! مداخلت کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ جگہ آپ کے لیے مناسب نہیں۔ سنا ہے یہاں خطرناک قسم کے سانپ ہوتے ہیں۔ آپ کو اس طرف آتے دیکھ کر مجھے اندیشہ ہوا اس لیے آپ کو مطلع کرنے آیا ہوں۔“

ہاشم بیگم نے پہلے اسے دور دور سے دیکھا تھا اب وہ اتنا قریب تھا تو نظریں بھی جیسے نشے سے ڈولنے لگی تھیں۔ اس کے وجیہہ اور پُر وقار چہرے پر اس کی نگاہیں چپک کر رہ گئی تھیں۔ پھر صحیفہ کی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔ صحیفہ کہہ رہی تھی۔ ”شہزادہ حضور! آپ چلیں ہم آرہے ہیں۔“

شہزادے نے نظر بھر کر اسے دیکھا ذرا سا مسکرایا پھر پلٹ کر پڑاؤ کی جگہ کی طرف چل پڑا۔ ہاشم بیگم اور اس کی سہیلیاں بھی اُٹھیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی خیمے میں آگئیں۔ کھانے کے بعد قافلہ پھر سے چل پڑا۔ چلتے ہوئے شہزادی نے ایک تبدیلی محسوس کی کہ شہزادہ چترال کا سفید بدخشی گھوڑا اس سے ذرا ہی فاصلے پر چل رہا تھا۔ وہ شہزادے کو صاف دیکھ سکتی تھی۔ شہزادہ بھی پلٹ پلٹ کر اسے دیکھتا جارہا تھا۔

سفر بڑا تکلیف دہ تھا مگر شہزادی کو اس کا احساس نہیں ہورہا تھا۔ شہزادہ چترال کی محبت اس کی نس نس میں اُتر چکی تھی۔

……

سات دن بعد یہ قافلہ مستوج پہنچ گیا۔ اب اس کے بعد دو ہی دن کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔ مستوج، چترال سے پہلے بڑا علاقہ تھا۔ مستوج پہنچنے تک ہاشم بیگم اور شہزادے نے آنکھوں ہی آنکھوں بڑی سرگوشیاں کی

تھیں۔ ہاشم بیگم ایک بات سے اُلجھن میں مبتلا تھی۔ اس نے شہزادے کو ہر وقت اداس اداس اور بجھا بجھا دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے دیکھتے وہ ایک دم کہیں کھو جاتا تھا۔ پھر چونک کر چہرہ دوسری طرف کرتا تھا۔ وہ کبھی ہنستے ہوئے نظر نہیں آیا تھا۔ جب بھی دونوں کی نگاہیں ملتیں، اس کی آنکھوں میں بلا کی اداسی ڈیرے ڈالے دکھائی دیتی۔

مستوج پہنچ کر ایک کھلے میدان میں خیمے نصب کیے گئے۔ مقامی لوگوں نے جب برات کے بارے میں سنا تو انھوں نے زبردست خاطر مدارت کی۔ روایتی مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے بیل اور خوش گاؤ ذبح کیے، اور پورے قافلے کی دعوت کی۔ مستوج والوں کی درخواست پر، ہاشم بیگم اور شہزادہ چترال ایک ہی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ مستوج کے لوگ قطار کی شکل بنا کے ان کے سامنے آتے، دونوں کی بلائیں لیتے اور روایتی طور پر تحفے تحائف نذر کر کے فرشی سلام کرتے ہوئے رخصت ہوتے۔ ذرا ہی دیر میں دونوں پھولوں اور تحائف میں چھپ گئے۔ ہاشم بیگم کئی بار کنکھیوں سے شہزادے کی طرف دیکھ چکی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اداس اداس بیٹھا تھا۔ ایک بار دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں ایک دوسرے میں کھو سے گئے پھر شہزادے نے نظریں جھکا کر دھیرے سے کہا۔ ''شہزادی صاحب! یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔ کاش یہ لمحے تھم جائیں اور ہم دونوں یوں ہی ساتھ ساتھ بیٹھے رہیں۔''

ہاشم بیگم کچھ نہ بولی۔ بس لجا کر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ مستوج کے لوگ پھول اور تحفے نچھاور کرتے رہے پھر بڑی دیر بعد ان کی محبت اور عقیدت کا یہ انداز ختم ہوا اور ہاشم بیگم اپنے خیمے میں واپس آئی۔

اگلی صبح قافلہ پھر سے روانہ ہوا۔ وقت، راستے کی مسافتوں کو چاٹتا رہا پھر وہ لمحہ بھی آیا جب چترال کی وادی دور پہاڑوں کے اندر دکھائی دی۔ اسی جگہ قافلے نے پڑاؤ ڈالا۔ رات ہو چکی تھی اس لیے فیصلہ ہوا کہ صبح کے وقت چترال میں داخل ہوا جائے گا۔ مشعلیں روشن ہوئیں۔ ان کی روشنی میں خیمے نصب کیے گئے۔

اس رات ہاشم بیگم شدید بے قرار رہی۔ وہ اجنبی منزل پہ پہنچ چکی تھی۔ اب یہی جگہ آنے والے دنوں میں اس کی خوشیوں اور غموں کا مسکن تھی۔ سفر کے آغاز میں تھوڑا بہت اندیشہ تھا اب وہ دم توڑ چکا تھا۔ سفر کے دوران شہزادے کی مسحور کن شخصیت اور اس کی آنکھوں میں موجود محبت نے اس کے تمام تفکرات کا خاتمہ کیا تھا۔ صحیفہ اور دوسری سہیلیاں سو چکی تھیں۔ ہاشم بیگم جاگ رہی تھی۔ وہ آہستہ سے اُٹھی خیمے کے دروازے کے پاس آ کے باہر دور دور تک دیکھنے لگی۔ خیمے کے باہر ہر سُو سکوت چھایا ہوا تھا۔ مشعلوں کی دھیمی دھیمی روشنی سے آس پاس کا ماحول بڑا ہی پُراسرار لگ رہا تھا۔

ہاشم بیگم کی نظریں بھٹکتی ہوئی شہزادہ چترال کے خیمے کی طرف گئیں۔ اس وقت وہ بھی اندر سے تاریک تھا۔ ہاشم بیگم اس طرف دیکھتے دیکھتے چونک سی پڑی۔ اسے شہزادے کے خیمے میں کسی کے کراہنے کی آواز سنائی

دی تھی ذرا دیر بعد خیمے کا پردہ ایک طرف سرک گیا اور ایک ہیولا باہر نکلا۔ روشنی اتنی دھیمی تھی کہ اس کی شکل واضح نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ہیولا چند ثانیے خیمے کے دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ پھر ہونٹوں سے سیٹی کی آواز نکالی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک طرف سے چند افراد نمودار ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک گھوڑا بھی تھا۔ وہ شہزادے کے خیمے کے پاس رُک گئے۔ اسی دوران خیمے کے اندر سے دو افراد باہر نکلے۔ انھوں نے ایک شخص کو اُٹھا رکھا تھا۔ سب نے مل کر اس بے ہوش شخص کو گھوڑے پر لٹایا پھر ان میں سے ایک فرد اس بے ہوش شخص کے پیچھے بیٹھ گیا اور ایک طرف چل پڑا۔ باقی افراد بھی گھوڑے کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ذرا ہی دیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ہاشم بیگم شدید حیرانی اور پریشانی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ چیخ کر پہریداروں کو خبردار کرے جو کہ کچھ ہی فاصلے پر گشت میں مصروف تھے۔ لیکن حیرت کی بات تھی وہ اس طرف نہیں آ رہے تھے۔ شہزادی کے دماغ میں یہ کپکپاتی ہوئی سوچ بھی اُبھری کہ کہیں شہزادے کے ساتھ تو ایسا نہیں کیا گیا۔ پھر اس نے سر جھٹک کر اس سوچ سے پیچھا چھڑایا۔ شہزادے کے ساتھ ایسا کرنے کی کس میں مجال ہے؟ پہریداروں کے نرغے میں کوئی شہزادے کو گزند پہنچانے کی ہمت کیسے کر سکتا ہے۔

ذرا دیر بعد ہاشم بیگم اپنے خیمے میں واپس آئی۔ اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہوئے سو گئی۔

صبح اُٹھتے ہی سب سے پہلی خواہش یہی تھی کہ شہزادے کو دیکھے۔ وہ خیمے سے باہر آئی۔ قافلے والے جاگ رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کو جگا رہے تھے۔ ہاشم بیگم نے شہزادے کے خیمے کی طرف دیکھا وہاں سکوت چھایا ہوا تھا۔ اس کے دِل میں شدید آرزو جاگی کہ دوڑ کر جائے اور خیمے کے اندر شہزادے کو دیکھے۔ مگر وہ محض سوچ ہی سکی۔ حوصلہ نہ کر سکی۔ اسی دوران سردار قافلہ کرم رئیس اس طرف آیا۔ ہاشم بیگم کے پاس آ کر ادب سے بولا۔ ”شہزادی حضور! آپ تیار ہو کر بیٹھ جائیں۔ شہزادہ چترال کی والدہ ملکہ رئیس اور بہن شہزادی بلقیس کچھ دیر میں یہاں پہنچنے والی ہیں۔ وہ یہیں پہ آپ کا استقبال کر کے قلعے میں لے جائیں گی۔“

ہاشم بیگم کے جی میں آیا کہ رات کے واقعے اور شہزادے کے بارے میں پوچھ لے۔ مگر شرم نے اس کے ہونٹ سی لیے۔ وہ خاموشی سے خیمے کے اندر آئی۔ صحیفہ اور دوسری سہیلیاں جاگ اُٹھی تھیں۔ ہاشم بیگم نے کرم رئیس کی بات انھیں سنائی۔ وہ سب بناؤ سنگھار میں مصروف ہو گئیں۔ بڑی دیر بعد شور بلند ہوا کہ ملکہ رئیس اور شہزادی بلقیس چترال کے معززین کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے آ گئی ہیں۔ شہزادی ہاشم کو اطمینان سا ہوا۔ اس کے شکوک رفع ہو گئے۔ اس نے سوچا اگر خدانخواستہ شہزادے کے ساتھ کوئی ناخوش گوار واقعہ ہوتا تو ملکہ رئیس اور ان کی صاحبزادی استقبال کے لیے نہ آتیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ دونوں ان کے خیمے میں داخل ہو گئیں۔ ہاشم بیگم اور اس کی سہیلیاں ملکہ رئیس کے احترام میں کھڑی ہو گئیں اور جھک کر سلام کیا۔ ملکہ رئیس نے مسکرا کر سلام کا

جواب دیا اور شہزادی کی خوبصورت پیشانی چوم کر اسے دُعائیں دیں۔ پھر شہزادی بلقیس آ کر اس سے گلے ملی۔ ہاشم بیگم کا حسن ایسا دل فریب تھا کہ ملکہ چترال اور شہزادی کا شاہانہ دبدبہ بھی بے اثر ہو گیا تھا۔

ذرا دیر بعد کرم رئیس نے خیمے کے دروازے پہ آ کے ادب سے پوچھا۔ ''ملکہ رئیس کی اگر اجازت ہو تو قافلے کے کوچ کا اعلان کیا جائے۔'' ملکہ نے اجازت دے دی۔ کچھ ہی دیر میں قافلہ منزل کی طرف آخری مسافت طے کرنے لگا۔ شہزادی اپنے مخصوص گھوڑے پر بیٹھی بڑی بے تابی سے اس سفید بدخشی گھوڑے کو ڈھونڈ رہی تھی جس پر اس کا شہزادہ سوار تھا۔ لیکن بڑی کوشش کے بعد بھی وہ بدخشی گھوڑا نظر نہ آیا۔ نہ ہی شہزادہ چترال کہیں نظر آیا۔ وہ پل پل نظریں اُٹھا کر آس پاس، دور دور تک براتیوں کے ہجوم میں شہزادہ بختور کو دیکھنے کی کوشش کرتی۔ مگر ہر اُٹھتی نظر بھٹک بھٹک کے لوٹ آتی۔ اس نے دِل کو سمجھایا۔ ''شاید یہ چترال کا دستور ہو گا کہ دُلہا گھر کے قریب پہنچ کر براتیوں سے الگ ہوتا ہے۔''

یکایک وہ چونک پڑی۔ اس کی نظریں بھٹکتی ہوئی ایک چہرے پر تھم گئی تھیں...... چہرہ جانا پہچانا سا لگتا تھا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔ پھر ایک دم اس کے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے کچھ عرصہ پہلے کا وہ واقعہ یاد آیا جب گوپس کے پہاڑی باغ میں ایک بدصورت چترالی سے سامنا ہوا تھا۔ اور اس نے نہایت گستاخی سے شہزادی کو پریشان کیا تھا۔ اس وقت وہی بدصورت جوان کچھ فاصلے پر ایک خوبصورت کالے رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا۔ اور تیزی سے گھوڑا چلاتے ہوئے آگے گزر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہاشم بیگم کے دِل میں نفرت اور غصے کے جذبات بھر گئے۔ اس نے ٹھان لی کہ یہاں بھی اس نے گستاخی کی تو ترس نہیں کھائے گی۔ شہزادہ بختور سے کہہ کر اسے سخت سزا دلائے گی۔

کچھ دیر بعد براتی قافلہ شاہی قلعے کے قریب پہنچ گیا۔ قلعے کے سامنے ایک کھلے میدان میں بہت بڑی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ قافلہ قریب پہنچ گیا تو سب لوگ خوشی سے ناچنے اور گانے لگے۔ کچھ لوگ سفید کپڑے اور سفید ہی رنگ کی گول اونی ٹوپی پہنے، ڈھول تاشے بجاتے ہوئے آگے آگے چلنے لگے۔ حاکم چترال نے اپنے وزیروں اور امراء کے ساتھ قلعے کے باہر برات کا استقبال کیا۔ اس طرح بڑی ہی شان اور جوش و خروش کے ساتھ برات قلعے میں داخل ہو گئی۔

ہاشم بیگم کو ایک نہایت ہی سجے سجائے کمرے میں بٹھایا گیا۔ وہ آٹھ دس دن کی مسافت طے کر کے آئی تھی۔ تھکاوٹ سے سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ مگر اپنے محبوب شہزادے کی رفاقت کی خوشی ایسی تھی کہ تھکاوٹ کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ بس ایک میٹھا میٹھا خوف تھا۔

چترال کے دستور کے مطابق مختلف رسمیں ادا کی گئیں۔ دن بھر اس بڑے سے کمرے میں عورتوں کا

ہجوم رہا۔ شام کے وقت کہیں اسے تنہائی میسر آئی۔ صحیفہ اس کے ساتھ تھی۔

ہاشم بیگم بولی۔ ”صحیفہ! تجھے یاد ہے۔ نوروز کے لیے ہم پھول چننے پہاڑی باغ میں گئے تھے۔ وہاں ایک انتہائی کریہہ صورت چترالی سے سامنا ہوا تھا۔ آج اسے برات کے ساتھ دیکھا تھا۔ میرا دل سخت گھبرا رہا ہے۔“

صحیفہ دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔ ”تم فکر کیوں کرتی ہو ہاشی! وہ نامراد کوئی گستاخی کرے گا تو شہزادہ چترال اس کی زبان کھینچ لے گا۔“

”میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ اگر اس نے کوئی بدتمیزی کی تو بہت بُری طرح پیش آؤں گی۔“

اسی وقت شہزادی کا شیرتت یعنی رضاعی باپ کمرے میں آیا۔ اور بولا۔ ”ہاشم بیٹی۔ خان رئیس کہہ رہے ہیں کہ رات سے پہلے نکاح کی رسم ادا کی جانی چاہیے۔ آپ اجازت دیں تو ان سے کہہ دوں۔“

ہاشم بیگم نے سر جھکا کر حیا آلود لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے بابا۔ میری طرف سے اجازت ہے۔“

کچھ دیر بعد نکاح پڑھایا گیا۔ اس کے بعد بہت بڑے کھانے اور جشن کا اہتمام گیا۔ نوجوان لڑکیاں اسے گھیرے میں لے کر گیت گانے لگیں۔ باہر سے بھی ڈھول تاشوں کے بجنے اور لوگوں کے خوشی سے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ رات گئے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ پھر اسے ایک ایسے کمرے میں لے جایا گیا جس کی آرائش وزیبائش آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ ایک بڑی سی مسہری پر پھولوں کی سیج سجائی گئی تھی۔ وہ جذبوں کے ہجوم کے ساتھ اس مسہری پر بیٹھ گئی۔ دِل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں مگر ساری توجہ دروازے پر لگی ہوئی تھی۔ ایک ایک لمحہ صدیوں سی رفتار سے گھسٹ رہا تھا۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ خود میں سمٹنے لگی جیسے آنے والا انسان نہ ہو، بدن کے اسرار چرانے والا کوئی بے ایمان ہو۔ اس کی جھکی جھکی آنکھیں صرف آنے والے کی ٹانگیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ ٹانگیں آہستہ آہستہ اس کی طرف آ رہی تھیں پھر وہ مسہری کے پاس آ گئیں۔ ہاشم بیگم نے اضطراری طور پر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک ذرا دیر اسی طرح بیٹھی رہی پھر آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ سامنے مسہری پر بیٹھا تھا۔ جھکی جھکی نظریں چہرے کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔ بے اختیار اس کی نظریں اُٹھیں، پھر اُٹھی کی اُٹھی رہ گئیں۔ جیسے مصور کوئی تصویر بناتا ہے۔ تصویر کی آنکھ جیسے ساکت ہوتی ہے۔ وہ بھی جیسے تصویر بن گئی تھی بس اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ اور دِل کے اندر ایسا بھونچال بپا ہوا تھا کہ کتنے ہی لاوے وجود کے پہاڑ سے باہر اُبل پڑے تھے۔ آنکھیں دیکھ رہی تھیں مگر ہر نظر گویا کانٹوں میں اُلجھ رہی تھی اور ان کی شدید چبھن سے دِل پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا، خوابوں کی نہایت کریہہ تعبیر تھی۔ پہاڑی باغ میں ملنے والا بدصورت شکاری اس وقت نظروں کے سامنے تھا اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے

اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ بڑی دیر بعد وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”تت...... تمھیں یاد ہو شاید، بب...... بہت پہلے میں نے کہا تھا کہ ابھی جج...... جا رہا ہوں، مگر پھر آؤں گا۔ یا پھر تجھے لے جاؤں گا۔ دو...... دیکھو میری یہ بب...... بات درست ہوئی۔ آج تت...... تم میرے پاس ہو۔“

ہاشم بیگم زندہ ہوتے ہوئے بھی بے جان ہو گئی تھی۔ زبان بولنے کی سکت سے محروم ہو گئی تھی۔ صدمے اور حیرانی سے وہ گُنگ سی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ بولا۔ ”تت...... تمھیں حیرانی ہو گی کہ دد...... دُلہا کیسے بدل گیا؟ اصل میں یہ ایک فف...... فریب تھا۔ اتنے دنوں تک جس نے دُلہا بننے کا نن...... ناٹک کیا تھا وہ میری دد...... دائی کا بیٹا تھا۔ آہ! اپنے اپنے نن...... نصیب کی بات ہے میں شہزادہ ہوں۔ لل...... لیکن بدشکل ہوں۔ وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی انتہائی خخ...... خوش شکل ہے۔ مم...... میں نے اس کی خوبصورتی خریدی۔ ملکہ رئیس اور کک...... کرم رئیس کے ساتھ مل کر سازش تیار کی۔ خان رئیس کو مم...... مکمل اندھیرے میں رکھ کر اپنی جگہ دائی کے بب...... بیٹے کو دُلہا بنا کر گگ...... گوپس بھیج دیا۔ مم...... میں خود چھپا رہا گزشتہ رات قافلے سے مل گیا۔ مم...... منصوبہ یہ تھا کہ آخری پڑاؤ سے دائی کا بب...... بیٹا کہیں غائب ہو جائے گا۔ لل...... لیکن وہ بھی تم پر عاشق ہو گیا تھا۔ اس نے منصوبے پر عمل کرنے سے انکار کیا اور راز فاش کرنے کی دھمکی دینے لگا۔ اس بدذات کی یہ بات ایسی ناقابلِ برداشت تھی کہ ایک دم میں بے قابو ہو گیا۔ خیمے کے اندر ہی اسے اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ پھر اپنے مم...... محافظوں کے ذریعے اسے قید خانے میں ڈلوا دیا۔ اس کے ساتھ بعد میں نپٹ لوں گا اور اب مم...... میں تمہارا دُلہا ہوں۔“

اصل شہزادہ بختور، لکنت زدہ آواز میں یہ سب کہہ کر بڑے ہی بھونڈے طریقے سے ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ”دیکھو تو ہاشم بیگم! میں بھی کیسا بب...... بیوقوف ہوں۔ یہ رات ایسی باتوں کے لیے تو نہیں ہوتی۔ لل...... لیکن کیا کروں۔ جس طرح میں خوبصورت نہیں ہوں اسی طرح مم...... میری بب...... باتیں بھی نہیں ہیں۔ اس لیے مم...... میں کوئی خوب صورت گفتگو نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی جج...... جذبے کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ یوں سس...... سر چڑھ کر بب...... بولتے ہیں کہ دوسروں کی بب...... بولتی بب...... بند ہو جاتی ہے۔“

ہاشم بیگم اس کی طویل گفتگو تک خود کو سنبھال چکی تھی۔ ایسے زبردست فریب پر غم و غصے سے پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ جی چاہتا تھا اسے ناخنوں سے نوچ کھسوٹ کر مار ڈالے۔ مگر اس سوچ پر عمل کرنے کی جرأت اس میں نہیں تھی۔ بجلی جو گرنی تھی، گری تھی اور آرزوؤں کے آشیانے کو جلا کر بھسم کر چکی تھی۔ اب صرف وجود کا خرمن باقی تھا جسے بجلیوں کی قہر سامانی سے بچانا تھا۔ وہ ذہین تھی۔ جب تک شہزادہ بختور نے اپنی گفتگو ختم کی

ہاشم بیگم نے خود کو اس کے پاگل پن سے محفوظ رکھنے کا طریقہ سوچ لیا تھا۔

وہ بولی۔ ”بے شک، آپ مجھے پسند نہیں تھے اور اس فریب سے بھی مجھے سخت ٹھیس پہنچی ہے۔ لیکن میں سب کچھ بھلا دوں گی۔ کیوں کہ اب آپ میرے مجازی خُدا ہیں۔ آپ کے حکم پر سر جھکانا میرا فرض ہے۔ مگر مجھے تین دن کی مہلت دیں۔ میں ایک خاص قسم کا چلہ کاٹ رہی ہوں۔ اس کے ختم ہونے تک کسی مرد کے قریب جانے کی اجازت نہیں۔“

شہزادہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”تت..... تم نے مجھے قبول کیا۔ یہی مم..... میرے لیے بہت بڑا انعام ہے۔ تم سکون سے تین دن رات گزارو۔ مم..... میں دوسری مسہری پر سو جاؤں گا۔“

شہزادی نے طمانیت سے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔ کم از کم تین دنوں تک اس وحشی کے دست برد سے محفوظ ہو گئی تھی۔ اس رات کی صبح ہوئی۔ مگر ہاشم بیگم کی زندگی میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ آرزوؤں کا شیش محل اس طرح چکنا چور ہو گیا تھا کہ ہر ہر کرچی میں حسرتوں کی لاش دکھائی دیتی تھی۔ وہ پہلی رات کنواریوں کی زندگی میں انمٹ نقوش چھوڑ دیتی ہے۔ ہاشم بیگم کے بھی خواب تھے مگر اس رات سب کچھ برباد ہو گیا تھا۔ شہزادی نے وہ رات خاموشی سے آنسو بہاتے ہوئے گزار دی۔

اسی طرح دو راتیں گزر گئیں۔ شہزادہ بختور بڑی شرافت سے دوسری مسہری پر سوتا رہا اور شہزادی اپنی تمناؤں کی موت پر روتی رہی۔

اگلی صبح وہ خواب گاہ میں بڑی ہی اداس اور فکر مند بیٹھی تھی۔ صحیفہ اسے دلاسہ دیتی ہوئی بولی۔ ”ہاشی! تم کسی نہ کسی طرح چند دن مزید شہزادے کو اپنے سے دور رکھو۔ میں نے شیر تت سینگ (شہزادی کا رضاعی باپ) سے بات کی ہے۔ وہ سخت غصے میں ہے۔ وہ واپس گوپس جا کر راجہ صاحب کو اس فریب سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حاکم گوپس کے دباؤ کی وجہ سے شہزادہ تجھے چھوڑ دے گا۔“

ہاشم بیگم نے ایک گہری سانس لی پھر بڑے ہی دُکھ سے بولی۔ ”ایسا ممکن نہیں ہے صحیفہ! میرے ابا حضور کے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ چترال جیسی بڑی ریاست کے حاکم سے ٹکر لے۔ اب تو میرے نصیب میں یہی اندھیرا ہے۔ اس فریب کے ساتھ ایک دُکھ یہ بھی ہے کہ وہ مانوس اجنبی کہاں چلا گیا؟ بے شک وہ جعلی دُلہا تھا مگر میں جی جان سے اس کی ہو چکی ہوں۔ آہ! وہ پرایا ہی سہی۔ بس دکھائی دے۔ معلوم نہیں اس وقت وہ کہاں ہے۔“

”میں جانتی ہوں شہزادی حضور کہ وہ جوان کدھر ہے۔“ صفورہ نام کی ایک کنیز خواب گاہ میں داخل ہوتی ہوئی بولی۔ یہ کنیز پہلے بھی کئی بار ان کے کمرے میں آئی تھی اور ہر بار کچھ کہنے کے لیے لب کھولتی تھی۔ پھر خاموش ہو جاتی۔

ہاشم بیگم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر بہت ہی بے تابی سے بولی۔ ’’تم کیسے جانتی ہو؟ وہ زندہ ہیں نا؟ اس وقت کہاں ہیں؟‘‘

کنیز صفورہ دھیرے سے مسکرا کر بولی۔ ’’حوصلہ رکھیں شہزادی حضور! وہ سلامت ہیں۔‘‘ پھر وہ کنیز وضاحت کرتی ہوئی بولی۔ ’’اس کا نام شمائل خان ہے۔ میں اس کی بہن ہوں۔ شہزادے کی دائی ہماری ماں ہے۔ جب شہزادہ بختور نے خان رئیس اور ملکہ رئیس کو مجبور کیا کہ آپ کا رشتہ مانگا جائے تو خان رئیس نے انکار کیا۔ کیوں کہ شہزادے کی بدصورتی کی وجہ سے کسی ریاست کی شہزادی اسے قبول نہیں کرسکتی تھی۔ پھر شہزادے نے ملکہ رئیس اور کرم رئیس سے مل کر سازش تیار کی اور میرے خوبصورت بھائی کو اپنی جگہ دُلہا بنا کر گویں بھجوایا۔ برات کے ساتھ بھی ایسے ہی لوگ بھجوائے گئے جو شہزادے کے محرم راز تھے۔ مختصر یہ کہ وہ آپ کو بیاہ کر لے آئے۔ میرے بھائی آپ کو دیکھ کر ہی فدا ہوئے تھے اس لیے خواہش ظاہر کی کہ آخری بار آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس سے شہزادہ بختور مشتعل ہوگیا اور میرے بھائی کو بے ہوش کرا کے قید خانے میں ڈال دیا۔ وقتی طور پہ وہ محفوظ ہے مگر اس کی جان کو شدید خطرہ ہے۔‘‘

’’صفورہ! تجھے علم نہیں ہے کیا۔ ان کو کہاں رکھا گیا ہے؟‘‘ شہزادی نے بےتابی سے پوچھا۔

صفورہ بولی۔ ’’مجھے علم نہیں ہے۔ مگر میں نے بات کی ہے۔ کرم رئیس کا ایک خاص بندہ مجھ پہ عاشق ہے۔ میں نے بھی صحیح صورت حال معلوم کرنے کے لیے آج کل اسے ڈھیل دے رکھی ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے شام تک میرے بھائی شمائل خان کا پتا ٹھکانہ معلوم کر کے مجھے بتائے گا۔‘‘

ہاشم بیگم نے کہا۔ ’’صفورہ! یہ تمہارا احسان ہوگا کہ مجھے بھی مطلع کرو۔‘‘

’’آپ بے فکر رہیں شہزادی صاحبہ۔ میں صرف بتاؤں گی نہیں آپ دونوں کو آزاد کرانے کی بھی کوشش کروں گی۔‘‘

صفورہ خواب گاہ سے باہر چلی گئی۔ شام کے وقت وہ پھر شہزادی کے پاس آئی۔ اس وقت ہاشم بیگم تنہا ہی تھی۔

صفورہ نے بتایا کہ اسے کامیابی ہوئی ہے۔ کرم رئیس کے خاص آدمی کے مطابق شمائل خان شاہی اصطبل کی ایک کوٹھری میں بند تھا۔ شہزادہ بختور نے فیصلہ کیا تھا کہ ہنگامہ ختم ہوتے ہی اسے مار ڈالے گا تاکہ آئندہ وہ کسی خطرے کا باعث نہ بن سکے۔

ہاشم بیگم پُرعزم لہجے میں بولی۔ ’’صفورہ! تمہارا بھائی نہیں مرے گا۔ میں اسے قید سے چھڑا لوں گی۔‘‘ ہاشم بیگم اور صفورہ سر جوڑ کر بیٹھ گئیں اور یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرنے لگیں۔ بڑی دیر بعد انھوں نے

حکمت عملی تیار کی۔ ہاشم بیگم نے صفورہ کو چند ایک ہدایات دیں پھر صفورہ چلی گئی۔

وہ آخری رات تھی۔ ہاشم بیگم نیم روشن کمرے میں مسہری پر لیٹی ہوئی آنے والے حالات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شہزادہ بختور دوسری مسہری پر سویا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سویا ہوا ہے یا جاگ رہا ہے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ قلعے میں سارے لوگ سوئے ہوئے تھے۔ ایسے میں ان کی خواب گاہ کے باہر بلی کی میاؤں میاؤں کی آواز سنائی دی۔ شہزادی چونک سی گئی۔ دھڑکنوں کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ اس کا جسم تن گیا۔ وہ آہستہ سے اُٹھی۔ شہزادے کی طرف ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتی، بڑے احتیاط سے دبے قدموں چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ بہت ہی آہستگی سے دروازے کی چٹخنی گرائی۔ پلٹ کر شہزادے کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ شہزادی ہاشم نے چند ثانیے اس کی طرف دیکھا پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ دروازے کے باہر تاریک راہداری میں ایک سائے نے حرکت کی اور شہزادی کے قریب آ کر سرگوشی نما آواز میں بولی۔ ''شہزادی حضور! میں نے سارا بندوبست کیا ہے۔ چلنے کی تیاری کریں۔'' وہ صفورہ تھی۔

شہزادی ہاشم، صفورہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ قلعے میں ہر طرف خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ دونوں محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی قلعے کے بڑے دروازے تک آئیں۔ بڑے دروازے پر پہریدار ہوتے تھے مگر اس وقت راستہ صاف تھا۔ وہ دونوں بڑی آسانی سے قلعے سے باہر نکل گئیں۔ قلعے سے کچھ دور جا کر صفورہ بولی۔ ''شہزادی حضور! میرا بھائی اصطبل سے نکل گیا ہے۔ اس وقت کچھ دور آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ تیز چلیں۔''

''صفورہ! تم نے بڑا کام کیا ہے۔ میں اس احسان کا بدلہ ساری عمر نہیں چکا سکوں گی۔''

''ایسی بات نہ کریں شہزادی حضور! آپ مظلوم ہیں۔ آپ کی مدد، احسان نہیں ایمان ہے۔ شہزادہ بختور آپ کی جوتی کے بھی اہل نہیں۔ آپ میرے بھائی کے ساتھ بحفاظت نکل جائیں یہی میرے احسان کا بدلہ ہے۔''

ہاشم بیگم بولی۔ ''صفورہ! تم ایک نازک سی لڑکی ہو۔ پھر بھی یہ سب کس طرح کیا؟''

''شہزادی حضور! میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا۔ کرم رئیس کا ایک خاص مصاحب میرا دیوانہ بن گیا ہے۔ یہ سارا کام اس کے ذریعے کروایا ہے۔ اس نے قلعے کے پہریداروں کو بے ہوشی کی دوا پلا کے ہمارے راستے کی رکاوٹیں دور کیں۔ اس کی وجہ سے میرا بھائی بھی اصطبل سے رہا ہو گیا ہے۔''

وہ دونوں تیز تیز چلتی ہوئی اس جگہ پہنچ گئیں جہاں شمائل خان ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے پاس دو اچھی نسل کے گھوڑے بھی موجود تھے۔

انھیں دیکھ کر صفورہ کا بھائی بولا۔ ''شہزادی حضور! ہم دونوں قیدی تھے اس وقت دونوں آزاد ہیں۔

یہ بہت بڑی خوشی کا موقع ہے۔ لیکن یہ وقت خوشی منانے کا نہیں، اپنی جان بچانے کا ہے۔ آپ جلدی سے ایک گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔"

ان دونوں نے صفورہ کو الوداع کہا۔ پھر گھوڑے دوڑاتے ہوئے گوپس کے سمت جانے لگے۔ صفورہ نے ایک گہری سانس لی۔ اس میں افسردگی بھی تھی، اطمینان بھی۔ وہ آنکھیں بند کیے دِل ہی دِل میں ان دونوں کی سلامتی کی دُعائیں مانگنے لگی۔ یکا یک وہ چونک گئی۔ شدید خوف سے ایک طرف دیکھنے لگی۔ تاریک رات میں چند گھڑ سوار تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔ صفورہ کو لگا جیسے خون اس کی رگوں میں جم گیا ہو۔ وہ حرکت کرنا بھی بھول گئی۔ بس ساکت سی دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

……

شہزادہ بختور کی آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی تھی۔ وہ شادی کی تیسری رات تھی۔ جذبات کی تیز آندھی میں وہ اُڑ رہا تھا۔ مگر ایسا وعدہ کر چکا تھا کہ لب دریا بھی خشک ہونٹوں کی پیاس نہیں بجھا سکتا تھا۔ وہ آخری رات تھی۔ اس کے بعد وہ دریا کی متلاطم موجوں سے جذبات کی بھڑکی ہوئی آگ بجھا سکتا تھا۔ اسی وقت آہٹ سی سنائی دی۔ اس نے کنکھیوں سے دیکھا۔ ہاشم بیگم مسہری سے اُٹھ کر دبے قدموں چلتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل رہی تھی۔ شہزادہ حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا۔ مگر ہاشم بیگم واپس نہ آئی۔ تب وہ اُٹھا۔ دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ تاریک راہداری میں خاموشی کا راج تھا۔ وہ حیرانی اور پریشانی سے سوچتا ہوا راہداری میں ایک طرف چلنے لگا۔ راہداری کے اختتام میں کھلا صحن تھا۔ اس نے صحن کے پاس آ کے دیکھا۔ پھر ایک دم چونک پڑا۔ کچھ دور صحن میں دو سائے بڑے دروازے کی طرف جاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اچانک شہزادے کے دماغ میں ایک خیال سا لہرایا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ سایوں کے پیچھے چل پڑا۔ دونوں سائے بڑی آسانی سے قلعے سے باہر نکل گئے۔ قلعے کا دروازہ رات کے وقت بند رہتا تھا مگر اس وقت کھلا تھا۔ یہ معمہ شہزادے کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ پہریداروں کی کوٹھری میں آیا۔ پھر ایک دم ٹھٹھک گیا۔ وہاں سب بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ شہزادہ بختور کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا بڑے دروازے سے باہر نکلا۔ دور دور تک ان سایوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ مگر وہ نظر نہ آئے۔ شہزادے کو پہریداروں کی کوٹھری میں ذرا سی تاخیر ہوئی تھی اور اس عرصے میں دونوں سائے نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ شہزادہ بہت سے اندیشے دِل میں لیے تیزی سے دوڑتا ہوا اپنی خواب گاہ میں آیا۔ اسے جھٹکا سا لگا۔ ہاشم بیگم خواب گاہ میں نہیں تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور قلعے کے طویل اور خاموش دالانوں اور آس پاس کے کمروں میں اسے آوازیں دیتے ہوئے تلاش کرنے لگا۔ اس اثنا میں شور اور آہٹ سے بہت سے دوسرے

لوگ بھی بیدار ہو گئے تھے۔ وہ بھی آوازیں دیتے ہوئے ہاشم بیگم کو ڈھونڈنے لگے۔ ذرا ہی دیر میں سارا قلعہ چھان مارا گیا مگر ہاشم بیگم نہ ملی۔ تب شہزادہ بختور سمجھ گیا کہ قلعے سے باہر جانے والے سایوں میں ایک ہاشم بیگم تھی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے چیخ چیخ کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ فوراً گھوڑوں پہ سوار ہو کر باہر نکلیں۔ فوراً ہی آٹھ دس بہترین گھڑ سوار اس کی قیادت میں قلعے سے باہر نکل گئے۔ شہزادے نے مختلف اطراف میں گھڑ سواروں کو پھیلایا۔ خود بھی دو سپاہیوں کے ساتھ ایک طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے روانہ ہوا۔

....

ہاشم بیگم اور شائل خان گھوڑے دوڑاتے ہوئے دور نکل آئے تھے۔ اس وقت دونوں ایک پہاڑی راستے سے گزر رہے تھے۔ رات تاریک تھی اس لیے بڑی احتیاط سے کم رفتار میں گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ یکایک وہ دونوں چونک پڑے۔ خاموش رات میں انھیں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آسمان پہ چمکتے ہوئے تاروں کی مدھم روشنی میں پیچھے کچھ فاصلے پر چند گھڑ سوار اپنی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ دونوں کو ایسا لگا جیسے خون رگوں میں منجمد ہو گیا ہو۔ شائل خان بولا۔ ”شہزادی حضور! ایسا لگتا ہے ہمارے فرار کا پتا چل گیا ہے۔ آپ ہمت نہ ہاریں۔ ہم ان کے ہاتھ کبھی نہیں آئیں گے۔“

”تم بے فکر رہو میں اتنی کمزور بھی نہیں ہوں۔“ ہاشم بیگم نے کہا۔ ”بس ایک مشکل ہے مجھے راستے کا اندازہ نہیں اس لیے گھوڑا تیزی سے نہیں دوڑا سکتی۔“

پیچھا کرنے والے تیزی سے قریب آتے جا رہے تھے۔ اب وہ چیخ چیخ کر انھیں رُکنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ ہاشم بیگم چوں کہ راستوں سے واقف نہیں تھی اس لیے اس کی رفتار کم تھی۔ جس کی وجہ سے دشمنوں سے فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ شائل خان اپنا گھوڑا شہزادی کے گھوڑے کے قریب لا کر بولا۔ ”شہزادی صاحبہ! دشمن قریب آ رہے ہیں۔ آپ اپنا گھوڑا چھوڑ کر میرے گھوڑے پہ آ جائیں۔“

شہزادی نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ دشمن بہت قریب آ گئے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی۔ دوسرے لمحے اپنے گھوڑے کی بھاگیں چھوڑ کر شائل خان کی کمر کو تھاما اور اس کے گھوڑے پہ چھلانگ لگا کر پیچھے سوار ہو گئی۔ شائل خان بڑی تیزی سے گھوڑا دوڑانے لگا۔ لیکن دشمن بہت ہی قریب پہنچ گئے تھے۔ ہاشم بیگم جب تک دوسرے گھوڑے پہ سوار ہوتی دشمنوں کا فاصلہ مزید کم ہوا تھا۔ پھر دو سواروں کے بوجھ کی وجہ سے بھی گھوڑے کی رفتار کم ہوئی تھی۔ ان کا گھوڑا پتھروں کو پھلانگتا ہوا، تنگ سے پہاڑی راستے پر دوڑا جا رہا تھا۔ راستہ بہت ہی خطرناک تھا۔ ذرا سی لغزش سے گھوڑا ہزاروں فٹ کی گہری کھائی میں گر سکتا تھا۔ تعاقب کرنے والے اب اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ چابک سے انھیں مار سکتے تھے۔ ہاشم بیگم نے بڑی مضبوطی سے شائل خان کی

کمر کو پکڑ رکھا تھا۔ اور چیخ چیخ کر اسے مزید تیز دوڑنے کی ہدایات دے رہی تھی۔

پہاڑی راستوں میں بڑی احتیاط سے چلنا ہوتا ہے۔ ایسی تاریکی ہو تو مزید ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے مگر وہ تو دشمنوں سے بچنے کے لیے ہر فکر اور اندیشے سے بے نیاز ہو کر گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ اسی وقت کسی کے چلانے کی اور گھوڑے کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ ہاشم بیگم نے پلٹ دیکھا۔ تعاقب کرنے والوں کا ایک ساتھی گھوڑے سمیت ہزاروں فٹ گہری کھائی میں گر پڑا تھا۔ شہزادی کے رگ و پے میں بھی خوف سرایت کر گیا۔ اس نے جھرجھری سی لی اور مزید مضبوطی سے اپنے محبوب کو پکڑ لیا۔ پیچھا کرنے والوں میں سے ایک بہت قریب آیا تھا اس نے اپنا چابک لہرایا اور گھوڑے کی پشت پہ دے مارا۔ اس اچانک چوٹ سے گھوڑا بدکا۔ اس کی اگلی دونوں ٹانگیں راستے کے ایک پتھر سے ٹکرائیں۔ گھوڑا تیزی سے دوڑ رہا تھا اس اچانک ٹھوکر سے سنبھل نہ سکا اور قلابازی کھا کر سامنے ایک چٹان سے ٹکرایا۔ گھوڑے نے اس قدر اچانک قلابازی کھائی تھی کہ ہاشم بیگم خود کو سنبھال نہ سکی اور زور سے اُچھل کر، ایک طرف کے بڑے پتھر سے ٹکرائی۔ پھر وہاں سے پھسل پڑی اور لڑھکتی ہوئی، پتھروں سے ٹکراتی ہوئی کھائی کی گہرائی میں جانے لگی۔

وہ بہت نازوں کی پلی تھی۔ زمانے کی سختی کبھی نہیں جھیلی تھی۔ مگر اس وقت پتھروں کی سختی اسے توڑ پھوڑ رہی تھی۔ کبھی اس کے پاؤں میں کانٹا چبھنے سے خون نہیں نکلا تھا۔ مگر اس وقت لڑھکتی ہوئی پتھروں پر خون کے چھینٹے چھوڑتی اپنی محبت کو امر بنا رہی تھی۔

……………………

ہاشم بیگم کی زندگی کی داستان اس گہری اندھی کھائی میں گر کر ختم ہوئی۔ مگر اس کے عشق کی کہانی کبھی ختم نہیں ہو گی۔ اب بھی دستو (چترال اور گوپس کے درمیان ایک چھوٹی وادی) میں ہاشم بیگم کی قبر موجود ہے۔ یہ محض مٹی کا ڈھیر نہیں۔ ایک ایسی دیوی کی پریم کہانی سناتی ہے جس نے محبت کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی جان دے دی۔ جس سے عشق کیا تھا اس کے لیے چترال کی شاہانہ زندگی چھوڑ دی اور عشق کی دیوانگی میں موت کو گلے لگا کر خود کو امر کر دیا۔

☆☆☆☆

گوجری تخلیق و ترجمہ: احمد سلیم سلیمی

میُون

سورج کا سفر مغربی اُفق کے قریب پہنچ گیا تھا۔ سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ لیکن ابھی دھوپ نے زمین کی گود سے سر نہیں اُٹھایا تھا۔ رحمت جان کسان ایک درخت کے نیچے اپنی تکان دور کر رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر اس کے بیلوں کی جوڑی جگالی کر رہی تھی۔ رحمت جان محبت پاش نظروں سے اپنے بیلوں کو دیکھنے لگا۔ سارا سارا دن وہ ہل چلاتا۔ تپتی دھوپ میں زمین کی چھاتی چیرتا لیکن اس کے بیلوں نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔

وہ اُٹھا اب اس کی تکان دور ہو گئی تھی۔ وہ بیلوں کے کندھوں پر جوا درست کر رہا تھا اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا تو اسے اپنا ایک ہم سایہ نظر آیا۔ وہ قریب آیا اور آواز دی۔ ”رحمت جان! میں تمھارے گھر کی طرف سے آ رہا ہوں۔ تمھاری ساس نے تمھیں فوراً بلایا ہے۔“

رحمت جان متفکر سا ہوا۔ صبح جب وہ گھر سے نکلا تو بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ امید سے تھی۔ اس کی اپنی ماں نہیں تھی اس لیے ساس کو لا کے بیوی کے پاس چھوڑا تھا۔ دن بھر ہل چلاتے ہوئے بھی دھیان گھر کی طرف ہی جاتا رہا تھا۔

اس کا ہم سایہ اسے فکر مند دیکھ کر بولا۔ ”ارے رحمت جان! کیوں پریشان ہو گئے۔ تمھارے لیے زبردست خوشی کی خبر ہے۔ تمھارا بیٹا پیدا ہوا ہے۔“

رحمت جان بے یقینی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے اور اس کی لگاتار چار بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں۔ اب تو وہ شدید مایوسی کا شکار ہو گیا تھا۔ ایسے میں یہ خبر اس کے لیے ناقابلِ یقین ہی تھی۔

”رحمت جان تم گھر جاؤ۔ میں بیلوں کو کھول کر لے آتا ہوں۔“ اس کا ہم سایہ کہنے لگا۔ رحمت جان نے کمر بند کھولا۔ ایک نظر کھیت کی طرف ڈالی۔ تھوڑا سا کام رہ گیا تھا۔ لیکن اب اس کام کی اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا گھر کی طرف آنے لگا۔ گھر کے دروازے پر محلے کی چند عورتیں کھڑی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ مبارکباد دینے لگیں۔ رحمت جان کے لیے اب شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوا۔ بے انتہا مسرت سے چلتا ہوا اس کمرے میں آیا جہاں اس کی بیوی تھی۔ وہ اندر آیا تو ساس نے مبارکباد دیتے ہوئے

بیٹے کو اُٹھا کر اس کی گود میں ڈال دیا۔ اس نے نومولود بیٹے کی طرف دیکھا۔ بڑا ہی پیارا اور گول مٹول سا بچہ تھا۔ اس نے جھک کر بیٹے کو چوما۔ پھر اسے ساس کے حوالے کر کے باہر آیا۔ مویشی خانے میں جا کے دو مضبوط اور صحت مند بکروں کو لایا اور اسی وقت ذبح کر کے محلے میں تقسیم کر دیا۔

اس نے بیٹے کا نام میون رکھا۔ میون دراصل بڑا ہی پیارا اور خوب صورت پرندہ ہوتا ہے۔ وادی پونیال اور گلگت کے علاقوں میں پایا جانے والا یہ پرندہ پیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ سفیدے، اخروٹ، شہتوت اور چیڑ کے بلند و بالا درختوں کی اونچی شاخوں پہ گھونسلے بنا کر رہتا ہے۔ جب یہ آواز نکالتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی بانسری بجا رہا ہو۔ گلگت، پونیال اور آس پاس کے علاقوں میں خوش گلو فنکاروں کے لیے میون کا استعارہ استعمال کیا جاتا ہے۔

رحمت جان کی یہ خواہش تھی کہ اس کا بیٹا اس کی طرح زمینداری نہ کرے بلکہ پڑھ لکھ کر راجہ کی فوج میں ملازم لگ جائے۔ اس لیے جب میون کی عمر اس قابل ہوئی کہ وہ پڑھ لکھ سکے تو اسے مکتب میں داخل کرایا۔ میون اکلوتا بیٹا تھا۔ سب گھر والوں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ جب بہت زیادہ لاڈ پیار ملا تو اس کی طبیعت میں شوخی اور چلبلا پن پیدا ہو گیا۔

گھر میں شرارتیں کرتا۔ محلے میں اپنی شریر طبیعت سے سب کو پریشان کر دیتا۔ مزاج کا ایسا بے چین تھا کہ کہیں بھی زیادہ دیر تک ٹک کر نہیں بیٹھتا تھا۔ جب اسے پڑھنے کے لیے مکتب چھوڑا گیا تو ابتدا میں اسے یہ کام اچھا لگا۔ لیکن جلد ہی اس کی سیماب طبعی نے پر پُرزے نکالے۔ اس کا دِل پڑھنے لکھنے سے اُچاٹ ہو گیا۔ گھر سے مکتب کا کہہ کر جاتا اور راستے میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ کبھی دریا میں نہانے چلا جاتا۔ پھر وہاں جال کے ذریعے مچھلیاں پکڑنے میں مشغول رہتے۔ کبھی غلیل سے پرندوں کا شکار کرتا رہتا۔ اسے بانسری سے عشق تھا۔ یہی ایک شوق ایسا تھا جو وہ باقاعدگی سے پورا کرتا۔ دریا کے کنارے یا پھر شہتوت کے بڑے سے درخت کے نیچے بیٹھ کر جب وہ بانسری بجاتا تو ہر شے جیسے وجد میں آ جاتی۔ اس کے کم عمر یار دوست آس پاس سکتے کی سی حالت میں بیٹھے رہتے۔ وہ نازک نازک اُنگلیوں اور ہونٹوں کی مدد سے ایسی ایسی دھنیں نکالتا کہ دوستوں کے ساتھ ساتھ آس پاس کی ہر شے جیسے جھومنے لگتی۔

رحمت جان تو یہی سمجھتا رہا کہ اس کا میون مکتب پڑھنے جا رہا ہے۔ لیکن ایک روز میون کا استاد اس سے ملا اور ساری بات بتا دی کہ میون پڑھنے نہیں آتا بلکہ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے۔ رحمت جان نے یہ سنا تو اسے بہت غصہ آیا۔ دُکھ بھی ہوا۔ اس نے استاد کو یقین دلایا کہ آئندہ میون باقاعدگی سے مکتب پڑھنے آئے گا۔ رات کو رحمت جان نے بیٹے کو نرم گرم لہجے میں سمجھایا۔ میون نے باپ کے ساتھ وعدہ کیا کہ

اب وہ کبھی مکتب سے غیر حاضر نہیں ہوگا۔ چند دن وہ با قاعدگی سے مکتب جانے لگا پھر پُرانی روش کی طرف لوٹ آیا۔ رحمت جان سے پھر شکایت کی گئی تو اس بار اس نے سختی سے سمجھایا لیکن میون پھر بھی راہِ راست پر نہیں آیا۔ وہ کسی آزاد پنچھی کی طرح تھا کسی ایک جگہ بندھا رہنا اس کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔ اب رحمت جان کو احساس ہو رہا تھا کہ شروع میں اسے لاڈ پیار دے کر غلطی کی ہے۔ بہت زیادہ نرمی اور محبت کے ساتھ ذرا سختی کا رویہ اختیار کیا جاتا تو وہ اس قدر سرکش نہ بنا ہوتا۔ جب وہ کسی بھی طرح پڑھنے لکھنے کے راستے میں نہیں آیا تو رحمت جان نے بڑے ہی دُکھ کے ساتھ اسے مکتب سے نکالا اور اپنے ساتھ کھیتوں میں لگا لیا۔ لیکن یہاں پر بھی پابندی تھی۔ مسلسل باپ کی نگرانی تھی اس لیے جلد ہی اس کام سے بھی اس کا دِل بھر گیا۔

رحمت جان کی بہت سی بھیڑ بکریاں تھیں۔ اب میون ان بھیڑ بکریوں کو چرانے لے جانے لگا۔ اس کام میں اس کا دِل لگ گیا تھا۔ وہ بکریوں کو لے کر دور دور چراگاہوں اور اونچے اونچے پہاڑوں کی طرف چلا جاتا۔ بکریاں اپنے لیے خوراک تلاش کرتیں۔ وہ کسی پتھر پر یا کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر بانسری بجانے لگتا۔ گاؤں میں اس کے بہت سے دوست تھے۔ لیکن مراد اس کا بہت ہی گہرا دوست تھا۔ وہ بھی اپنی بھیڑ بکریوں کو لے آتا۔ اور دونوں دوست بکریاں چراتے ہوئے پہاڑوں پہاڑوں پھرا کرتے۔

ایک روز کا ذکر ہے۔ شام کا وقت تھا۔ آسمان پر دور دور تک، کالے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میون اور مراد، ریاست پونیال کے ایک گاؤں امان پور کے اوپر ایک پہاڑی چراگاہ میں بکریاں چرا رہے تھے بکریاں دور دور تک پھیلی ہوئی گھاس میں منہ دیے چرنے میں مصروف تھیں۔ میون اور مراد چیڑ کے ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ میون نے آج ایک نئی دُھن بنائی تھی۔ یہ دُھن ایسی اثر انگیز اور پُر درد تھی کہ دونوں کو کسی اور شے کا احساس نہیں تھا۔ اردگرد کا انھیں کچھ ہوش نہیں تھا۔ مگر جب گہرے گہرے بادلوں کی گود سے بارش کے قطرے ٹپک پڑے اور ان کے چہروں پہ ٹھنڈے ٹھنڈے قطروں کی گدگدی ہوئی تب وہ دونوں چونک گئے۔ بکریاں دور دور تک چراگاہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ موسم کے آثار بڑے خطرناک تھے اب تب میں زوروں کی بارش ہونے والی تھی۔ وہ دونوں جلدی سے اُٹھے اور بکریاں اکٹھی کرنے لگے۔ میون کی چند بکریاں کم تھیں۔ اس نے ایک بڑے سے پتھر پر چڑھ کر دور تک نیچے اپنے گاؤں امان پور کی طرف دیکھا۔ اسے کہیں بھی بکریاں نظر نہ آئیں۔ پہاڑی کے دوسری طرف گلاب پور تھا۔ کبھی کبھی اس کے مال مویشی گلاب پور کی طرف جاتے تھے۔ اس نے مراد سے کہا کہ وہ اس کی بکریوں کو بھی لے کر گاؤں چلا جائے۔ وہ خود گلاب پور کی طرف جا کر بکریوں کا پتہ کرے گا۔ مراد بکریاں لے کر امان پور روانہ ہوا۔

میون تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گلاب پور کی طرف چل پڑا۔ اوپر پہاڑی سے گاؤں کی طرف کوئی

با قاعدہ راستہ نہیں تھا۔ چرواہوں اور مویشیوں کے چلنے سے ایک پگ ڈنڈی سی بن گئی تھی۔ میون ارد گرد دیکھتا ہوا' دوڑتا ہوا نیچے کی طرف جانے لگا۔ وہ دُعا کر رہا تھا کہ بکریوں کے ملنے تک بارش نہ ہو۔ ورنہ پہاڑی راستے پہ بکریوں کو ڈھونڈنا بڑا ہی مشکل ہوگا۔ بارش کے اندیشے سے وہ مزید تیز دوڑتے ہوئے' پتھروں کو پھلانگتے ہوئے نیچے گاؤں کی طرف جانے لگا۔ جلد ہی وہ گلاب پور میں داخل ہوا۔

میون پہلے کبھی اس گاؤں میں نہیں آیا تھا۔ وہ سنتا آیا تھا کہ امان پور اور گلاب پور والوں کا کسی چراگاہ کے سلسلے میں بڑا جھگڑا تھا۔ ان کی آپس میں کئی خوں ریز لڑائیاں بھی ہوئی تھیں، جن میں متعدد لوگ مارے گئے تھے۔ اس وجہ سے بہت کم لوگ ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ گلاب پور میں ریاستِ پونیال کے راجہ کی فوج کا بڑا افسر رہتا تھا۔ اس اعلیٰ افسر کا نام شیر شاہ تھا۔ وہ بڑا ظالم تھا۔ دوسرے گاؤں کے لوگوں کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس کے رُعب اور خوف سے بھی دوسرے گاؤں والے بہت کم اس طرف جاتے تھے۔

میون نے گاؤں کے قریب جا کر دور دور تک دیکھا۔ گلاب پور کے لوگ چھتوں پہ خشک کرنے کے لیے پھیلائے گئے پھلوں کو اور خشک چارے کو متوقع بارش سے محفوظ رکھنے کے لیے انھیں چُھپا رہے تھے۔ اسی وقت دور ایک کھیت میں اسے چند بکریاں دکھائی دیں۔ شام کا وقت تھا اس کے علاوہ بادل چھائے ہوئے تھے اس لیے واضح نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس کی ہی بکریاں ہیں یا نہیں۔ وہ دوڑتے ہوئے بکریوں کی طرف جانے لگا۔ قریب گیا تو اپنی بکریوں کو پہچان کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ اس کی بکریاں شفتل کے ایک کھیت میں بڑے مزے سے چر رہی تھیں۔ وہ جلدی سے کھیت میں داخل ہوا۔ اپنی بکریوں کو ہانکتا ہوا باہر نکالنے لگا۔ اسی وقت کسی لڑکی کی تیز اور غصیلی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا۔ اسے دو لڑکیاں نظر آئیں۔ دونوں لڑکیاں تیز تیز چلتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھیں۔ قریب آ کر ان میں سے ایک لڑکی غصے سے بولی۔

”اے کون ہو تم؟ یہ کیا اپنا کھیت سمجھ کر مزے سے بکریاں چرا رہے ہو؟“

لڑکی کی آواز میں ایسا غصہ تھا کہ میون کی زبان سے بات نہ نکل سکی۔ بڑی مشکل سے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ”مم.......... میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا ہے۔ میری بکریاں وہ... اوپر پہاڑی چراگاہ سے بھاگ کر آئی تھیں۔“

”تم کیا سو گئے تھے؟ اگر بکریاں سنبھال نہیں سکتے تو مت چراؤ۔“ لڑکی کھیت کی طرف دیکھتے ہوئے کٹیلے لہجے میں بولی۔ ”دیکھو تو ستیاناس کر دیا پورے کھیت کا۔ اگر بابا یہاں ہوتے، تب تو تم اپنی بکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ لیکن میں بھی آسانی سے نہیں چھوڑوں گی۔“

دوسری لڑکی ابھی تک خاموش تھی وہ دھیرے سے بولی۔ ''چھوڑو نا لیلیٰ۔ بے چارے کو پریشان کیوں کرتی ہو؟ یہ کہہ تو رہا ہے نا کہ بکریاں بھاگ کر آئی تھیں۔''

میون نے یہ ہمدرد اور مہربان لہجہ سنا تو نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ پہلی والی لڑکی کے غصے کی وجہ سے وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکا تھا۔ اب جو نظر پڑی تو ہٹانا بھی بھول گئی۔ کچھ چہرے بڑے قاتل ہوتے ہیں۔ پہلی ہی نظر میں دِل کا کباڑہ کر دیتے ہیں۔ پہلے وہ صرف اپنی بانسری کے کمال سے آگاہ تھا اب اس لڑکی کو دیکھ کر حسن و جمال کے کمال سے بھی آگاہ ہو رہا تھا۔ دید کا وہ لمحہ یوں تو چند ثانیوں کا تھا لیکن احساس کی دُنیا میں جیسے موسم گل آ کر گزر گیا۔ پہلی والی لڑکی، جس کا نام لیلیٰ تھا، اس کی غصیلی آواز سنائی دی تو وہ ہوش میں آیا۔ '' تجھے معلوم نہیں سُنبل! ایسے لوگ بڑے ہی چالاک ہوتے ہیں۔ اصل بات چھپا کر ہمدردی بھی حاصل کرتے ہیں اور مویشیوں کا پیٹ بھی بھر لیتے ہیں۔ موئے حرام خور کہیں کے۔''

''میری بات پہ یقین کریں میں جھوٹ نہیں بولتا۔'' میون سر جھکا کر عاجزی سے بولا۔

''تم گلاب پور کے تو نہیں لگتے ہو۔ کدھر سے آئے ہو؟'' لیلیٰ نے پوچھا۔

اوپر چراگاہ سے نیچے اترتے ہوئے اس نے سوچا تھا اگر کسی نے اس کے بارے میں پوچھا تو امان پور کا ذکر نہیں کرے گا۔ مگر ان لڑکیوں کے سامنے اس کے حواس ہی متاثر ہوئے تھے۔ اس نے بے خیالی میں بتایا ''میں امان پور کا ہوں۔ اوپر چراگاہ میں بکریاں چرانے لاتا ہوں۔''

''تم امان پور کے ہو؟'' وہ خوبصورت لڑکی، جس کا نام سُنبل تھا۔ پہلی بار اس سے مخاطب ہوئی۔

''کیا تمھیں معلوم نہیں امان پور اور گلاب پور والوں کی آپس میں دشمنی ہے۔ ابھی کسی کو پتہ چلا تو تم اپنی بکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اس لیے فوراً واپس چلے جاؤ۔''

''لیکن سُنبل! اسے کچھ تو سزا ملنی چاہیے۔ دیکھو تو اتنا نقصان ہوا ہے شُفتل کا۔'' لیلیٰ بولی۔

''کوئی بات نہیں لیلیٰ۔ اس کی یہ پہلی غلطی معاف کر دیتے ہیں۔''

میون نے شکر گزاری سے سُنبل کی طرف دیکھا اور پھر بکریوں کو ہانکتا ہوا تیزی سے پہاڑی راستے پہ چڑھنے لگا۔ پہاڑی کے دامن تک آیا تھا کہ بڑی دیر کے ٹھہرے ہوئے بادل برسنے لگے۔ بارش کی تیز پھوار سے وہ بھیگنے لگا۔ لیکن اس طرح بھیگنے میں اسے بے طرح لطف آ رہا تھا۔ اندر پہلی دفعہ کسی کی صورت میٹھا میٹھا درد جگا رہی تھی۔ ایسے میں بارش کے قطرے گدگدی کرتے ہوئے اس درد کی لذت کو سوا کر رہے تھے۔ پہلے زندگی پُرسکون تھی لیکن اب پُرسکون تالاب میں چاند اُترا تھا اور ایسا اُتار چڑھاؤ پیدا ہو رہا تھا کہ مستی سے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ جب اپنے گاؤں پہنچا تو اندھیرا پھیل گیا تھا۔ بارش کا زور بھی ٹوٹ گیا تھا۔

ماں اسے دیکھ کر بے تابی سے قریب آئی۔ ”میون بیٹا۔ تم آ گئے۔ مراد نے بتایا تھا تم بکریاں تلاش کرتے ہوئے گلاب پور گئے تھے۔“

”جی ہاں ماں۔ بکریاں نیچے گلاب پور کی طرف گئی تھیں۔ مراد کے ساتھ بکریاں بھیج کر میں وہاں گیا تھا۔ مجھے جلد ہی بکریاں نظر آ گئیں۔ واپس آتے ہوئے راستے میں بارش شروع ہوئی تھی۔ مگر میں خیریت سے یہاں پہنچ گیا۔“

”بیٹا۔ گلاب پور والوں نے کچھ کہا تو نہیں۔ تمھارے بابا بہت فکرمند تھے۔ ابھی اُٹھ کر باہر گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کسی کو ساتھ لے کر تمھارے پیچھے جائیں گے۔“

”نہیں ماں۔ بابا تو ویسے ہی پریشان تھے۔ گلاب پور والے تو بہت اچھے ہیں۔“ وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔ ”گلاب پور میں تو گلاب جیسے لوگ ہیں۔ بہت ہی اچھے اور ہمدرد۔ میری بانسری کی طرح میٹھی اور نرم آواز والے۔۔۔۔“

اس رات میون بہت کم سو سکا۔ زیادہ تر کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتا رہا۔ نیندیں غائب ہوئی تھی جیسے دِل سے قرار غائب تھا۔ وہ چہرہ اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ نگاہوں کی رہگزر پہ اتر آیا تھا اور اس پر انجانے جذبوں کے دریچے کھل رہے تھے۔ اندر ایسی کیفیتوں کا نزول ہو رہا تھا جن سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ بڑی دیر تک بیٹھے بیٹھے درد سے تڑپتے رہنے کے بعد وہ سو گیا۔

صبح بیدار ہوا تو دِل میں سب سے پہلی خواہش یہ تھی کہ اس خوبصورت لڑکی کو پھر سے دیکھے۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ یہ کیسی حالت ہے؟ اس کا دھیان جتنا ہٹاتا، نگاہوں کے سامنے ہر طرف اسی کی صورت نظر آتی تھی۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا اور دسترخواں پہ بیٹھ گیا۔ ماں نے مکئی کی روٹی پر مکھن ڈال کے دودھ کے ساتھ دیا۔ اس کے ناشتہ کرنے تک ماں نے مقامی طور پر بنائی جانے والی موٹی روٹی ”چھوپٹی“ (یہ کیک کی طرز کی ہوتی ہے۔ گلگت اور آس پاس کے علاقوں میں صبح ناشتے میں عام طور پر یہی روٹی استعمال کی جاتی ہے۔ گندم کی نمکین اور مکئی کی میٹھی روٹی بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ دور دراز سفر کرنا ہو تو بھی چھوپٹی بنا کے دی جاتی ہے۔) پوٹلی میں باندھ کر اس کے حوالے کی۔ اس نے جلدی سے ناشتہ کیا اور مویشی خانے سے بکریوں کو نکال کے چراگاہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں مراد بھی اپنی بھیڑ بکریوں کو لے کر اس کے ساتھ مل گیا۔

میون چاہتا تھا کہ دِل جس انجانے درد سے آشنا ہوا ہے۔ مراد کو اس بارے میں بتائے۔ پہاڑی چراگاہ میں پہنچ کر بکریاں کھلے سبزہ زار میں دور دور تک پھیل کر چرنے میں مصروف ہو گئیں۔ وہ دونوں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ میون نے ہمت کی اور مراد کو گلاب پور کے خوبصورت حادثے کے بارے

میں بتایا۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں سارا قصۂ محبت سنانے لگا۔ جب اس نے بات ختم کی تو مراد نے کہا۔ ''یہ کیسی فضول باتیں تمھارے دماغ میں آئی ہیں۔ گلاب پور کی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی خطرے سے خالی نہیں اور تم مکمل عشق کرنے لگے ہو۔''

''میں کیا کروں مراد؟'' وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں ہمارے گاؤں کے گلاب پور والوں سے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ لیکن کیا کروں۔ یہ کیسی بے قراری ہے کہ دِل میرے قابو میں نہیں رہا ہے۔''

مراد کچھ دیر اس کی طرف سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''پھر کیا ارادے ہیں تمھارے؟''

میون اپنی جگہ سے اُٹھا۔ چند قدم پیچھے چل کر نیچے دور دور تک دیکھنے لگا۔ شہتوت، خوبانی، سیب اور اخروٹ کے اونچے اونچے درختوں کے درمیان اسے گلاب پور گاؤں دکھائی دیا۔ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نہیں جانتا تھا کہ کوئی اچھا لگے تو دِل اس کے لیے اس قدر بے چین رہتا ہے اور اسے ایک نظر دیکھنا شدید ترین تمنا ہوتی ہے۔ میں اسے دیکھنے گلاب پور جا رہا ہوں تم میری بکریوں کا خیال رکھو۔''

مراد فکرمندی سے بولا۔ ''ایسی دیوانگی خوب نہیں میون! ۔ مصیبت کو گلے لگاؤ گے۔''

''فکر مت کرو مراد۔ میں جلد آؤں گا۔ اسے دیکھنے کی تمنا سے میں باز نہیں آ سکتا۔'' اس کی بے قرار آنکھوں میں جنونِ وصل کے ہزاروں دیے جل اُٹھے۔

میون یہ کہہ کر تیزی سے دوڑتا ہوا پہاڑی چراگاہ سے نیچے گلاب پور کی طرف جانے لگا۔ زمین پہ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ شروع دن کی یہ نرم گرم دھوپ جسم میں گدگدی سی کر رہی تھی۔ راستہ ایسا ناہموار تھا کہ احتیاط سے قدم اُٹھانے پڑتے تھے۔ لیکن شوقِ وصل سے وہ دوڑتا ہوا، پتھروں کو پھلانگتا ہوا راستہ طے کر رہا تھا۔ بڑی دیر بعد وہ نیچے ہموار زمین پہ پہنچ گیا۔ سامنے کچھ فاصلے پہ گلاب پور دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نگاہوں کو آئینہ بنائے ہر چیز کو محبت سے دیکھتا ہوا گاؤں میں داخل ہو گیا۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ گلی کوچوں میں گاؤں کے بچے اور بڑے بوڑھے گھوم رہے تھے۔ کھیتوں میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی کام کاج میں مصروف تھیں۔ وہ ہر چہرے کو دیکھتا جا رہا تھا کہ کہیں وہ پری چہرہ نظر آ جائے۔ بڑی دیر تک ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ تھک گیا لیکن وہ اسے نظر نہ آئی۔ گاؤں کے نوجوان اب اسے مشکوک اور پُرخشونت نظروں سے گھورنے لگے تھے۔ ایک جگہ اسے روک کر پوچھا بھی، مگر اس نے دوسرے گاؤں کا بتایا۔ اپنی بکریوں کی تلاش کا بہانہ بنایا۔ ان لڑکوں نے ناگواری سے اسے جانے دیا۔ وہ بہت ہی مایوسی سے، بجھے دِل کے ساتھ واپس

ہوا۔ چراگاہ میں مراد بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میون کے افسردہ اور اُترے چہرے کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ اس کی مراد بر نہیں آئی ہے۔ اس نے کہا۔ “صورت سے بڑے ہی دُکھی اور مایوس لگتے ہو۔ کیا لڑکی نے جوتے مار کر بھگایا ہے۔”

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ “نہیں یار۔ وہ تو مجھے دکھائی ہی نہ دی۔ اس کا گھر بھی معلوم نہیں تھا۔ بس اندازے سے پورے گاؤں میں اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا لیکن اسے نہ دیکھ سکا۔”

مراد بولا۔ “ارے پیارے۔ ضروری تو نہیں کہ ہر وقت وہ گھر سے باہر ہو۔ اتنے بڑے گاؤں میں نہ معلوم اس کا گھر کون سا ہوگا۔ میری مانو، باز آ اس پاگل پن سے۔ ہوا کو مٹھی میں بند کرنا نادانی ہے۔”

میون نے اس کی بات سن کر ایک گہری سانس لی اور بانسری نکال کے ہونٹوں سے لگالی، بانسری کی میٹھی اور پُر درد آواز میں ڈوب کر وہ دِل کی بے تابی کو تسکین پہنچانے کے جتن کرنے لگا۔

اس کے بعد تین روز تک وہ مسلسل گلاب پور جاتا رہا۔ لیکن اسے سُنبل کہیں دکھائی نہ دی۔ وہ بہت ہی مایوس ہوگیا۔ سوچنے لگا وہ سب کسی خواب کا حصہ تھا۔ خواب جو بار بار دکھائی نہیں دیتا لیکن یہ خواب اسے پھر دکھائی دیا۔

اس روز مراد ساتھ نہیں آیا تھا۔ دوسرے گاؤں میں اس کے کسی رشتے دار کی شادی تھی۔ وہ ادھر چلا گیا تھا۔ میون نے بکریاں کھلی چراگاہ میں چھوڑ دیں اور اس درخت کے پاس آیا جہاں سے دور نیچے گلاب پور گاؤں نظر آتا تھا۔ وہاں ایک پتھر پہ بیٹھ کر بانسری بجانے لگا۔ اس کی بے قراری اور محبت کی کیفیت، بانسری سے نکل کر ہر سو ایک وجد آفریں اثر پیدا کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا اس کے ساتھ ساتھ اردگرد کے درخت اور پتھر بھی جھوم رہے ہوں۔ وہ آنکھیں بند کیے بانسری بجانے میں کھویا ہوا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے آس پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا بھی ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا پھر ٹھٹھک گیا۔ کچھ فاصلے پر اسے کچھ لڑکیاں دکھائی دی تھیں۔ لڑکیاں اس کی طرف دیکھتی ہوئی پاس آ رہی تھیں۔ میون حیران حیران نظروں سے لڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا نہ جانے وہ کون تھیں؟ امان پور کی تو نہیں لگتی تھیں۔ پھر یکایک اس کا دِل اُچھل کر جیسے حلق میں آیا۔ لڑکیوں کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کی نگاہیں ایک چہرے پہ جم گئی تھیں۔ اسے یوں لگا جیسے سارے عالم کی دل کشی سمٹ کر اس کی آنکھوں کے راستے میں آ گئی ہو۔ جیسے تاریک رات میں ایک دم ہزاروں چاند روشن ہو گئے ہوں۔ وہ چہرہ جسے چند دن پہلے، ایک نظر دیکھ کر وہ خود کو بھلا بیٹھا تھا۔ جس کو دیکھنے کے لیے وہ مسلسل گلاب پور جا رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے تھا۔

میون پتھر سے چھلانگ لگا کر زمین پر آیا اور خواب کی سی کیفیت میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے کھڑا

ہوگیا۔ وہ پانچ چھ لڑکیاں تھیں ۔ سنبل کے علاوہ اس کی سہیلی لیلیٰ بھی تھی ۔ جس کا کھیت میون کی بکریوں نے خراب کیا تھا۔ اوراس کے دِل میں محبت کی فصل اُگی تھی ۔

’’اے تم وہی ہونا! بکریوں والے؟‘‘ لیلیٰ ڈپٹ کر بولی ۔ بکریوں والے کا لقب سن کر میون کو ہنسی آئی ۔ ’’ہاں میں وہی ہوں ۔ کیا مجھ سے جرمانہ وصول کرنے آئی ہیں؟‘‘

’’جرمانہ لینا ہوتا تو اسی وقت لیتی ۔ بس سنبل کی وجہ سے تجھے معاف کردیا تھا۔‘‘

میون نے دیکھا۔ سنبل آہستہ سے لیلیٰ سے کچھ کہہ رہی تھی ۔ پھر لیلیٰ زور سے بولی ۔ ’’اے بکریوں والے! یہ سنبل ہے ، میری سہیلی ، اسے تمھاری بانسری کی آواز بہت پسند آئی ہے۔ پھر سے سننا چاہتی ہے۔ دوبارہ بجاؤ۔‘‘

میون نے سنبل کی طرف دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں یہی خواہش مچل رہی تھی ۔ میون نے بانسری ہونٹوں سے لگالی ۔ پھر ان خوبصورت آنکھوں کی جھیلوں میں ڈوب کر بانسری کی مدھر آواز کا جادو جگانے لگا۔ بڑی دیر بعد اس نے بانسری ہونٹوں سے جُدا کی ۔ سب لڑکیاں بڑی ہی محویت کے ساتھ اس کی بانسری سن رہی تھیں ۔ اسے سنبل کی آنکھوں میں پسندیدگی کے تاثرات بڑے واضح محسوس ہو رہے تھے ۔

لیلیٰ بولی ۔ ’’اے بکریوں والے! کیا خوب بانسری بجاتے ہو! کہاں سے سیکھا ہے؟‘‘

’’میرا نام بکریوں والا نہیں، میون ہے ۔‘‘ میون نے کہا۔ ’’میں نے بانسری کسی سے نہیں سیکھی ہے ان پہاڑوں کی گود میں میری زندگی گزری ہے.......... یہاں چکور، مرغِ زریں، میون اور کوئل کی آوازوں کے ساتھ میں نے بولنا اور بانسری بجانا سیکھا ہے ۔‘‘

لیلیٰ ہنستی ہوئی بولی ۔ ’’اے بکریوں والے! تم تو شاعری بھی کرتے ہو۔ کیا کمال کی چیز ہو۔‘‘

میون نے تیزی سے کہا۔ ’’میں نے کہا نا میرا نام میون ہے ۔‘‘

’’اچھا اچھا! چلو میون ہی کہتی ہوں ۔ ہم گلاب پور سے سیر کے لیے آئے ہیں ۔ تمھاری بانسری کی آواز سن کر رکنے پر مجبور ہوئے تھے ۔ بڑا مزہ آیا پھر سے بجاؤ نا ۔‘‘

’’یہ جو باقی لڑکیاں ہیں، یہ گونگی ہیں کیا؟ یہ خاموش کیوں بیٹھی ہیں ۔ اگر یہ بھی کہیں گی تب سناؤں گا۔‘‘

باقی لڑکیاں بھی ہنستی ہوئی اپنی خواہش اور پسندیدگی کا اظہار کرنے لگیں ۔

میون، سنبل کی طرف دیکھ کر اک ذرا مسکرایا اور بانسری ہونٹوں سے لگائی ہی تھی اسی وقت ایک طرف سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی ۔ سب نے آواز کی سمت دیکھا۔ کچھ گھڑ سوار گھوڑے دوڑاتے

ہوئے اس طرف آ رہے تھے۔ انھوں نے قریب آ کر گھوڑوں کو روکا۔ پھر ایک سوار چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اُتر گیا اور سنبل کے پاس جا کر بڑے ہی مودب لہجے میں بولا۔ ‘‘سنبل بی بی! بڑے صاحب آپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔ آپ واپس چلیں۔’’

وہ ناگواری سے بولی۔ ‘‘بابا کو کس نے بتا دیا تھا کہ ہم اس طرف آئے ہیں۔’’

‘‘مجھے اس بارے میں علم نہیں۔ بس صاحب کے حکم کے مطابق ہم اس طرف آئے ہیں۔’’

‘‘ٹھیک ہے تم چلو ہم آتے ہیں۔’’ اس نے باوقار لہجے میں کہا

وہ گھڑ سوار میون کی طرف پلٹ کر غصیلی آواز میں بولا۔ ‘‘اے تم کون ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔’’

میون کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سنبل ناگواری سے بولی۔ ‘‘تجھے اس سے کیا غرض ہے؟ یہ اس چراگاہ میں بکریاں چراتا ہے۔ ہم نے خود ہی اسے روکے رکھا ہے۔’’

گھڑ سوار نے سنبل کی بات سنی تو خفیف سا ہوا اور گھوڑے پہ سوار ہو کر دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑے دوڑاتا ہوا گلاب پور والے راستے پہ چلا گیا۔

میون نگاہوں سے اوجھل ہونے تک انھیں دیکھتا رہا۔ اس کے دماغ میں سائیں سائیں تیز ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ اس کا دِل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ سنبل کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ اس کا بے خود کر دینے والا حسن، باوقار انداز اور گھڑ سواروں کا مودب رویہ اسے کسی خاص لڑکی کی نشاندہی کرا رہا تھا۔ یہ خیالات دماغ میں آتے ہی وہ بجھ سا گیا۔ اسے اپنی حیثیت کا احساس ہوا۔ اس نے دھیرے دھیرے سر گھما کے سنبل کی طرف دیکھا۔ تب پہلی دفعہ سنبل اس سے مخاطب ہو کر بولی۔

‘‘تمھاری بانسری کی آواز ہمیں بہت اچھی لگی ہے۔ ہم کل پھر آئیں گے۔ انکار تو نہیں کرو گے نا؟’’

میون کو اپنی سماعت پہ یقین نہیں آیا۔ سنبل اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ پھر آنے کی بات کر رہی تھی۔ اس کے دِل میں نرم گرم ہوائیں چلنے لگیں۔ موسم بہار کے سارے رنگ دِل کے چمن میں اترنے لگے۔ ایسے میں وہ انکار کیا کرتا۔ اس کا انگ انگ اقرار کرنے لگا۔

……………………

سنبل اپنی سہیلیوں کے ساتھ پہاڑی چراگاہ میں میون سے بانسری سننے کے لیے آتی رہی۔ میون بڑا بُھولا تھا۔ دل میں جو نیا جذبہ پیدا ہوا تھا اسے محسوس کر رہا تھا مگر سمجھ نہیں رہا تھا۔ بس یہی بات اس کے لیے انمول تھی کہ سنبل اس کے پاس آتی تھی۔ اس کی بانسری سنتی تھی۔ کبھی کبھی دِل میں بڑی شدت سے خواہش

اُبھرتی تھی کہ اسے بانسری ہی نہ سنائے۔ دِل کا حال بھی سنائے۔ لیکن ہمت کے پرندے کوچ کر جاتے۔ وہ ایک غریب چرواہا تھا۔ ایک چھوٹے خاندان کا فرد۔ جب کہ اسے علم ہو گیا تھا کہ سنبل، راجہ کی فوج کے اعلیٰ افسر شیر شاہ کی بیٹی تھی۔ ویسے بھی شیر شاہ کا خوف اور رعب دور دور تک بیٹھا ہوا تھا۔ ایسے میں وہ ندیا کے کناروں کی طرح تھے۔ اس پہاڑی چراگاہ میں زندگی کے کچھ لمحے اس کی قربت میں گزارنے کی خوشی تو مل سکتی تھی مگر کبھی مل نہیں سکتے تھے۔ دِل کی بات ظاہر نہ کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ وہ ڈرتا تھا اس کی حرکت سے کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ اس طرح اسے دیکھنے کی نعمت سے بھی محروم ہو جاتا۔ چناں چہ وہ خاموش ہی رہا اور جو کچھ دِل میں تھا بانسری کی آوازمیں ہواؤں میں بکھیرنے لگا۔

انسانی جسم میں آنکھیں بڑی کمال کی چیز ہیں۔ بولنے کے لیے زبان ہے۔ لیکن بعض معاملات میں زبان کی صفتِ گویائی معدوم ہو جاتی ہے۔ تب یہ کام آنکھیں سرانجام دیتی ہیں۔ وہ زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکا لیکن آنکھیں بے اختیار تھیں۔ کوشش کے باوجود بےخودی کے عالم میں دِل کا حال ظاہر کرنے لگیں۔ چند ایک ملاقاتوں کے بعد اسے محسوس ہوا کہ جیسے سنبل اس کی آنکھوں کا پیغام سمجھ چکی ہے۔ میون کی توقع کے برعکس اس کا ردِعمل بڑا ہی حوصلہ افزا تھا۔

میون نے بہت واضح طور پر محسوس کیا کہ سنبل کی نگاہوں میں اب صرف بانسری ہی کے لیے نہیں اس کے لیے بھی پسندیدگی کے جذبات تھے۔ اس نے یہ بات مراد کو بتائی تو وہ اس کی ناسمجھی پہ قہقہہ لگانے لگا۔

”ارے دیوانے! ایسے خواب مت دیکھو۔ اپنی اور اس کی حیثیت کو مت بھولو۔ اب بھی وقت ہے لوٹ آؤ۔“

لیکن میون پر مراد کی ان باتوں کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اس کا دِل اس یقین سے دھڑک رہا تھا کہ سنبل صرف اس کی بانسری کی آواز سے ہی کھنچی نہیں آتی ہے۔ بل کہ دل میں اٹھنے والی نئی لہر کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھی اس کے پاس آتی ہے۔

……

اس روز میون اور مراد پہاڑی چراگاہ میں اپنی مخصوص جگہ پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ سورج مغربی اُفق کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔ میون بڑا پریشان اور دِل گیر تھا۔ تین دن ہوئے تھے سنبل اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس طرف نہیں آئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے بانسری بجاتے ہوئے اس کی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ اسی وقت مراد کی آواز سے وہ ہوش میں آیا۔ میون نے آنکھیں کھول کر مراد کے اشارے کی سیدھ میں دیکھا۔ کچھ فاصلے سے دو لڑکیاں اُس طرف آتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ یکبارگی اس کا دِل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ نگاہوں کے سامنے طرح طرح کے پھول کھل اُٹھے۔ سنبل اپنی سہیلی لیلیٰ کے ساتھ اس طرف آ رہی تھی۔ وہ قریب آئیں۔

میون ایک عالم کیف میں سنبل کی طرف ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا تھا۔ تین دن کی جُدائی کی پیاس گھونٹ گھونٹ پینے سے نہیں، پوری صراحی منہ سے لگانے سے ہی بجھ سکتی تھی۔ اسے یوں اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ کر وہ دونوں محجوب سی ہوئیں پھر لیلیٰ بولی۔ ”اے میون! یہ کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو۔ کیا پہچان نہیں رہے ہو؟“

وہ گڑبڑا سا گیا پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ”پہچانا ہے تبھی تو یوں دیکھ رہا ہوں۔ خیر یہ بتاؤ کافی دنوں بعد اس طرف آئیں۔ کیا میری بانسری سے جی بھر گیا ہے؟“

”ایسی بات نہیں۔“ لیلیٰ بولی۔ ”دراصل میں اور سنبل وادیِ یاسین گئی تھیں۔ وہاں راجہ کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ ہماری بڑی گہری سہیلی ہے۔“

سنبل دھیرے سے بولی۔ ”میون تمھاری بانسری میں نہ جانے کیسا جادو ہے کہ خود پر قابو ہی نہیں رہتا۔ بس بے اختیاری سے کھنچی چلی آتی ہوں۔ لیکن ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ ہم شاید آئندہ نہ آ سکیں۔ کیوں کہ ہمارے گھر والوں کو بار بار اس طرف آنے سے شک ہوا ہے۔ اس لیے کیا تم خود نیچے گاؤں آ جاؤ گے؟ وہاں ہمارا بہت بڑا باغ ہے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگا۔“

میون نے کہا۔ ”بانسری کی آواز چھپی نہیں رہتی۔ کسی کو پتہ چلا تو بڑی بدنامی ہوگی۔“

مراد بولا۔ ”گلاب پور والے ہماری پرچھائیاں بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ ایسے میں کسی نے میون کو وہاں دیکھا تو قیامت آئے گی۔ اس لیے یہ ممکن نہیں۔“

”یہ مجھ پہ چھوڑ دو۔ میں اس کی ذمہ داری لیتی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں یقین کے ستارے جھلملانے لگے۔

میون کی جذباتی کیفیت ایسی جنوں آمیز تھی کہ سنبل کی بات جیسے عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔ اس لیے مراد کے منع کرنے کے باوجود اپنی رضامندی دے دی۔

اگلے روز وہ بکریاں، مراد کی ذمہ داری میں دے کر پہاڑی راستے سے ہوتا ہوا گلاب پور گاؤں میں آیا۔ سُنبل کا بتایا ہوا باغ گاؤں کے مغربی کنارے پہ تھا۔ باغ کافی گھنا تھا۔ انگور، خوبانی، سیب اور بادام کے درخت اس قدر تھے کہ باغ جنگل جیسا لگتا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا سنبل کو تلاش کرنے لگا۔ کافی دیر بعد لیلیٰ اور سنبل نظر آئیں۔ لیلیٰ چند قدموں کے فاصلے پہ رُک گئی اور سنبل اس کے قریب آ گئی۔ دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ میون بانسری نکال کے ہونٹوں سے لگانے والا تھا۔ سُنبل نے اسے روک دیا۔

”نہیں میون۔ یہاں تجھ سے بانسری سننے کے لیے نہیں بلایا ہے۔ یہاں تو ہم صرف باتیں کریں گے۔“

”میں سمجھا نہیں سنبل! کیا صرف باتیں کرنے کے لیے مجھے بلایا ہے؟“

سنبل اس کی طرف دیکھتی ہوئی گہری سانس لے کر بولی۔ ”میون! میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ اوپر چراگاہ میں آتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں صرف بانسری سننے کے لیے نہیں آتی تھی۔ تم سے ملنے، تمھیں دیکھنے بھی آتی تھی۔ پھر چند دنوں بعد میری حالت ایسی ہوگئی کہ تمھیں دیکھے بنا بہت بے قرار رہنے لگی۔ میں حیرت سے اس بارے میں سوچتی تھی۔ پہلے کبھی میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ اور اب جو ہو رہا تھا یہ اچھا بھی لگ رہا تھا اور ایک انجانا سا درد بھی اٹھ رہا تھا۔ پھر مجھے پتا چلا کہ اس کو محبت کہتے ہیں۔ اور میں بانسری سننے کے بہانے تمھارے پاس آتی رہی۔ مجھے دیکھ کر تمھاری جو حالت ہوتی تھی اور تم جن نظروں سے مجھے دیکھتے تھے اس سے میں سمجھ گئی تھی کہ تم بھی میری طرح ایک انجانے احساس سے گزر رہے ہو۔ مگر اظہار سے گھبراتے ہو۔ اس لیے میں نے پہل کی اور تمھیں یہاں بلایا ہے۔“

میون، حیرت اور مسرت سے جیسے ساکت رہ گیا تھا۔ اس کے اندر خوشی کی ایک پاگل کر دینے والی ہوا چلنے لگی تھی۔ مرد ہو کے جس بات کی وہ ہمت نہ کر سکا تھا سنبل نے کہہ دی تھی۔ اس پہ شادیِ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ جذبوں کا ہجوم ہوتے ہوئے بھی بے انتہا مسرت سے جیسے زبان بند ہوگئی تھی۔ بڑی دیر بعد وہ ہمت کر کے بولا۔ ”سنبل! تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔ یہ بات کہہ کر تم نے مجھے کتنی خوشیاں دی ہیں۔ مگر آہ!۔ میں ایک غریب اور گنوار چرواہا ہوں۔ تم ایک بڑے فوجی افسر کی بیٹی ہو۔ یعنی ہم صرف محبت ہی کر سکتے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کو پا نہیں سکتے۔“

”مجھے اس کا احساس ہے میون!۔ لیکن ہماری محبت میں طاقت ہے تو ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ ہم جیتے جی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔“ وہ میون کا ہاتھ تھام کر بولی۔

اس کے بعد وہ سلسلہ شروع ہوا جو اچھے خاصے سمجھدار انسان کو بے اختیار کر دیتا ہے۔ بندہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ بس دل و دماغ میں ایک صورت ایسی آ بیٹھتی ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر اسی کی غلامی اختیار کر لی جاتی ہے۔ میون اور سنبل اس باغ میں ملتے رہے۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ وہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ لیکن عشق نے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ختم کر ڈالا تھا۔ وہ صرف لمحۂ موجود کی خوشی سے غرض رکھنا چاہتے تھے۔ کل کیا ہوگا؟ ان کا ملاپ ہوگا نہیں ہوگا؟ یہ سب سوچ کر وصل کے حسین لمحات کو بے کیف کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن ملنا بچھڑنا تو اس دُنیا کی پُرانی ریت ہے۔ یہاں دلوں کے تخت پہ حکمرانی کرنے والوں کو محبت کی بازی جیتنے کے لیے آگ کا دریا عبور کرنا پڑتا ہے۔ میون اور سنبل جب ملتے تھے تو ہر اندیشے سے بے نیاز ہو کر ملتے تھے۔ لیکن خرگوش کی طرح آنکھیں بند کرنے سے خطرہ نہیں ٹلتا۔ بلکہ لاپروائی کی سزا کچھ زیادہ ہی سنگین ہوتی ہے۔ لمحۂ وصل کی وارفتگی میں وہ اپنے سماجی مرتبے کے فرق کو یکسر بھول جاتے تھے۔ محض دو دھڑکتے دلوں

کا تقاضائے قُرب بجالاتے تھے اور پُر کیف لمحوں کی چاندنی میں بھیگتے ہوئے مقامِ خرد سے آگے گزر جاتے ایسے میں ٹھوکر تو لگنی تھی اور ایسی ٹھوکر لگی کہ پیار کا شیش محل چکنا چور ہو گیا۔

سنبل کی ماں کچھ دنوں سے بیٹی کی حرکتوں سے خاصی متفکر تھی۔ ہر شام وہ گھر سے نکل جاتی اور بڑی دیر بعد لوٹتی۔ پوچھنے پر کہتی کہ محلے کی سہیلیوں سے ملنے جاتی ہے۔ اس کی ماں نے بھروسہ کیا۔ مگر یہ سلسلہ طویل ہوا اور بیٹی کے تیور بھی بدلے بدلے سے محسوس ہوئے تو ایک روز اس نے بیٹی کا پیچھا کیا اور باغ میں آئی۔ وہاں سیب، آڑو اور خوبانی کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس کے اوپر انگور کی بیل کی گھنی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اطراف میں پھولوں کی کیاریاں اوٹ کا کام دے رہی تھیں۔ وہاں نیچے زمین پہ سنبل اور میون بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے لب خاموش ہوتے مگر سانسیں سرگوشیاں کرتیں۔ ان کی دھڑکنیں گفتگو کرتیں۔ باغ کی ہوا بھی ان کے سکوت کا جیسے احترام کرتی۔ وہ بھی تھم سی جاتی۔ بس کبھی کبھار کوئی پرندہ انگور کی بیلوں میں سے کوئی شرارت کرتا اور آس پاس کا سکوت اک ذرا ٹوٹ جاتا۔

ماں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ غم اور غصے کے ساتھ گھر واپس آئی۔ رات کے وقت تنہائی میں اس نے بیٹی سے باز پرس کی۔ سنبل پہلے تو بہت گھبرائی پھر بولی کہ وہ دِل سے مجبور ہے۔ اس کے بغیر جینے کا تصور ہی محال ہے۔ ماں کے پوچھنے پر اس نے میون کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔ اس کی ماں نے تو کچھ اور سوچا تھا۔ میون کے بارے میں جان کر اسے سخت مایوسی ہوئی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر لڑکا کسی بڑے خاندان کا ہے تو باہمی رضامندی سے ان دونوں کا رشتہ طے کر دیا جائے گا۔ لیکن میون جس ذات اور خاندان سے تھا وہاں بیٹی دینے سے مار ڈالنا بہتر تھا۔ اس نے بیٹی کو کافی ڈرایا۔ اس کے اور میون کے سماجی فرق کا احساس دلایا۔ لیکن سنبل نے سر جھکا کے کہا۔ ”ماں! میں جانتی ہوں میون آپ کے معیار کا نہیں۔ میں بابا کی دہشت بھی جانتی ہوں۔ لیکن کیا کروں وہ ہر اونچ نیچ سے، ہر خوف سے بڑھ کر میرے اندر ہے۔“

اس کی ماں غصے سے بولی۔ ”شیطان دماغ پر چھا جائے تو انسان پاگل ہوتا ہے۔ پھر علاج سے ہی وہ ٹھیک ہوتا ہے۔ تم بھی پاگل ہو گئی ہو۔ اب تمہارا بھی علاج ضروری ہے۔“

اس کی ماں سمجھ گئی تھی سنبل کا علاج اب اس کے بس کا نہیں۔ اس نے ساری بات سنبل کے بابا شیر شاہ کو بتا دی۔ وہ معمولی آدمی نہیں تھا۔ راجہ پونیال کی فوج کا اعلیٰ افسر تھا۔ ایک بد دماغ اور غصہ ور شخص تھا۔ وہ یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ سنبل کو ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا اور اگلے روز جب میون، سنبل سے ملنے باغ میں آیا تو شیر شاہ کے آدمیوں نے اس کو پکڑ لیا۔ گھسیٹتے ہوئے شیر شاہ کے پاس لے گئے۔ شیر شاہ سخت غصے میں تھا۔ میون کو دیکھتے ہی کھڑا ہوا اور چابک سے میون کو مارنے لگا۔ میون تڑپتا رہا۔ چلاتا رہا۔ لیکن

بے رحم شیر شاہ کے کانوں میں جوں تک نہ رینگی۔ بڑی دیر مارنے کے بعد اس نے نفرت اور غصے سے کہا۔ ”تیری ہمت کیسے ہوئی کہ میری بیٹی کے لیے غلط خواب دیکھنے لگا تھا۔“

شیر شاہ نے اسے اتنا مارا تھا کہ جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”بڑے صاحب! خواب تو سب دیکھتے ہیں۔ بس کسی کسی کے نصیب میں ان خوابوں کی تعبیر لکھی ہوتی ہے۔ کیا معلوم میرے نصیب میں بھی ایسا ہی لکھا ہو۔“

یہ سن کر شیر شاہ کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ وہ ایک دم آگے بڑھا اور میون کو ٹھوکریں مارنے لگا اور گرج گرج کر بولا۔ ”ذلیل، کمینے! تیری بوٹی بوٹی کاٹ کے کتوں کو ڈال دوں گا۔ تجھے ایسا سبق سکھاؤں گا کہ آئندہ ایسا سوچتے ہوئے بھی خوف آئے گا۔“

میون کراہتے ہوئے بولا۔ ”آپ سب کچھ کر سکتے ہیں بڑے صاحب! لیکن پھر بھی میرے دِل سے سنبل کی محبت ختم نہیں کر سکتے۔“

اتنی مار کھانے کے بعد بھی میون باز نہیں آیا۔ تو شیر شاہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ گالیاں دیتے ہوئے، چیختے ہوئے میون پہ پل پڑا۔ اس کے کارندے بھی اپنے اعلیٰ افسر کو خوش کرنے کے لیے میون کو مارنے لگے۔ میون کو اتنی چوٹیں آئی تھیں کہ وہ بے دم ہو کر ایک طرف گر پڑا۔

شیر شاہ نے گرج گرج کر اپنے کارندوں سے کہا۔ ”اس حرامی کو لے جاؤ اور زندان میں ڈال دو اور تب تک پٹائی کرتے رہو جب تک عشق کا خناس دور نہ ہو جائے۔“

سپاہی اسے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے اور زندان میں ڈال کر دروازہ بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا۔ زندان میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس کے جسم کا ہر ہر حصہ دُکھ رہا تھا۔ ذرا سا ہلتا تو شدید ٹیسیں اُٹھنے لگتیں۔ وہ زندان کے اندھیرے میں کچے فرش پہ لیٹا رہا۔ اور آنکھیں بند کر کے جسمانی تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

دوسری طرف امان پور گاؤں میں رحمت جان کھیتوں سے آ کر کچھ دیر ستایا ہی تھا کہ گاؤں کے ایک شخص نے آ کر خبر کر دی کہ میون اعلیٰ افسر شیر شاہ کی قید میں ہے۔ رحمت جان یہ سن کر اتنا پریشان ہوا کہ اسی وقت دوڑتا ہوا گلاب پور روانہ ہوا۔ اسی طرح دوڑتے دوڑتے کسی جگہ رُکے بغیر وہ گلاب پور پہنچ گیا۔ بڑی کوششوں اور منت سماجت کے بعد اس کی ملاقات شیر شاہ سے کرائی گئی۔ شیر شاہ کا غصہ ابھی اُترا نہیں تھا۔ یہ خیال ہی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا کہ ایک چرواہے نے اس کے اعلیٰ خاندان کی اُجلی پیشانی پہ اپنا نام لکھوانے کی جسارت کی تھی۔ رحمت جان اس کے قدموں پہ گرا اور روتے ہوئے بیٹے کی رہائی کی فریاد کرنے لگا۔

شیر شاہ نے غصے اور نفرت سے کہا۔ ''اس طرح فریاد کرنے سے جرم معاف نہیں ہوتا۔ اگر بیٹے سے محبت تھی تو اچھی تربیت کرتے۔ دوسروں کی چاردیواری میں جھانکنے سے منع کرتے۔''

رحمت جان روتے ہوئے بولا۔ ''سرکار! وہ نا سمجھ ہے۔ اس دفعہ اسے معاف کر دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

اعلیٰ افسر شیر شاہ چند ثانیے سوچتا رہا پھر بولا۔ ''تمھارے بیٹے کو ایک شرط پہ رہائی مل سکتی ہے کہ وہ ریاستِ پونیال سے نکل جائے اور آئندہ کبھی بھی اس طرف نہ آئے۔''

رحمت جان یہ سن کر ساکت سا رہ گیا.......... اسے یوں لگا جیسے رگوں میں خون کی جگہ تیزاب دوڑنے لگا ہو۔ میون اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بڑی مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ وہ ایسا پیارا تھا کہ ماں باپ کی بوڑھی آنکھوں کی راحت اور ٹھنڈک تھا۔ اگر ذرا سی دیر کے لیے بھی نظروں سے دور ہوتا تو ہر سو اندھیرا سا چھا جاتا۔ لیکن اب ایک ایسا وقت بھی آیا تھا کہ اس کی جان بچانے کے لیے نظروں سے دور کرنا پڑ رہا ہے۔ رحمت جان نے گہرے صدمے اور کرب سے اعلیٰ افسر کو یقین دلایا کہ وہ میون کو وادیِ پونیال سے باہر بھیج دے گا۔ رحمت جان کی یقین دہانی پر اعلیٰ افسر نے میون کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ وہ زندان کی تاریکی سے آزاد تو ہوا لیکن یہ آزادی اس کے لیے اور اس کے ماں باپ کے لیے بہت قیامت خیز تھی۔ وہ خود تو رہا ہوا تھا مگر اس کی محبت سماجی مرتبے کی نا قابلِ گزر دیواروں کے بیچ قید ہو گئی تھی۔ اور اس کے ماں باپ کے لیے بے انت مسافتوں کا عذاب دے گئی تھی۔

ریاستِ گلگت میں میون کی خالہ رہتی تھی۔ رحمت جان نے بیٹے کو گلگت اس کی خالہ کے پاس بھیج دیا۔ گلگت بڑی ریاست تھی۔ پونیال سے زیادہ خوش حال اور بارونق تھی۔ مگر میون کی دُنیا ویران ہو گئی تھی۔ اس کا چین سکون لُٹ گیا تھا۔ کسی پل قرار نہیں ملتا تھا۔ بس دیوانوں کی طرح گلگت میں پھرتا رہتا۔ دریائے گلگت کے کنارے جا کر بانسری کی پُردرد آواز سے اپنے دُکھوں پر پھائے رکھتا۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ جُدائی کی آگ میں جلتا رہا۔ کئی دفعہ جی میں آیا کہ کچھ بھی ہو۔ گلاب پور جائے اور ایک بار سنبل کو دیکھ لے۔ مگر بوڑھے ماں باپ کی صورت آنکھوں کے سامنے آتی۔ اعلیٰ افسر کو معلوم ہوتا تو بوڑھے ماں اس کے عتاب سے نہیں بچتے۔ چناں چہ وہ دِل پہ جبر کیے صبر کرتا رہا۔ اس کا دوست مراد کبھی کبھار سنبل سے متعلق کوئی خبر لے کر آتا تھا۔ سنبل کا بھی بُرا حال تھا۔ میون کی جُدائی سے اس کا چاند چہرہ بھی گہنا گیا تھا۔ وہ اکثر بیمار رہنے لگی تھی۔

ایک دن مراد نے بتایا کہ اعلیٰ افسر نے ایک جگہ سنبل کا رشتہ طے کر دیا ہے اور ان سردیوں کے بعد

جب برف پگھلے گی تو اس کی شادی کر دی جائے گی۔ یہ سن کر میون تڑپ اُٹھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے سر پہ کوئی پہاڑ رکھ دیا گیا ہو۔ وہ اس کے نیچے کچلا جا رہا ہو لیکن جان باقی ہو۔ بس پہاڑ کے بوجھ کی اذیت سے بے دم ہوتا جا رہا ہو۔

وہ گہرے صدمے سے چور چور لہجے میں بولا۔ ”مراد! تم میرا یہ پیغام اس تک پہنچا دو۔ وہ میرا انتظار کرے۔ میں برف پگھلنے سے پہلے آؤں گا۔ اور اسے بھگا کر لے جاؤں گا۔“

مراد گہری ہمدردی سے بولا۔ ”میون! میں تمھارے درد کو سمجھتا ہوں۔ لیکن جو تم کہہ رہے ہو ایسا ممکن نہیں۔ اعلیٰ افسر کے گھر پہ ہر وقت سپاہیوں کا پہرہ رہتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں یہ آسان کام نہیں۔ لیکن میرے لیے یہ بھی آسان نہیں کہ چپ چاپ اپنی محبت کا جنازہ نکلتے دیکھوں۔ ہماری محبت میں طاقت ہے تو ہمیں ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

مراد اس کے جنون کو دیکھ کر بولا۔ ”فی الحال تم انتظار کرو۔ میں واپس جا کر حالات کا اچھی طرح جائزہ لے کر آؤں گا۔ تبھی کچھ سوچیں گے۔“

مراد چلا گیا۔ میون بڑی بے صبری سے دن گنتا رہا۔ چند دن بعد مراد لوٹ آیا۔ وہ بڑا بجھا بجھا سا اور افسردہ نظر آتا تھا۔ اس نے لیلیٰ کے ذریعے تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس نے بتایا کہ سنبل شدید بیمار ہے۔ جب سے اس کی شادی کا فیصلہ ہوا ہے اس کی صحت بگڑتی جا رہی ہے اور اب صورت حال یہ ہے کہ وہ بستر سے اُٹھ بھی نہیں سکتی۔ میون یہ سن کر ایسا بے قرار ہوا کہ اسی وقت گلاب پور جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مراد نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا اور جلد بازی میں اُٹھائے گئے کسی قدم سے باز رکھا۔ پھر اس نے بڑی دیر سوچنے کے بعد میون کا لباس اور حلیہ تبدیل کر کے اسے ایک فقیر کے بھیس میں بدل دیا۔

……

میون جب گلاب پور میں داخل ہوا تو شام کے سائے پھیل گئے تھے۔ سردی کا موسم تھا۔ سرِ شام ہی لوگ گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ اِکا دُکا لوگ نظر آ رہے تھے۔ میون کو پہچانے جانے کا خوف نہیں تھا۔ کچھ تو جنونِ شوق تھا۔ کچھ مراد نے اس کا حلیہ اس قدر تبدیل کرایا تھا کہ وہ ایک فقیر دکھائی دیتا تھا۔ وہ بڑے محلے میں آیا جہاں اعلیٰ افسر شیر شاہ کا گھر تھا۔ اس نے دیکھا اعلیٰ افسر کے گھر کے اندر اور باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھ لوگ اندر سے باہر نکل رہے تھے اور کچھ باہر سے اندر جا رہے تھے۔ اس کا دِل کسی خیال سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے بے تابی سے ایک شخص کا بازو پکڑ لیا اور اس ہجوم کے بارے میں پوچھا۔ اس شخص نے ایک نظر اس کے فقیری لبادے کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ”اعلیٰ افسر کی بیٹی شدید بیمار ہے۔ کافی دنوں سے اس کی صحت

یابی کے لیے صدقے کے طور پر کھانا دیا جا رہا ہے۔ آج تو حالت بہت زیادہ بگڑ گئی ہے۔ وہ آخری سانسیں لے رہی ہے۔ تم بھی اندر چلے جاؤ۔ کھانا کھا کے اس بے چاری کے لیے دُعا کرو۔"

میون نے یہ سنا تو تڑپ اُٹھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے مفلوج ہو گئیں۔ وہ ایک دم دوڑتا ہوا اعلیٰ افسر کے گھر میں داخل ہوا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ سب بہت ہی افسردگی سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

میون نے اِدھر اُدھر دیکھا اور زنان خانے کی طرف دوڑ پڑا۔ کچھ آگے بڑھا تھا کہ ایک شخص نے اسے پکڑا اور کہا۔ "او فقیر بابا! کھانا باہر تقسیم ہوتا ہے۔ اندر کہاں گھس رہے ہو؟"

میون نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور دیوانگی کے عالم میں اندر کی طرف دوڑ پڑا۔ پیچھے سے وہ شخص بھی دوڑنے لگا۔ وہ ایک دالان سے گزرا اور ایک کھلے دروازے سے اندر داخل ہو کر اپنے جذبات شینا زبان کے ان اشعار میں بیان کرنے لگا۔

ترجمہ:۔ "اے خدایا! اس صحرا جیسے پیاسے دِل کی یہ فریاد ہے۔ میں ایک بار اپنے محبوب کو دیکھ لوں۔ یہ صدیوں کی پیاس شاید بجھ جائے۔"

وہاں آس پاس موجود لوگ اسے کوئی دیوانہ سمجھ کر اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ وہ دیوانہ تو تھا ہی۔ بڑے ہی سوز سے گانے لگا۔

ترجمہ:۔ "اے میرے محبوب! دُنیا کے بے رحم رسم و رواج نے ہمیں دور کر دیا۔ تیری محبت کا داغ دِل میں لیے تیری جنت سے چلا گیا۔ کسی کافر کی طرح جدائی کی جہنم میں جلتا رہا۔"

اندر ایک کمرے میں سنبل، بسترِ مرگ پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ اس کے آس پاس قریبی رشتہ دار کھڑے تھے۔ تمام حکیم، طبیب عاجز آ چکے تھے۔ اب صرف دُعاؤں کا سہارا تھا۔ اس کی سانسیں ٹوٹ رہی تھیں۔ جسم ہلکے ہلکے جھٹکے کھا رہا تھا۔ دم توڑتی سانسوں کے درمیان اس کی سماعت میں میون کی آواز اور اشعار گھنٹیاں بجانے لگے۔ اس نے تڑپ کر سر اک ذرا اوپر اُٹھایا۔ آواز بھی وہی تھی۔ درد بھی وہی تھا۔ وہ اک جھٹکے سے بستر سے اُٹھ بیٹھی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

ترجمہ:۔ "اے میرے صبح کے ستارے! میں تمھاری جدائی میں زندگی سے جدا ہونے لگی ہوں اور تم میری بیمار پُرسی کے لیے اب طلوع ہو رہے ہو۔ جب میں ڈوب رہی ہوں۔"

میون نے جب سنبل کی آواز سنی تو تڑپ اُٹھا اور بے قرار ہو کر اردگرد موجود لوگوں کو دھکیلتا ہوا آواز کی سمت دوڑنے لگا۔ اس کمرے کے دروازے کے پاس جا کے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ پھر سنبھل کر کہنے لگا۔

ترجمہ:۔ "اے میری عبادت! میں تو پل پل تمہارا وظیفہ پڑھتا تھا۔ تم میرا صلہ تھیں۔ میری جنت

تھیں۔ مگر ہمیں جُدا کرنے والوں نے دوزخ کی آگ جلائی تھی راستے میں۔"

وہاں موجود لوگ پہلے تو میون کو دیوانہ سمجھ بیٹھے تھے۔ لیکن اس کا درد اور نغمۂ غم اشعار کی صورت میں ظاہر ہوا اور سنبل نے بھی جواب دیا تب اس کی اصلیت ظاہر ہوگئی۔ اعلیٰ افسر شیر شاہ میون کو پہچان کر غصے سے آگ بگولا ہوگیا اور گرج گرج کر اسے گالیاں دینے لگا۔ پھر اپنے سپاہیوں کو آوازیں دیں کہ دھکے دیتے ہوئے اسے باہر نکال دیں۔

سنبل پہ شدید نقاہت طاری تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ ٹوٹتی سانسیں کسی بھی وقت ساتھ چھوڑنے والی تھیں۔ وہ نحیف سی آواز میں پکاری۔ "بابا! خدا کے لیے صرف ایک بار میون کو میرے سامنے لائیں۔ میں اسے ایک آخری نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

وہاں موجود خاندان کے کچھ بزرگوں کا دِل سنبل کی فریاد سے پسیج گیا۔ انھوں نے شیر شاہ کو سمجھایا کہ سنبل کی یہ خواہش پوری ہونے دو۔ اعلیٰ افسر پہلے تو شدت سے انکار کرتا رہا۔ بالآخر ان بزرگوں کے زور دینے پر مان گیا۔ اور خود غصے سے پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔ سنبل کے اردگرد خاندان کے جو لوگ کھڑے تھے وہ بھی ایک طرف ہوگئے۔ میون ابھی تک دہلیز کے پاس زمین پر پڑا ہوا تھا۔ وہ اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا سنبل کے پاس آیا۔ بیماری کی وجہ سے سنبل ایسی کمزور ہوگئی تھی کہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ میون اس کی طرف یک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "سنبل، سنبل! یہ تمھاری حالت کیا ہوئی ہے؟ یہ کیسے ظالم لوگ ہیں؟ کسی کے دِل کی خوشی ان سے برداشت نہیں ہوتی"

سنبل پہ ایسی نقاہت طاری تھی کہ بولنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ لیکن میون کے آنے سے اس کے اندر ایک نئی توانائی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میون! تت..........تم آگئے۔ مجھے تیرا ہی انتظار تھا۔ بس تجھے دیکھ کر اب تو موت بھی بھاری نہیں ہوگی۔"

میون تڑپ کر بولا۔ "سنبل! ایسا مت کہو۔ تجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ اُداس سی مسکراہٹ سے بولی۔ "نہیں میون۔ مم.......... میرا وقت قریب آگیا ہے۔ مم.......... میں..........۔" بات کرتے کرتے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ شدتِ کرب سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

میون چیخ اُٹھا۔ "سنبل! آنکھیں کھولو سنبل! میں محبت کی طاقت بن کر آگیا ہوں۔ تجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

اس کے ہونٹ اِک ذرا کھلے۔ بڑی ہی دھیمی آواز ان ہونٹوں سے نکلی۔ "میں محبت کی طاقت مانتی

ہوں میون! میں بیماری میں زندگی کی نہیں موت سے پہلے تمھیں دیکھنے کی دعا کرتی تھی۔ یہ ہماری محبت کی طاقت ہی تو ہے، تم میرے پاس ہو۔ میں زندہ رہی تب بھی تمھاری نہیں بن سکتی۔ اس لیے مر کر کسی اور کی بننے کے عذاب سے محفوظ رہوں گی۔"

وہ اک ذرا خاموش ہوئی۔ کچھ دیر گہری گہری سانسیں لیتی رہی پھر میون کا ہاتھ پکڑ کر ٹوٹتی آواز میں بولی۔ "میون! بانسری ہے نا تمھارے پاس۔ میں آخری بار تیری بانسری کی آواز سننا چاہتی ہوں۔"

میون نے بڑے سے فقیری لبادے کے اندر سے بانسری نکالی۔ اس کا دِل درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

آنسو یوں بہہ رہے تھے جیسے بھری برسات کی رم جھم ہو۔ اس نے بچپن سے بانسری بجائی تھی اور دِل کو چھو لینے والی بے شمار دھنیں بنائی تھیں۔ لیکن اس وقت اس نے بانسری ہونٹوں سے لگائی تو یوں لگا جیسے بانسری نہ ہو، دِل نکال کر ہونٹوں سے لگایا ہو۔ دِل کے جذبات اور تڑپ کو بانسری کی آواز میں ڈھال کر ایسا سماں باندھ دیا کہ وہاں موجود تمام لوگ خود پہ قابو نہ رکھ سکے اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔ میون کی آنکھیں بند تھیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے سے آنسوؤں کی صورت میں جیسے کلیجہ کٹ کٹ کر نکل رہا تھا۔ اسی وقت کسی نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا اور چیخ کر کہا۔ "بس کرو میون! اب کسے بانسری سنا رہے ہو؟ تمھاری سنبل تو اب سننے کے قابل نہیں رہی ہے۔"

اس نے چونک کر سنبل کی طرف دیکھا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ خاندان کا ایک بزرگ اس کی کھلی آنکھوں کو بند کر رہا تھا۔ میون ساکت سا اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک دِل خراش چیخ اس کے اندر سے نکلی اور دِل کو چیرتی ہوئی حلق پھاڑ کر باہر نکلی۔ وہ تیورا کر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح سنبل کی پائنتی پہ گر گیا۔

…………………

گلاب پور کے لوگ اس واقعے کے بعد کافی عرصے تک راتوں کو ایک پُرسوز اور درد میں ڈوبی ہوئی بانسری کی آواز سنتے۔ اس کی آواز سن کر سب کے دِل درد سے جیسے پھٹ جاتے۔

وہ سب جانتے تھے کہ یہ بانسری کون بجا رہا ہے۔ کس کے دُکھ اس بانسری کی آواز میں ان وادیوں میں اور پہاڑوں میں بکھرے ہوئے ہیں؟ جو بھی اس آواز کو سنتا۔ دُکھ اور افسوس سے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیتا۔ تا کہ کرب اور صدمے کی شدت کم ہو۔ ہر صبح لوگ دیکھتے کہ سنبل کی قبر پہ تازہ پھولوں کا دستہ پڑا ہوا ہوتا۔

وقت گزرتا رہا۔ میون اور سنبل کی محبت کی داستان وادی میں پھیلتی گئی۔ میون ایک بے چین روح کی طرح وادیوں اور پہاڑوں میں اپنے دِل کو قرار دلانے کے لیے بھٹکتا رہا۔ بانسری کی آواز اور پھولوں سے اپنی سنبل کی محبت کو تازہ کرتا رہا۔

پھر ایک صبح لوگوں نے ایک دردناک منظر دیکھا۔ اس صبح سنبل کی قبر پہ تازہ پھولوں کا دستہ نہیں تھا۔ مرجھایا ہوا اور ٹوٹا پھوٹا میون مرا پڑا تھا۔ اس کے چہرے پہ عجیب سکون تھا۔ بالآخر اس بے قرار روح کو اپنی منزل مل گئی تھی۔

لوگوں نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ انھیں سکون سے نیند آئے گی۔ میون کی بانسری کی دردبھری آواز نے ان کی نینداور چین لوٹ لیا تھا۔

میون اور سنبل کی داستان تو ختم ہوئی لیکن کئی دہائیوں تک ان کا عشق زندہ رہا۔ اب بھی میون کی بانسری اور اس کے اشعار درد کی تفسیر بنے ان وادیوں اور پہاڑوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اب بھی کسی درد بھری آواز میں انھیں میون سنائی دیتا ہے۔ اور اب بھی لوگ کسی پُرسوز آواز والے کو میون کہہ کر پکارتے ہیں۔

☆☆☆☆

ا

گوجری تخلیق وترجمہ: احمد سلیم سلیمی

راجہ ترا خان

گئے وقتوں کی بات ہے۔ گلگت پر ایک راجا کی حکومت تھی۔ اس کا نام ترا ترا خان تھا۔ یہ بہت ہی بہادر اور بااثر تھا۔ راجہ ترا ترا خان پولو کا بہترین کھلاڑی اور ماہر شکاری تھا۔ پولو کے کھیل میں اس کی مہارت کا چرچا دور دور تک کوہستانی علاقوں میں تھا۔ وہ اکیلا کئی افراد کا مقابلہ کرتا تھا اور جیت جاتا تھا۔

ایک روز ترا ترا خان شکار کھیلنے پہاڑوں پہ گیا۔ اس کے چند دوست بھی ساتھ تھے۔ جنوبی سمت کے بلند وبالا پہاڑوں پر شکار کھیلتے ہوئے وہ وادی داریل کی طرف گئے۔ آج کے دور میں شاہراہِ قراقرم کی وجہ سے گلگت اور داریل کا سفر بہت آسان ہوگیا ہے۔ ورنہ اس زمانے میں گلگت سے داریل پہنچنے کے لیے پہاڑوں سے، جنگلوں اور برفیلے علاقوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اب بھی کئی مہم جو سیاح، شکاری اور چرواہے ان پہاڑی درّوں سے گزر کر داریل اور اس سے قریب ترین وادی تانگیر جاتے ہیں۔

وادیِ داریل کے اوپر ایک پہاڑی پہ راجہ ترا ترا خان نے ایک چکور پہ تیر چلایا۔ چکور زخمی ہو کر لڑکھڑاتا ہوا نیچے وادی کی طرف گیا۔ ترا ترا خان نے اپنے دوستوں سے کہا کہ چکور اس کے تیر سے زخمی ہوا ہے۔ اس لیے پکڑنے کو نیچے وادی میں وہ خود جائے گا۔ اس کے دوست اوپر پہاڑی پہ بیٹھے رہے اور راجہ ترا ترا خان پہاڑی سے اُتر کر وادی کی طرف آیا۔ وہ پہاڑی راستوں پہ چلتا ہوا، پتھروں کو پھلانگتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ ایک جگہ وہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔ وہاں ایک چھوٹی سی ندی کے پاس اسے ایک لڑکی دکھائی دی تھی۔ اس لڑکی کے ہاتھوں میں اس کا زخمی کیا ہوا چکور تھا۔ وہ لڑکی چکور کو پکڑے نیچے آبادی کی طرف جا رہی تھی۔ ترا ترا خان تیز تیز چلتا ہوا لڑکی کے قریب گیا۔ وہ لڑکی ایک اجنبی کو سامنے دیکھ کر اِک ذرا سہم کر رُک گئی۔ راجہ ترا ترا خان لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا:

"اے لڑکی! یہ چکور میرے تیر سے زخمی ہوا ہے۔ یہ میرے حوالے کر دو۔"

لڑکی تیز لہجے میں بولی: "تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تمھارے ہی تیر سے زخمی ہوا ہے۔ مجھے تو یہ ندی کے پاس زخمی حالت میں پڑا ہوا ملا ہے۔"

راجہ نے نرمی سے کہا: "دیکھو یہاں دور دور تک کوئی شکاری نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے یہ

تیر میں نے ہی چلایا ہے۔ “

لڑکی بے پروائی سے بولی: ”چلو مانتی ہوں یہ تمھارے ہی تیر سے زخمی ہوا ہے۔ لیکن ضروری تو نہیں کہ جس نے تیر چلایا ہے وہی اس کا مالک بنے۔ یہ مجھے ملا ہے اس لیے میرا ہی اس پر حق ہے۔ “

راجہ ترا ترا خان، دا ریل کی اس لڑکی کی بے باکی اور معصوم دلیل سے ایسا متاثر ہوا تھا کہ اس کی باتوں پہ اسے غصہ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بولا:

”یہ چکور تم لے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں شکاری ہوں مجھے اور شکار مل جائے گا۔ لیکن اسے ذبح کرنے دو۔ ایسا نہ ہو اس سے پہلے ہی یہ مر جائے۔ “

لڑکی نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر وہاں سے پلٹ کر دور وادی کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد خاموشی سے چکور اس کے حوالے کر دیا۔ راجہ ترا ترا خان نے شکاری چاقو سے چکور ذبح کیا پھر اسے لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

”میں ان پہاڑوں کے پیچھے بہت دور گلگت کی طرف سے آیا ہوں۔ شکار کھیلنا میرا شوق ہے۔ لیکن آج تک اس بات سے بے خبر تھا کہ پرندوں اور جانوروں کا شکاری کبھی خود بھی شکار ہو سکتا ہے۔ “

لڑکی اسے گھور کر دیکھتی ہوئی بولی: ”شکاری کے لیے یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔ اس علاقے میں بہت سی چڑیلیں ہیں۔ احتیاط کرو کسی کا شکار بن جاؤ گے۔ “ لڑکی یہ کہہ کر ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی نیچے وادی کی طرف جانے لگی۔

راجہ ترا ترا خان کھوئی کھوئی آنکھوں سے لڑکی کو نیچے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب لڑکی کافی دور چلی گئی تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ کچھ دیر بعد آبادی کے آثار دکھائی دیے۔ اور لڑکی آبادی کے آغاز میں ہی ایک بڑے سے مکان میں داخل ہو گئی۔ راجہ ترا ترا خان نے اس مکان کے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ کچھ نشانیاں نوٹ کیں۔ اور دل میں تمناؤں کا ایک ہجوم لیے واپس پہاڑی کے اوپر آیا۔ وہاں مخصوص جگہ پر اس کے دوست بڑی بے تابی سے اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔ اسے خالی ہاتھ دیکھ کر سمجھ گئے کہ چکور نہیں ملا ہے۔ اسے اداس اور کھویا کھویا دیکھ کر دوست اسے تسلی دیتے ہوئے بولے کہ ایک چکور کے ہاتھ نہ آنے سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ پہاڑوں پر بے شمار دوسرے شکار موجود ہیں۔ راجہ ترا ترا خان ان کی غلط فہمی پہ مسکرا دیا اور لڑکی سے ملاقات اور پھر اس کا شکار بننے کا ماجرا سنایا۔

دوست بولے: ”آپ گلگت کے راجا ہیں۔ آپ کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں، پھر ایک لڑکی کے لیے ایسی پریشانی کی ضرورت کیا ہے؟ “

راجہ بولا: ”بے شک میرے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سب سے الگ تھلگ ہوتے ہیں۔ ایسے میں باقی سب غیر اہم ہوتے ہیں۔ ہر طرف اس خاص ہستی کے جلوے ہوتے ہیں۔ داریل کی یہ لڑکی بھی میرے لیے خاص بن گئی ہے۔ اب اسے پانے کے لیے ہر طرح کا جتن کروں گا۔“

راجہ ترا ترا خان واپس گلگت آیا اور اپنے دو خاص مصاحبوں کو وادیِ داریل بھیج دیا۔ اور انھیں ہدایت کی کہ اس لڑکی کے بارے میں مکمل تفصیل لے کر آئیں۔ چند دن بعد اس کے بندے واپس آئے اور راجہ کو بتایا کہ لڑکی ایک خوش حال اور طاقتور خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے سات بھائی ہیں۔ پورے داریل میں ان جیسا بہادر اور کوئی نہیں۔ لڑکی کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔

یہ ساری تفصیل سن کر راجہ کو اطمینان ہوا کہ جسے گلگت کی رانی بنانے کا ارادہ کیا ہے وہ ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہے اور غیر شادی شُدہ ہے۔

آج کے دور کی طرح اس زمانے میں بھی وادیِ گلگت کو پورے کوہستانی علاقے میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں کا راجہ سب سے طاقتور اور خوش حال ہوا کرتا تھا۔

راجہ ترا ترا خان نے چند دن بعد اپنے کچھ وزیروں اور معزز لوگوں کو تحفے تحائف دے کر داریل بھیجا۔ اس کے آدمی داریل گئے اور لڑکی کے بھائیوں سے مل کر راجہ گلگت کے لیے لڑکی کا رشتہ مانگا۔ لڑکی کے بھائیوں کے لیے یہ بڑی حیرت اور خوشی کی بات تھی کہ گلگت کا راجہ ان کی بہن سے شادی کا خواہش مند ہے۔ انھوں نے یہ رشتہ منظور کر لیا۔ چند دن بعد راجہ ترا ترا خان، بڑی دھوم دھام سے داریل کی اس لڑکی کو گلگت کی رانی بنا کے لے آیا۔ جسے ایک ہی نظر دیکھنے کے بعد راجہ اپنے حواس گُم کر بیٹھا تھا اب وہ پل پل اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ راجہ ترا ترا خان پولو کا زبردست کھلاڑی تھا۔ ایک روز اس نے اپنی بیوی کے ساتوں بھائیوں کو پولو کھیلنے کی دعوت دی۔

روایت ہے اس زمانے میں پولو کا ایک کھیل اس طرح کھیلا جاتا تھا جس میں ہارنے والوں کو جان سے مار دیا جاتا تھا۔ پولو کا یہ کھیل قاتل کھیل کے طور پر مشہور تھا۔

رانیِ گلگت کے ساتوں بھائی گلگت آ گئے۔ شام کے وقت دربار سجا ہوا تھا۔ راجہ ترا ترا خان اپنی مہارت اور بہادری کے قصے سنا رہا تھا۔ اور دعوے سے کہہ رہا تھا کہ پورے کوہستانی علاقے میں اس جیسا ماہر کھلاڑی اور بہادر شخص کوئی نہیں۔ رانیِ گلگت کے بھائیوں نے راجہ ترا ترا خان کا بڑا بول سنا تو غیرت میں آ گئے اور وہ بھی بڑھ چڑھ کر پولو میں اپنی مہارت اور بہادری کے قصے سنانے لگے۔ بحث نے طول پکڑا۔ دونوں

طرف سے اپنی طاقت اور مہارت کے دعوے ہونے لگے اور بالآخر فیصلہ کیا گیا کہ پولو کا قاتل کھیل کھیلا جائے گا اور جیتنے والا اپنی جیت کا جشن ہارنے والوں کی لاشوں پہ منائے گا۔

دن مقرر ہوا اور دونوں طرف سے کھیل کی تیاری ہونے لگی۔ گلگت اور داریل میں اس کھیل کا چرچا ہوا اور دور دور سے لوگ اس قاتل کھیل کو دیکھنے گلگت کا رخ کرنے لگے۔ داریل سے بھی لوگوں کی ایک بڑی تعداد گلگت آ گئی تھی۔

مقررہ دن کھیل شروع ہوا۔ رانیِ گلگت کے ساتوں بھائی ایک طرف تھے اور راجہ ترا ترا خان دوسری طرف اکیلا۔ عام طور پر ان علاقوں میں پولو کھیل میں نو گول ہوتے ہیں۔ جو ٹیم پہلے نو گول کر لیتی ہے وہ جیت جاتی ہے۔ ماضی میں بھی نو گولوں پہ کھیل کا فیصلہ ہوتا تھا۔

پولو کھیل شروع ہوا۔ پہلے دن سورج غروب ہونے تک دونوں ٹیموں نے دو دو گول کیے۔ اندھیرا پھیل گیا تو کھیل دوسرے دن کے لیے ملتوی کیا گیا۔ اگلے روز بھی شام تک ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اس روز رانی کے بھائیوں نے پانچ گول کیے اور راجہ ترا ترا خان نے چار گول کیے۔ تیسرے دن بھی کھیل کا فیصلہ نہ ہوا اور آٹھ آٹھ گولوں سے کھیل برابر رہا۔ اگلے دن فیصلہ کن کھیل کھیلا جانے والا تھا۔ جیتنے والی ٹیم نہ صرف کھیل میں فتح یاب ہوتی بلکہ زندگی کی بازی بھی جیت لیتی۔ راجہ ترا ترا خان کی مہارت اور بازوؤں کی طاقت کا یہ بے مثل مظاہرہ تھا کہ اکیلے سات بھائیوں کا تین دنوں تک مقابلہ کرتا رہا تھا۔

چوتھے دن کا آغاز ہوا تو پورے گلگت میں ایک الگ ہی فضا تھی۔ ہر طرف سنسنی اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر کسی کا رُخ پولو کے میدان کی طرف تھا۔ آج گلگت کا راجا اپنے برادرانِ نسبتی سے فیصلہ کن بازی کھیلنے والا تھا۔ گلگت والوں کا دل اس خوف سے دھڑک رہا تھا کہ ان کا راجا اگر ہار گیا تو زندگی بھی ہار جائے گا۔

کھیل شروع ہوا۔ دونوں طرف کے حامی چیخ چیخ کر اپنی اپنی ٹیم کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ گلگت کے سارے لوگ چوں کہ راجہ کے طرف دار تھے اس لیے اس کے حق میں زبردست نعرے اور کلماتِ خیر گونج رہے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ کھیل میں جوش و خروش بڑھتا رہا۔ دونوں طرف سے اعلیٰ مہارت اور بے مثل بازوؤں کی طاقت کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ خاص کر راجہ گلگت نے ثابت کر دکھایا تھا کہ واقعی اس کے بازوؤں میں طاقت اور پولو کھیل میں مہارت حاصل ہے۔ پچھلے چار دنوں سے داریل کے ساتوں بھائیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہا تھا۔

دوپہر ہوئی۔ کوئی بھی گول نا کر سکا۔ کھیل روکا گیا۔ کچھ دیر آرام کے بعد دوبارہ کھیل کا آغاز ہوا۔

اور پھر کچھ دیر بعد راجہ ترا ترا خان کو گول کرنے کا ایک موقع مل گیا۔ اس کی مخالف ٹیم میں سے کسی کے پولو اسٹک سے ٹکرا کر گیند ہوا میں بلند ہوئی اور اڑتی ہوئی ترا ترا خان کی طرف آئی۔ ترا ترا خان نے لپک کر گیند ہوا میں ہی پکڑ لی۔

یاد رہے کہ گلگت اور آس پاس کے علاقوں میں پولو کھیل میں یہ اصول ہے کہ جب کوئی کھلاڑی گیند ہوا میں پکڑتا ہے وہ پولو اسٹک استعمال کیے بغیر بھی اسی طرح گیند ہاتھ میں پکڑے ہوئے، اپنے گھوڑے کو مخالف ٹیم کے گھیرے سے نکال کر گول پوسٹ کے قریب جا کر گیند ہاتھ سے پھینک کر گول کر لیتا ہے۔ پولو کھیل میں گیند ہوا میں پکڑ کر گول کرنا بازوؤں کی طاقت اور گھوڑے کی تیزی اور پھرتی کا مظہر ہوتا ہے۔ اور پولو کھیل کا ایک سنسنی خیز اور دلِ چسپ ترین مرحلہ ہوتا ہے۔

راجہ ترا ترا خان نے بھی جب گیند ہوا میں پکڑ لی تو جیسے ایک لمحے کو سب لوگ سانس لینا بھول گئے۔ دوسرے لمحے گلگت والوں نے ہوش میں آ کر داد و تحسین سے پولو کے میدان کو جیسے محشر کا میدان بنا دیا۔ راجہ ترا ترا خان گیند ہاتھ میں لے کر مخالف گول کی طرف بڑھنے لگا۔ ساتوں بھائی اسے گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگے۔ کھیل کا فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ ترا ترا خان بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو رانیِ گلگت کے ساتوں بھائیوں کی جان نہ بچتی۔ وقت گزرتا رہا۔ گھوڑوں کی پھرتی اور بازوؤں کی طاقت کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ راجہ جس طرف گھوڑا بھگا کر لے جاتا، ساتوں بھائی اسے گھیرے میں لے کر گول کی طرف جانے کا راستہ روک لیتے۔

اور پھر اچانک راجہ ترا ترا خان نے اپنا چابک لہرا کے گھوڑے کی پشت پہ دے مارا۔ گھوڑے کی لگام کھینچ کر اس کی پشت پہ الف کھڑا ہو گیا۔ پھر لوگوں نے جوش و خروش اور چیخ و پکار کے درمیان دیکھا کہ راجہ کا گھوڑا جیسے ہوا کی مانند مخالف گول پوسٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ساتوں بھائی جان توڑ کوشش کے باوجود اسے پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ راجہ ترا ترا خان گول پوسٹ کے پاس گیا اور اپنا ہاتھ لہرا کے لوگوں کو گیند دکھاتے ہوئے گول کے اندر پھینک دیا۔ اس گول کے ساتھ ہی راجہ ترا ترا خان کھیل جیت گیا۔ ساتھ ہی زندگی کی بازی بھی جیت لی۔ گلگت والوں نے زبردست جشن منایا۔ میدان میں اتر کر راجہ کو کندھوں پہ اٹھایا اور دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔ ان کا راجہ فتح یاب ہوا تھا۔ اس نے کھیل کے ساتھ زندگی کو بھی ہارنے سے بچایا تھا اور اب دستور کے مطابق راجہ ترا ترا خان کو اپنی محبوب رانی کے بھائیوں کو قتل کرنا تھا۔ راجہ کو اپنی رانی کا خیال تو آیا مگر رواج ایسے سخت تھے کہ وہ مجبور ہوا اور اپنے ساتوں برادرانِ نسبتی کے اپنے ہاتھوں سے سر قلم کر دیے۔

جب رانیِ گلگت کو یہ خبر ملی تو اسے سخت دکھ ہوا۔ بھائیوں کا قتل اس کو ناقابلِ برداشت غم اور غصے میں مبتلا کر گیا۔ اس میں ہمت تو نہ تھی کہ راجہ سے احتجاج کرتی، اس سے اپنے غم و غصے کا اظہار کرتی۔ مگر دل ہی دل

میں ماتم کرتی رہی اور قسم کھائی کہ راجہ ترا ترا خان سے اپنے بھائیوں کے قتل کا بھیانک انتقام لے گی۔

داریل کے تہذیبی رویے ماضی بعید سے ہی بڑے بے رحم رہے ہیں۔ اس سماج میں قتل کا بدلہ معافی نہیں۔ آج بھی علم اور عقل کے پھیلاؤ کے اس دور میں پشتوں تک بدلے کا زہر پھیلا رہتا ہے۔ عشروں تک بہت سے مرد اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ اور متعدد واقعات ہوئے ہیں جب عورتیں بھی اس دشمنی کا شکار ہو کر قتل بھی ہوئی ہیں، قاتل بھی کہلائی ہیں۔ اور یہ تہذیبی رویے زمانہ قدیم سے داریل کی مٹی کا خاصا رہے ہیں۔

راجہ ترا خان کی اس لوک کہانی میں بھی رانی کا وہ رُوپ نظر آتا ہے جس کا خمیر داریل کی منتقم مزاج مٹی سے اٹھا تھا۔ اس نے ایک دن موقع پا کر راجہ کے کھانے میں سنکھیا ملا دیا۔ سنکھیا کھا کے راجہ مر گیا۔ اس کے مرتے ہی رانی نے تخت گلگت پر قبضہ کر لیا۔ سب لوگ اس کے تابع فرمان بن گئے۔ اسے اپنی ملکہ بنالیا۔

ملکہ بننے کے کچھ عرصہ بعد ہی اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس بچے کا نام، باپ کے نام کی مناسبت سے ترا خان رکھا گیا۔

عورت کے لیے بچے کی پیدائش بہت زیادہ مسرت کی بات ہوتی ہے۔ مگر رانی کو مسرت کے بجائے دکھ ہوا۔ وہ اپنے بھائیوں کے قتل کو بھولی نہیں تھی۔ راجہ ترا ترا خان کو زہر دے کر بھی اس کے غصہ اور انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تھی۔ اب اسی قاتل راجہ کا بیٹا پیدا ہوا تو رانی کو خوشی نہ ہوئی بلکہ یہ صدمہ ہوا کہ وہ ایک قاتل کے بیٹے کی ماں بن گئی ہے۔ بھائیوں کے قتل نے نفرت اور غصے کی ایسی آگ لگائی تھی اس نے فیصلہ کیا کہ اسے بھی ختم کر دے گی۔ بعد میں اس نے یہ ارادہ تبدیل کیا۔ وہ دشمن کا بیٹا تھا مگر اس کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اس لیے ماامتا کا جوش اتنا اثر کر گیا کہ اسے جان سے نہیں مارا، اپنے سے دور کر دیا۔

ہوا یوں کہ پیدائش کے سات دن بعد رانی نے ایک لکڑی کے صندوق میں بچے کو بند کر دیا۔ اس کے ساتھ سونے سے بھری دو پوٹلیاں بھی صندوق میں رکھ دیں۔ ایک رقعہ بھی بچے کے سینے پہ رکھ دیا۔ جس میں لکھا تھا کہ یہ بچہ جس کو بھی ملے۔ اسے اپنا بیٹا بنا لے۔ سونے کی ایک پوٹلی سے اس بچے کی پرورش کرے، دوسری پوٹلی انعام کے طور پر خود رکھ لے۔ اس کے بعد اپنے خاص خادموں کے ذریعے اس صندوق کو دریائے گلگت میں بہا دیا۔ صندوق دریائے گلگت کی لہروں پہ ڈولتا ہوا، پتھروں سے ٹکراتا ہوا گلگت کے شمال مشرق کی طرف لبِ دریا ایک گاؤں اوش کھنداس پہنچ گیا۔

کہا جاتا ہے آج دریائے گلگت کے اُس پار وادیِ دنیور کے قریب موجود گاؤں اوش کھنداس قدیم زمانے میں بَل داس کہلاتا تھا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق گلگت کے سامنے ذرا سا شمال مغرب کی جانب، آج جو آبادی دریا کنارے سکارکوئی کے نام سے معروف ہے وہ اُس زمانے میں بَل داس کہلاتی تھی۔ اس

کہانی میں رونما ہونے والے بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوسری روایت یعنی سکارکوئی کا قدیم نام بل داس ہونا قرینِ قیاس زیادہ لگتا ہے۔

کہا جاتا ہے پہلے زمانے میں گلگت کی آبادی نیچے میدانی علاقوں میں نہیں تھی۔ سارے لوگ گلگت کے چاروں طرف جو بلند بلند پہاڑ ہیں ان کے دامن میں رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس دور کے لوگ بڑے وحشی اور جنگ جُو تھے۔ ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے پر حملہ آور ہوتے تھے۔ لوٹ مار مچاتے، کشت وخون کا بازار گرم کرتے تھے۔ اس لیے حفاظتی نکتہ نظر سے سب لوگ بالائی علاقوں میں راجا کے قلعے کے قریب رہائش رکھتے تھے۔ اسی لیے گلگت بلتستان میں جتنے بھی قلعے موجود ہیں وہ کسی پہاڑی پہ یا پھر کسی ٹیلے پہ بنے ہوئے ہیں۔ اور رعایا بھی قلعے کے آس پاس رہتی تھی۔ مقامی زبان میں اس آبادی کو کوٹ کہا جاتا تھا۔ اب بھی اسی مناسبت سے بہت سے قدیم کوٹ موجود ہیں۔

جب رانی نے اپنا بچہ دریا بُرد کر دیا تو وہ بہتا ہوا گلگت سے کچھ فاصلے پر شمال مشرق کی جانب گاؤں اوش کھنداس پہنچ گیا۔ اس گاؤں میں ایک زرگر تھا۔ اس کا نام گڑوس تھا۔ اس کے چھ بیٹے تھے۔ وہ دریا کے قریب رہتے تھے۔ دریا سے سونا نکالتے تھے۔ اس طرح اپنی گزر بسر کرتے تھے۔

دریا سے سونا نکالنے کا کام اب بھی ہوتا ہے۔ یہ ہر کوئی نہیں کرتا۔ ایک خاص قوم اس پیشے سے منسلک ہے۔ یہ قوم کو سونی وال کہلاتی ہے۔ جو کہ ممکنہ طور پر سنار سے نکلا ہے۔ سماجی طور پر انھیں ادنیٰ ذات کا تصور کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ دریا کے ساتھ ساتھ یہ خیمہ زن رہتے ہیں۔ دریا کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ اپنی جگہ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ بہ ظاہر ان کا پیشہ سونا نکالنا ہوتا ہے مگر معاشی لحاظ سے ہمیشہ بدحال رہتے ہیں۔ اور جسمانی لحاظ سے کم زور اور کم رُو...

زرگر گڑوس اور اس کے بیٹے اس دن حسبِ معمول سونا نکال رہے تھے۔ جانوروں کی کھال میں ہوا بھر کر، اوپر لکڑی کے تختے جوڑ کر کشتی بنائی تھی۔ اس پہ بیٹھ کر دریا کی لہروں سے لڑتے، کبھی گہرے پانی میں اور کبھی اُتھلے پانی میں سونے کی تلاش کرتے تھے۔ اس دن دوپہر تک انھیں ذرا سا بھی سونا نہیں ملا تھا۔ مگر ان کی قسمت میں آج کچھ اور تھا۔ وہ مایوس ہو کر واپسی کا سوچ رہے تھے اسی وقت ان کی نظر صندوق پر پڑی۔ وہ لہروں پہ ڈولتا ان کی طرف آ رہا تھا۔ زرگر گڑوس اور اس کے بیٹوں نے صندوق پکڑا۔ وہ بہت خوش تھے کہ قدرت کی طرف سے ان کی مدد کی گئی ہے۔ شاید صندوق میں ان کے لیے سونا چاندی بھجوایا گیا ہے۔ انھوں نے ہنستے ہوئے صندوق کو باہر نکالا اور چھپا کر اپنے گھر لے آئے۔ انھوں نے احتیاط سے صندوق کھولا۔ صندوق میں ان کی توقع کے برعکس ایک خوبصورت نوزائیدہ بچہ ہمک رہا تھا۔ جسے دیکھ کر زرگر گڑوس اور اس

کے بیٹے شدید حیران ہو گئے۔ بچے کے ساتھ سونے کی دونوں تھیلیاں اور رانی کا لکھا ہوا رقعہ بھی انھیں ملا۔ انھیں پڑھنا نہیں آتا تھا۔ وہ لکھے ہوئے کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ کسی پڑھے لکھے شخص کو بھی اس خوف سے نہیں دکھایا کہ کہیں سونا ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ ساتھ ہی سونے کی تھیلیاں پا کر انھوں نے ہر اندیشہ جھٹک دیا۔ چند دن انتظار کیا۔ مگر کوئی بھی باہر کا فرد اس بچے کو تلاش کرتے ہوئے نہیں آیا۔ پھر اسے اپنا بنا لیا۔

زرگر گڑوس کی بیوی، اس بچے کو پا کر بہت خوش تھی۔ اس بڑھاپے میں ایک نہایت خوب صورت لڑکا اپنے لیے قدرت کا تحفہ سمجھتی تھی۔ وہ جی جان سے اس کی پرورش کرنے لگی۔

ان کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ کئی کئی دفعہ فاقوں سے دن گزرتے تھے۔ مگر اس بچے کے ملنے کے چند ہی دن بعد ان کی حالت بدلنے لگی۔ بچے کے ساتھ موجود سونا انھوں نے حفاظت سے ایک جگہ دفن کر دیا۔ اور بہت احتیاط سے نکال نکال کر خرچ کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں دریا سے بھی پہلے کی نسبت زیادہ سونا ملنے لگا۔ ان کے پاس چند بکریاں تھیں ان کا دودھ بھی بڑھ گیا۔ زرگر گڑوس اور اس کے بیٹے جب مچھلیوں کے لیے جال ڈالتے تو جیسے سارے دریا کی مچھلیاں ان کے جال کی طرف دوڑنے لگتیں۔ کچھ ہی عرصہ بعد وہ اوش کھنداس کے اچھے کھاتے پیتے لوگ بن گئے۔ پہلے محرومیاں اور مایوسیاں تھیں اب آسائش اور سکون کا دور دورہ ہوا۔ شروع میں تو انھیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کایا پلٹ کی وجہ کیا ہے؟ پھر آہستہ آہستہ جان گئے کہ دریا میں ملنے والا بچہ ان کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا ہے۔

دن گزرتے گئے۔ ان کی خوش حالی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ترا خان جو کہ رانیِ گلگت کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا۔ دریا کی لہروں پہ تیرتا اوش کھنداس آیا تھا۔ شاہی خاندان کا چشم و چراغ اب سونی وال قبیلے میں پروان چڑھ رہا تھا۔ وہاں اسے جان کا نام دیا گیا۔

……

سولہ برس کا عرصہ گزر گیا۔ اس وقت تک زرگر گڑوس مر گیا تھا۔ اس دوران اس کی بوڑھی بیوی نے ترا خان کو سب کچھ بتا دیا تھا کہ وہ ایک صندوق میں بند، دریا میں بہتا ہوا کہیں سے آیا تھا۔ جان (ترا خان) کی شکل و صورت بھی باقی بھائیوں سے مختلف تھی۔ وہ واضح طور پر کسی اعلیٰ نسل کا خون لگتا تھا۔ بچپن میں ہی اس کی صورت میں ایسی وجاہت اور وقار تھا کہ بلداس کے لوگ رعب کی وجہ سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔

جان (ترا خان) جب سولہ برس کا ہوا تو ایک روز اس نے بوڑھی ماں سے دریا کے اس پار، بہت فاصلے پر واقع گلگت جانے کی خواہش کی۔ بوڑھی عورت اور اس کے بیٹے اس خوف میں تھے کہ ایک بار جان

گلگت چلا گیا تو پھر واپس نہیں آئے گا۔ چناں چہ انھوں نے ٹال مٹول سے کام لیا۔

جان کا اصرار بڑھتا رہا۔ اس نے زرگر کی بیوی سے کہا۔ ''ماں! میں گلگت ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہا ہوں۔ میں صرف گلگت دیکھنا چاہتا ہوں اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

بوڑھی عورت روتے ہوئے بولی: ''جان! تم نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا ہے۔ مگر ہمیشہ اپنے بیٹوں سے بڑھ کر تمھیں چاہا ہے۔ اگر تم واپس نہیں آئے تو یہ بوڑھی ماں مر جائے گی۔''

ترا خان نے انھیں یقین دلایا کہ جلد واپس آئے گا۔ بوڑھی ماں کو پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اس شرط پر اجازت دی کہ دو بھائی بھی اس کے ساتھ جائیں گے۔

اگلی صبح وہ گلگت کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ماں نے ان کے لیے خشک خوبانی، اخروٹ، بادام اور خوبانی کی گریاں ایک پوٹلی میں باندھ دیں۔ اس کے علاوہ مقامی طرز کی موٹی روٹی ''چھوپٹی'' بھی زادِ راہ کے طور پر ایک کپڑے میں باندھ کر ان کے حوالے کی۔ اوش کھنداس کے مغربی سمت دریائے گلگت کے بہاؤ کے مخالف سمت وہ چلتے گئے۔ شام کے وقت وہ بل داس (آج کی وادی سکارکوئی) پہنچ گئے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا اُس وقت گلگت اور آس پاس کی آبادی حفاظتی اقدام کے طور پر بالائی علاقوں میں رہتی تھی۔ بل داس کی بھی زیادہ تر آبادی اوپر پہاڑ کے دامن میں رہتی تھی۔ نیچے لبِ دریا کی ہموار جگہ پر فصلیں اگاتے تھے۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے کچھ کاشت کار مکان بنا کے وہاں رہتے تھے۔ ترا خان اور دونوں بھائیوں نے بل داس کے ہموار اور سر سبز علاقے کو دیکھا تو فیصلہ کیا کہ رات یہاں گزار کر اگلے دن دریا کے اس پار گلگت کی طرف روانہ ہوں گے۔ وہاں انھوں نے ایک مقامی کاشت کار سے تعلق بنایا اور اس کے مہمان بن گئے۔ اگلے دن انھوں نے گلگت جانے کی بات کی تو کاشت کار نے اجازت نہیں دی۔ وہ ترا خان کی خوب صورت باتوں اور باوقار چہرے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ کچھ دن مزید اپنا مہمان بنانا چاہتا تھا۔ اس کا اصرار اور خلوص دیکھ کر ترا خان اور اس کے بھائی رک گئے۔

انھی دنوں گلگت کی رانی جو کہ جان (ترا خان) کی ماں تھی۔ شدید بیمار ہو گئی۔ دور دور سے حکیم اور طبیب گلگت بلائے گئے اور رانیِ گلگت کا علاج معالجہ ہونے لگا۔ مگر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بیماری میں شدت آتی گئی اور بچنے کا امکان معدوم ہوتا گیا۔

جب رانیِ گلگت کے زندہ رہنے کی امید ختم ہوئی تب اراکینِ حکومت اور علاقے کے معتبر لوگ اس فکر میں پڑ گئے کہ رانی کے بعد گلگت کا حکمران کون ہوگا؟ کیوں کہ رانی نے دوسری شادی نہیں کی تھی اور اس کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ اور شاہی خاندان کا کوئی دوسرا فرد بھی ایسا نہیں تھا کہ گلگت کا حکمران بن جاتا۔ وزرا اور

امراس الجھن میں تھے کہ ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔

ہوا یوں کہ رانی کے محل کے باغ میں جب صبح صبح مرغ اذان دینے لگا تو بجائے ککڑوں کوں بولنے کے انسانی آواز میں کہنے لگا۔

''بلداس تھم ئی۔''

مقامی بولی میں اس کا مطلب تھا کہ بلداس کے علاقے میں راجہ موجود ہے۔

پہلے دن جب لوگوں نے یہ آوازیں سنیں تو سخت متعجب ہوئے مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ دوسرے دن بھی مرغ بجائے اپنی بولی کے یہی پیغام دینے لگا۔ تب ایک دوراندیش وزیر اس جملے کے اندر پوشیدہ مفہوم کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اس نے فوراً اراکینِ حکومت سے مشورہ کیا اور کچھ لوگوں کو بلداس کی طرف بھیج دیا۔

جب گلگت سے لوگ بلداس پہنچ گئے تو اس وقت جان (ترا خان) اور اس کے دونوں بھائی ایک کھلے میدان میں نوجوانوں سے کشتی لڑ رہے تھے۔ دونوں بھائی تو کچھ ہی دیر میں تھک کر مقابلے سے الگ ہو گئے جب کہ ترا خان کم سن ہونے کے باوجود بلداس کے کڑیل جوانوں کا بڑی پامردی سے مقابلہ کرتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد گلگت سے آئے ہوئے لوگ اور بلداس والوں نے حیرت سے دیکھا کہ سولہ سال کا جان اپنے سے بڑی عمر کے ہٹے کٹے جوانوں کو پچھاڑ رہا تھا۔ مقابلہ ختم ہوا۔ ترا خان کے بھائیوں نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھایا اور خوشی سے ناچنے لگے۔

گلگت سے آئے ہوئے درباری لوگ ان تینوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی شکل و صورت سے مقامی نہیں لگتے تھے۔ خاص کر جان (ترا خان) ایسا خوب رو اور جاذب نظر تھا کہ کسی بھی طرح بلداس کا نہیں لگتا تھا۔ گلگت کے وفد کے سربراہ نے جب ان سے استفسار کیا تو انھوں نے بتا دیا کہ وہ اوش کھنداس سے آئے ہیں۔ گلگت جانا چاہتے ہیں۔ گلگت کا وفد انھیں اپنے ساتھ گلگت لے آیا۔ اور رانیِ گلگت کے سامنے پیش کیا گیا۔ رانیِ گلگت بستر مرگ پر تھی۔ اس کی نظر جوں ہی جان (ترا خان) پر پڑی وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی۔ جان کی صورت راجہ ترا ترا خان سے ملتی تھی۔ جسے رانی نے اپنے بھائیوں کے قتل کے بدلے میں سنکھیا کھلا کر مار ڈالا تھا۔ اور اس کے بیٹے کو دریا برد کر دیا تھا۔

رانی نے جان سے اس کے بارے میں پوچھا۔ جان نے بتا دیا کہ اس کے اصل ماں باپ کون ہیں؟ کہاں سے ہیں؟ اسے معلوم نہیں۔ پیدا ہوتے ہی اسے صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈالا گیا تھا۔ اور وہ دریا میں بہتا ہوا اوش کھنداس پہنچ گیا تھا۔

جب رانیِ گلگت نے یہ سنا تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ جان پر پہلی نظر پڑتے ہی اس کے اندر

کھلبلی مچی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنا خون ہزار پردوں کے پیچھے بھی اچھل کود مچاتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی اسے ماتا کی قوت نے اشارہ کر دیا تھا کہ یہ اس کی کوکھ جنا ہے۔ اور جب جان نے بھی اپنے بارے میں وہ ساری باتیں بتائیں جن کا مرکزی کردار وہ خود رہی تھیں۔ اس لیے شک بالکل نہیں رہا۔ وہ بستر مرگ سے اٹھی اور ایک دم جان کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور روتے روتے بتانے لگی کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔ رانی نے سب کے سامنے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ اس نے راجہ تراترا خان کے ظلم کے بدلے میں، اس کے بیٹے کو انتقام کا نشانہ بنایا تھا۔ اپنے غصے کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے اسے دریا برد کر دیا تھا۔

جب ترا خان کو معلوم ہوا کہ رانی گلگت اس کی اصل ماں ہے تو اسے بے طرح مسرت ہوئی۔ رانی بھی بیٹے کو پا کر اتنی خوش ہوئی کہ ایک ہی دن میں اس کی بیماری ختم ہوئی۔

اگلے دن رانی نے دربار سجایا۔ تمام امرا اور وزرا کی موجودگی میں اعلان کیا کہ آئندہ گلگت کا حاکم ترا خان ہوگا۔ اور باقاعدہ اسے تخت پر بٹھا کے سارے اراکین حکومت سے اس کی بیعت لی گئی۔ ترا خان نے اوش کھنداس سے اسے پالنے والی بوڑھی ماں اور بھائیوں کو بھی بلایا۔ پہلے کی طرح انھیں ماں اور بھائیوں کا درجہ دیا اور اپنے ساتھ قلعے میں ہی رکھنے لگا۔

اس طرح ترا خان بڑی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنے کے بعد بالآخر گلگت کا راجہ بن گیا۔ کہا جاتا ہے اس نے بڑی شان و شوکت اور دبدبے سے گلگت پر ایک طویل عرصے تک حکومت کی تھی۔

☆☆☆☆

گوجری تخلیق وترجمہ: احمد سلیم سلیمی

کارگاہ بدھا-یَچَھنی

گلگت کے جنوب مغرب میں نپورہ نام کا ایک گاؤں ہے۔ اِس گاؤں کے ساتھ ہی وادی کارگاہ کے پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ اِنہی میں سے ایک پہاڑی پہ ایک عورت کا مجسمہ بنا ہوا ہے۔ یہ مجسمہ زمین سے تقریباً تیس فٹ بلند ہے۔ بلاشبہ یہ مجسمہ قدیم زمانے میں بنایا گیا ہے۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ کبھی اِس علاقے میں بدھ مت کے ماننے والے رہتے ہوں گے۔ اِس مجسمے کو مقامی زبان میں یچھنی کہتے ہیں۔ یہ محض ایک مجسمہ ہی نہیں۔ اپنے دامن میں بہت سی روایات اور واقعات چھپائے آج بھی بڑی شان سے ایستادہ ہے۔ باہر سے آنے والوں کے لیے گلگت میں یچھنی سے بڑھ کر دِلچسپی اور حیرت کی کوئی دوسری چیز نہیں۔ یچھنی کے نیچے کافی گہرائی میں ایک نالہ بہتا ہے۔ گرمی کے موسم میں اِس نالے میں بہت پانی ہوتا ہے۔ اوپر پہاڑوں کی گود سے بہنے والے اِس پانی کا رنگ نیلگوں ہے۔ جب تیزی سے پتھروں سے ٹکراتا ہوا یہ پانی نشیبی علاقے کی طرف بہتا ہے تو اِس کے چھینٹے دُور دُور تک اُڑ کر جاتے ہیں اور پانی اِس زور سے پتھروں سے ٹکراتا ہے کہ اِس کا نیلگوں رنگ تبدیل ہو جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے فرہاد نے کوہِ بے ستون کھود کر دودھ کی نہر نکالی ہو۔ سیاحوں کے لیے اِس جگہ بڑی کشش ہے۔ بہادر قسم کے سیاح تو مہم جوئی کے شوق میں نالہ پار کر جاتے ہیں لیکن زیادہ تر سیاح دوسری طرف سے ہی یچھنی کا نظارہ کرتے ہیں۔ تصاویر کھینچتے ہیں اور ایک یادگار سمجھ کر مدتوں اِس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ کوریا، جاپان، ہانگ کانگ اور چین وغیرہ کے سیاح تو باقاعدہ اپنے مخصوص انداز میں اِس کی عبادت بھی کرتے ہیں۔ سردیوں میں جب نالے کا پانی خشک ہوتا ہے تو سیاح، یچھنی کے قریب جاتے ہیں۔ اِس کے نیچے گھاس کا ایک ہموار قطعہ ہے۔ وہاں بیٹھ کر تصویر کشی کرتے ہیں۔

اِس مجسمے سے متعلق گلگت میں ایک لوک کہانی مشہور ہے۔

کہا جاتا ہے قدیم زمانے میں یچھنی زندہ تھی۔ اِس کا تعلق دیووں کی نسل سے تھا۔ بعض روایات کے مطابق گلگت کے ایک ظالم، آدم خور راجہ شری بدت کی بہن تھی۔

یچھنی بھی بہت ہی ظالم اور آدم خور تھی۔ نپورہ کے اوپر ہپوکر کی پہاڑی پر رہتی تھی۔ جہاں شری بدت کا بھی قلعہ تھا۔ گلگت کے لوگ جب نپورہ کے پہاڑوں پر شکار کے لیے یا لکڑیاں لانے کے لیے چلے جاتے

تھے تو یچھنی انھیں پکڑ کر اپنے غار میں لے جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے اگر دو افراد جنگل کی طرف جاتے تو ایک کو یچھنی کھا لیتی تھی اور دوسرے کو چھوڑ دیتی تھی۔ اِسی طرح چار میں سے دو کو اپنا شکار بنا لیتی۔ اِس کے علاوہ اماوس کی راتوں میں اُس کے اندر ایسی شکتی پیدا ہوتی کہ پہاڑی سے ہی اپنا ہاتھ بڑھا کر نیچے گلگت کے گھروں سے نوزائیدہ بچوں کو اُٹھا لیتی۔ اُس یچھنی کی وجہ سے گلگت کے لوگ بہت پریشان تھے۔ اُن کا سکون ختم ہوا تھا۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ یچھنی کو ختم کرنے یا اُس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ گلگت سے کوسوں دُور شمال مشرق کی طرف ایک گاؤں بگروٹ کہلاتا ہے۔ وہاں سے ایک لڑکا اور لڑکی گلگت اپنے رشتہ داروں سے ملنے آئے۔ اُن کی ابھی ابھی شادی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ شام کے وقت اُنہوں نے اپنے رشتہ داروں سے نپورہ نالہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُن کے رشتہ داروں نے خبردار کرتے ہوئے بتایا کہ زیادہ بلندی کی طرف مت جائیں اور بہت دُور نیچے سے ہی واپس آ جائیں۔ ورنہ یچھنی کی نظر پڑی تو اپنا شکار بنا لے گی۔ اُن دونوں نے یقین دہانی کرائی اور رشتہ داروں سے رخصت ہو کر نپورہ نالے میں آ گئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ نیلگوں پانی تیزی سے پتھروں سے ٹکراتا ہوا، جھاگ پیدا کرتا ہوا نشیب کی طرف گر رہا تھا۔ پانی کے اُڑتے ہوئے چھینٹوں سے سورج کی کرنیں ٹکرانے سے یوں لگتا تھا جیسے پانی کی دیویاں موتی اُچھال رہی ہوں۔ اُنہوں نے پہلے ایسا دلکش منظر نہیں دیکھا تھا وہ بے خودی کے سے عالم میں نالے کے ساتھ چلتے رہے اور انھیں پتہ ہی نہ چلا کہ وہ یچھنی کی حدود میں آ گئے ہیں۔

یچھنی اپنے غار میں بیٹھی تھی۔ اچانک اسے انسانی بو محسوس ہوئی۔ وہ ایک دم اپنے غار سے باہر آئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیچے دیکھنے لگی۔ اُس کی نظر نیچے کچھ فاصلے پر موجود دو انسانوں پر پڑی۔ وہ بہت خوش ہوئی اور ایک دم چھلانگ لگا کر اُڑتی ہوئی اُن کے سامنے گئی۔ بگروٹ کا وہ جوڑا وہاں کے دِل کش مناظر میں کھویا ہوا تھا جب اُنہوں نے اپنے سامنے اچانک ایک بھیانک مخلوق کو دیکھا تو خوف سے گھگی بندھ گئی۔ اُن کے ہوش و حواس جاتے رہے، بس وہ ساکت سے ہو کر رہ گئے۔ یچھنی مکروہ انداز میں ہنستی ہوئی بولی۔ “بڑے دنوں سے بھوکی تھی۔ آج تم ہاتھ آئے ہو، خوب مزے اُڑاؤں گی۔”

اُن دونوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ نہ اپنی جگہ سے حرکت کر رہے تھے نہ ہی کچھ بول رہے تھے۔

یچھنی نے اپنے بڑے بڑے ہاتھ بڑھائے اور لڑکی کو پکڑا۔ لڑکی چیختی ہوئی خود کو اس سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔۔ لیکن یچھنی کی گرفت سے نہ نکل سکی۔ یچھنی نے بڑے آرام سے لڑکی کو اُٹھایا اور مسرت بھری

آوازیں نکالتے ہوئے اپنے غار کی طرف چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی لڑکے کو ہوش آیا۔ جب اپنی محبوب بیوی کو نہ پایا تب جیسے اُس کی روح فنا ہو گئی۔ چیختا چلاتا نیچے آبادی کی طرف آیا۔ اُس کے رشتہ داروں کو بھی پتہ چلا۔ سب مل کر ماتم کرنے لگے۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ یچھنی کا مقابلہ کرنا اُن کے بس میں نہیں تھا۔ اِس لیے رو دھو کر ایک دوسرے کو تسلی دلاسہ دے کر چپ ہو گئے۔ لیکن وہ نوجوان بیٹھا نہ رہ سکا۔ وہ فوراً بگروٹ روانہ ہوا۔ اُس زمانے میں بگروٹ میں ایک عامل رہتا تھا۔ اُس کا نام کھمیو تھا۔ وہ ایک SHAMAN تھا۔ شنا زبان میں اسے دَنّل کہتے ہیں۔ دَنّل کھمیو بڑا عامل تھا۔ اپنے عمل سے جنوں، پریوں کو تابع بناتا تھا۔ نوجوان اُس سے ملا اور سارا واقعہ بیان کیا۔ کھمیو کو نوجوان پر ترس آیا۔ وہ نوجوان کے ساتھ گلگت آنے پر راضی ہوا۔

گلگت کے لوگوں نے جب دَنّل کھمیو کے بارے میں سنا تو اُمید سی بندھ گئی۔ اُنہوں نے کھمیو کا زبردست اِستقبال کیا۔ گلگت آ کر کھمیو نے حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اپنا عمل شروع کیا۔

اُس نے لوگوں سے کہا۔ ''میں اپنے عمل کے ذریعے یچھنی کو ختم کروں گا۔ لیکن میری ایک نصیحت یاد رکھو۔ یچھنی کے خاتمے کے بعد میں جہاں بھی چلا جاؤں اور میرا وہاں انتقال ہو جائے تو میری قبر یچھنی کے پیروں کے نیچے بنائی جائے۔ ورنہ کچھ ہی عرصے بعد یچھنی پھر سے زندہ ہو جائے گی۔''

لوگوں نے یقین دلایا کہ اُس کی نصیحت پر عمل کیا جائے گا۔

کھمیو نے لوہے کی میخیں تیار کیں اور منتر پڑھتا ہوا ہوکر کی پہاڑی کی طرف چل پڑا۔ اُس نے منتروں کے ذریعے اپنے گرد ایسا حصار قائم کیا کہ یچھنی کو اُس کی بو محسوس نہیں ہوئی۔ جس جگہ یچھنی کا غار تھا وہ ایسی دشوار جگہ تھی کہ کسی اِنسان کا وہاں پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن کھمیو اپنے منتروں کی شکتی سے، چٹانوں پہ لوہے کی میخیں ٹھونکتا ہوا اُس چٹان تک پہنچ گیا، جس کے ساتھ یچھنی ایک غار میں رہتی تھی۔ کھمیو غار کے دھانے کے پاس گیا۔ تب یچھنی کو محسوس ہوا کہ وہاں اُس کے علاوہ بھی کوئی ہے۔ وہ ایک دم بھیانک آوازیں نکالتے ہوئے باہر آئی۔ پھر ایک اِنسان کو دیکھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی اور حیرت سے چیخ کر بولی۔ ''اے اجل رسیدہ آدم زاد، لوگ مجھ سے ڈر کر گھروں سے باہر نہیں نکلتے اور تم میرے غار تک آئے ہو؟''

کھمیو مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں عام آدمیوں کی طرح نہیں ہوں۔ میرے اندر ایک خاص قسم کی طاقت ہے۔ میں بیٹھے بیٹھے دُور دُور کی خبر لاتا ہوں اور تجھے بھی ایک اہم خبر سنانے آیا ہوں۔''

یچھنی اپنے بال کھول کر، منہ سے آگ نکالتی ہوئی بولی۔ ''میرے لیے تو تم صرف ایک آدم زاد ہو۔ آ تجھ سے اپنی بھوک مٹا دوں۔'' یہ کہہ کر یچھنی اپنے بڑے بڑے ہاتھوں کو پھیلا کر آگے بڑھی۔ کھمیو ایک

دم اُچھل کر دوسری چٹان پہ آیا اور فوراً چیخ کر کہا۔

“میری بہن! بے شک تم مجھے کھاؤ۔ لیکن پہلے میری بات سن لو۔ میرے پاس تمھارے لیے ایک بہت بری خبر ہے۔ افسوس ہے تمہارا بھائی کشمیر میں مر گیا ہے۔”

یہ سن کر یچھنی صدمے سے چیخ پڑی اور اپنا دایاں ہاتھ بے اختیار سینے پہ رکھا۔ کھمیو نے فوراً منتر پڑھ کر میخ پہ پھونکا اور یچھنی کی طرف پھینک دیا۔ میخ تیزی گردش کرتی ہوئی یچھنی کے سینے پہ جہاں اس نے ہاتھ رکھا تھا، اُس میں اُتر گئی۔ یچھنی کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ درد کی شدت سے وہ تڑپنے لگی۔ پھر چند ہی لمحوں میں اُس کا سینہ اور ہاتھ پتھر کے بن گئے۔

یچھنی درد اور غصے سے چلا کر بولی۔ “اے آدم زاد! یہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ میرے ہاتھ اور سینے کے ساتھ یہ کیا ہوا ہے؟”

کھمیو نے کہا۔ “یہ تو کچھ بھی نہیں۔ تمھارے لیے اِس سے بھی بری خبر ہے۔ سن میری بہن! تمہارا باپ بھی بلتستان میں مر گیا ہے۔”

یہ سن کر یچھنی نے ایک بار پھر افسوس اور دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے دوسرا ہاتھ اپنی ران پہ مارا۔ کھمیو نے فوراً منتر پڑھتے ہوئے وہاں بھی میخ ٹھونک دی۔ کیل گھستے ہی ٹانگ اور دوسرا ہاتھ بھی پتھر کے ہو گئے۔ اب یچھنی حرکت کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ چلانے لگی اور کھمیو کی دغابازی پہ واویلا کرتے ہوئے بولی۔ “اے جھوٹے آدم زاد! یہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا؟ اب میں اپنے لیے شکار کیسے کروں گی؟”

کھمیو نے کہا۔ “اے ظالم یچھنی! آج سے پہلے تو انسانوں کو کھاتی تھی اور آج سے کنکر اور پتھر تیری خوراک بنیں گے۔”

کہا جاتا ہے کچھ عرصہ پہلے تک جب اوپر سے چھوٹے چھوٹے پتھر اور روڑے لڑھکتے ہوئے نیچے گرتے تھے تو لوگ کہتے تھے کہ یچھنی کے لیے خوراک آ رہی ہے۔

جب یچھنی بالکل بے بس ہوئی تب کھمیو نے مزید منتروں کے ذریعے اُسے مکمل پتھر کا بنا دیا۔ پھر اُس کے غار میں داخل ہوا۔ وہاں بہت سی انسانی ہڈیاں پڑی تھیں۔ کھمیو نے بہت افسوس کیا کہ پہلے کیوں نہ اُسے اِس بلا کی خبر ہوئی، ورنہ بہت سے معصوم لوگ اُس کی خوراک بننے سے محفوظ رہتے۔

جب وہ نیچے آبادی میں آیا اور یچھنی کے خاتمے کی خبر دی تو گلگت کے لوگوں نے اُسے سر آنکھوں پہ بٹھایا۔ کئی دنوں تک گلگت میں جشن منایا گیا۔ پھر ایک روز کھمیو گلگت والوں سے بہت سے تحفے اور مال و دولت لے کر بگروٹ روانہ ہوا۔ گلگت کے بہت سے لوگ قافلے کی شکل میں، اُسے کندھوں پر اُٹھا کر دریا کے

اُس پار، دینور کی وادی تک لے آئے۔ پھر اُسے رخصت کر کے واپس آ ئے۔

اُس وقت جب کھمیو کے ساتھ گئے لوگ دینور سے گلگت واپس آ رہے تھے گلگت میں کچھ لوگ جمع ہو کر ایک اہم فیصلہ کر رہے تھے۔ کھمیو نے کہا تھا یچھنی کے خاتمے کے بعد جب کبھی وہ مر جائے تو اُسے یچھنی کے نیچے ہی دفن کر دیا جائے۔ ورنہ یچھنی پھر سے زندہ ہو سکتی ہے۔ گلگت میں جمع ہونے والے اُن لوگوں نے بہت غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ کھمیو اگر چلا جائے اور کسی نامعلوم جگہ مر جائے تب یچھنی کا عفریت دوبارہ زندہ ہو جائے گا۔ اِسی لیے یہی وقت ہے اُسے مار کر یچھنی کے پاس دفن کر دیا جائے تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اِس بلا سے نجات مل جائے۔

یہ طے کر کے وہ کھمیو کے پیچھے گئے۔ گلگت کے دوسرے لوگ کھمیو کو چھوڑ کے واپس آ ئے تھے اور کھمیو اکیلا بگروٹ کی طرف رواں دواں تھا۔ ایسے میں ان لوگوں نے اُسے پکڑ لیا۔ کھمیو نے اُن کے ارادے کو بھانپ لیا اور حیرت سے پوچھا۔ ''اے لوگو! کیوں میری جان کے در پے ہوئے ہو؟ میں نے تمھارے ساتھ اتنی بھلائی کی ہے۔ کیا اُس کا یہ صلہ ہے؟''

گلگت والوں نے کہا۔ ''ہم آپ کو دل سے چاہتے ہیں۔ مگر آپ کو چھوڑ نہیں سکتے، کیوں کہ آپ کہیں اور جا کر مر گئے تو یچھنی پھر زندہ ہو گی۔''

کھمیو نے جب محسوس کیا گلگت کے لوگ اُسے زندہ چھوڑنے والے نہیں تو افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ بڑے خود غرض اور احسان فراموش ہو۔ میری وجہ سے تمھیں ایک بڑی بلا سے نجات مل گئی اور اب میری موت کا انتظار بھی نہیں کر رہے ہو۔ اے لوگو! جس طرح تم میرے معاملے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہو اِسی طرح قیامت تک تقسیم ہی رہو گے اور کبھی سکھ چین نہیں پاؤ گے۔''

نہ جانے یہ کھمیو کی بددُعا کے اثرات ہیں یا کیا ہے..........؟ کئی دہائیوں بعد بھی گلگت کے لوگ ٹکڑوں میں تقسیم نظر آتے ہیں۔ فرقہ واریت کی آگ اکثر بھڑکتی رہتی ہے۔ کئی کئی دنوں تک ایک ہی علاقے کے لوگ ایک دوسرے کے دشمن بنے رہتے ہیں۔ ایک ہی علاقے میں، ایک ہی محلے میں، بازار، دفاتر اور تعلیمی اداروں میں ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے دُور دُور رہتے ہیں۔

☆☆☆☆

کشمیری تخلیق وترجمہ: غلام حسن بٹ

چالاک چور......جاہل کسان

ہل جوتنے کا موسم تھا، ایک کسان جلدی جلدی کھیت کی طرف چل پڑا اور ساتھ ہی اپنی بیوی کو کھانا لانے کی تاکید کردی۔ دن نکلا کسان کی بیوی نے چاول پکائے اور ایک برتن میں رکھ کر کھیت کی طرف چل پڑی۔ کھیت میں پہنچ کر کسان سے کچھ فاصلے پر رکھ کر بولی ”میں زیادہ دیر تک نہیں رک سکتی کھانا یہ ہے“۔ چند لمحوں کے بعد جوں ہی کسان کھانا کھانے آیا تو اس نے برتن خالی پایا۔ کسان کو بہت غصہ آیا، شام کو گھر پہنچ کر بیوی کو بہت ڈانٹا اور بولا ”تم میرے ساتھ چالاکی کر رہی ہو۔“

بیوی کو بہت غصہ آیا اور سوچنے لگی کہ کسان جھوٹ بول رہا ہے۔ اگلے روز کسان دوبارہ کھیت میں جانے لگا اور بیوی سے کہا ”آج کھانا لانا مجھے کتے کی طرح بھوکا نہ رکھنا۔“ دوسرے روز کسان کی بیوی نے مٹی کے برتن میں زیادہ چاول 'بہت' ڈالے اور کھیت میں چلی گئی اور دوبارہ کھانا زمین پر رکھ کر بولی ”اب دیکھو یہ ہے آپ کا کھانا، دوبارہ نہ کہنا کھانا نہ لائی، میں زیادہ وقت نہیں رک سکتی، گھر میں کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں“ یہ کہہ کر وہ گھر چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد ایک چور آیا اور کھانا کھالیا بالکل اسی طرح جیسے پہلے دن کھا کر بھاگ گیا تھا۔ اب چور نے ہاتھ ہاتھ خالی برتن میں ڈالا، تنگ گردن والے برتن میں چاول کھانے/نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالتے ہی اس کا ہاتھ پھنس گیا۔ اب چور بہت گھبرایا اور بھاگنے لگا۔ بھاگتے ہوئے ہاتھ زور زور سے زمین پر مارنے لگا تاکہ برتن ٹوٹ جائے لیکن برتن نہ ٹوٹا۔

جوں ہی کسان نے چور کو دیکھا ایک چاقو لیے چور کی طرف لپکا اور غصے سے چلایا ”تم چور! تم نے کل بھی میرا کھانا کھایا تھا؟“

چور بولا ”میرا ہاتھ برتن سے نکالنے میں مدد کریں پھر میں آپ کو سب کچھ دوں گا جو آپ چاہتے ہیں۔“

کسان بولا! ”بہت اچھا“ فوراً اس نے برتن کو توڑا اور چور کا ہاتھ باہر نکالا، کسان بولا ”تم آج کی واردات/مہم جوئی نہیں بھولو گے!“

اس کے بعد چور نے کسان کو ”خدا حافظ کہا اور بادشاہ کے محل کی طرف روانہ ہوا، چور نے شاہی دربار میں داخل ہو کر بادشاہ سے کہا ”بادشاہ سلامت مجھے اجازت دیں میں آپ کی بیٹی کی شادی کا اہتمام کروں گا لیکن مجھ سے ناراض نہ ہونا۔“ عالی جاہ!“ میں آپ سے یہ بات ہرگز نہ کرتا اگر شہزادی نے شادی کا ارادہ ظاہر نہ کیا ہوتا۔“

بادشاہ بولا” آپ اس شخص کو جلدی جلدی یہاں لے آئیں میں اس سے ملوں گا۔“

چور جلدی جلدی کسان کے گھر گیا اور کسان سے کہا” جلدی جلدی تیار ہو جاؤ، بادشاہ سلامت اپنی بیٹی کی شادی تم سے کرنا چاہتا ہے۔“

پہلے تو کسان اپنی غربت اور سادگی کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوا، پھر بولا!” لیکن مجھے پتہ نہیں بادشاہ سے کیا بات کرنی ہے۔ اور محل میں جانے کے لیے شاہی لباس کہاں سے لاؤں گا۔“ لیکن چور نے کسان کو یقین دلایا کہ شاہی لباس کے سلسلہ میں ہر جگہ وہ اس کی مدد کرے گا اسے کیسے ملے گا؟

اب چور اور کسان محل کی جانب چل پڑے۔ جوں ہی محل میں پہنچے چور بادشاہ کو تلاش کرنے لگا اور کسان جوتے اتارنے والی جگہ دروازے کے ساتھ کھڑا انتظار کرنے لگا۔

چور بادشاہ سے ملا اور کہا” بادشاہ سلامت! میں اس شخص کو لے آیا ہوں جس کے بارے میں کل بات کی تھی وہ سادہ کپڑوں میں ہی آیا ہے۔ عالی جاہ! آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑتی۔ آپ حساس انسان سے مل کر برا نہیں منائیں گے۔“

”یقیناً“ بادشاہ بولا” چلو مجھے اس شخص سے ملاؤ“ چور بولا” وہ یہاں ہے۔“

بادشاہ!” وہ جوتوں کے پاس کیا کر رہا ہے۔“

”دوست تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ چور بولا۔

کسان نے جواب دیا” عالی جاہ! ایک غریب شخص کے لیے صاف اور بہتر جگہ یہی ہے“

چور نے مداخلت کرتے ہوئے کہا” اس شخص کی عاجزی تو دیکھیں“

بادشاہ” تم آج رات کو محل میں ٹھہرو گے، کچھ ضروری معاملات طے کرنے ہیں، کل اگر مطمئن ہوا تو تمھارے گھر جاؤں گا۔“

اس رات بادشاہ، چور اور کسان نے بہت باتیں کیں لیکن کسان نے شرمساری اور عاجزی کی کیفیت کو نہ چھوڑا لیکن چور حالات کے مطابق، بادشاہ کا دھیان دوسری جانب موڑ دیتا۔ کل کیا ہوگا! چور دماغ میں منصوبے بنانے لگا۔ دوسرے دن صبح جوں ہی کسان، بادشاہ اور چور کسان کے گھر کی طرف جانے لگے چور نے اجازت لی اور جلدی جلدی کسان کے گھر کی طرف دوڑا، گھر کے پاس پہنچتے ہی کسان کے گھر کو آگ لگا دی اور جوں ہی کسان اور بادشاہ قریب پہنچے تو جلدی جلدی ان کے پاس آ گیا اور بولا” بادشاہ سلامت! آگے نہ جائیں میں آپ کی منت کرتا ہوں، کسان کا گھر، جائیداد تباہ ہو گئے ہیں۔ کسی دشمن نے ایسا کیا۔“

آپ دونوں محل میں واپس آ جائیں۔ کسان اور چور محل میں پہنچے اور بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی کسان کے ساتھ کر دی!

ہندکو تخلیق وترجمہ: امتیاز الحق امتیاز

خواب

شکاگو کے مزدور سڑکوں پہ آئے
تو محنت کی عظمت اُجاگر ہوئی ہے
کہ ان کی رگوں میں
رواں تھا لہو اور منہ میں زباں تھی
مگر ہم
ابھی تک ملازم ہیں سرکار کے
ایسی سرکار کے
جس کے اُبھرے ہوئے پیوست ہیں
گردنوں میں ہماری
مگر ہم کہ اپنے ہی قاتل کے دربار سے منسلک ہیں
ہماری زبانوں پہ مہریں لگی ہیں
ہماری رگوں میں لہو کی جگہ اک سفیدی رواں ہے
غلامی کی زنجیر میں جکڑے
لاکھوں کروڑوں مرے بھائی اٹھیں
کہ اپنی مدد آپ کرنی ہے
چھالوں بھرے ہاتھ ہم نے کدالیں بنانی ہیں
سرمایہ داری کے بپھرے ہوئے تُند دریا کا رخ موڑنا ہے
ہماری امیدوں کی بنجر زمینیں بھی سیراب ہوں
اب ہماری بھی آنکھوں میں کچھ خواب ہیں

Ahmad Habib

محسوس کرو تو مرے اشعار بہت ہیں

(غزلیات)

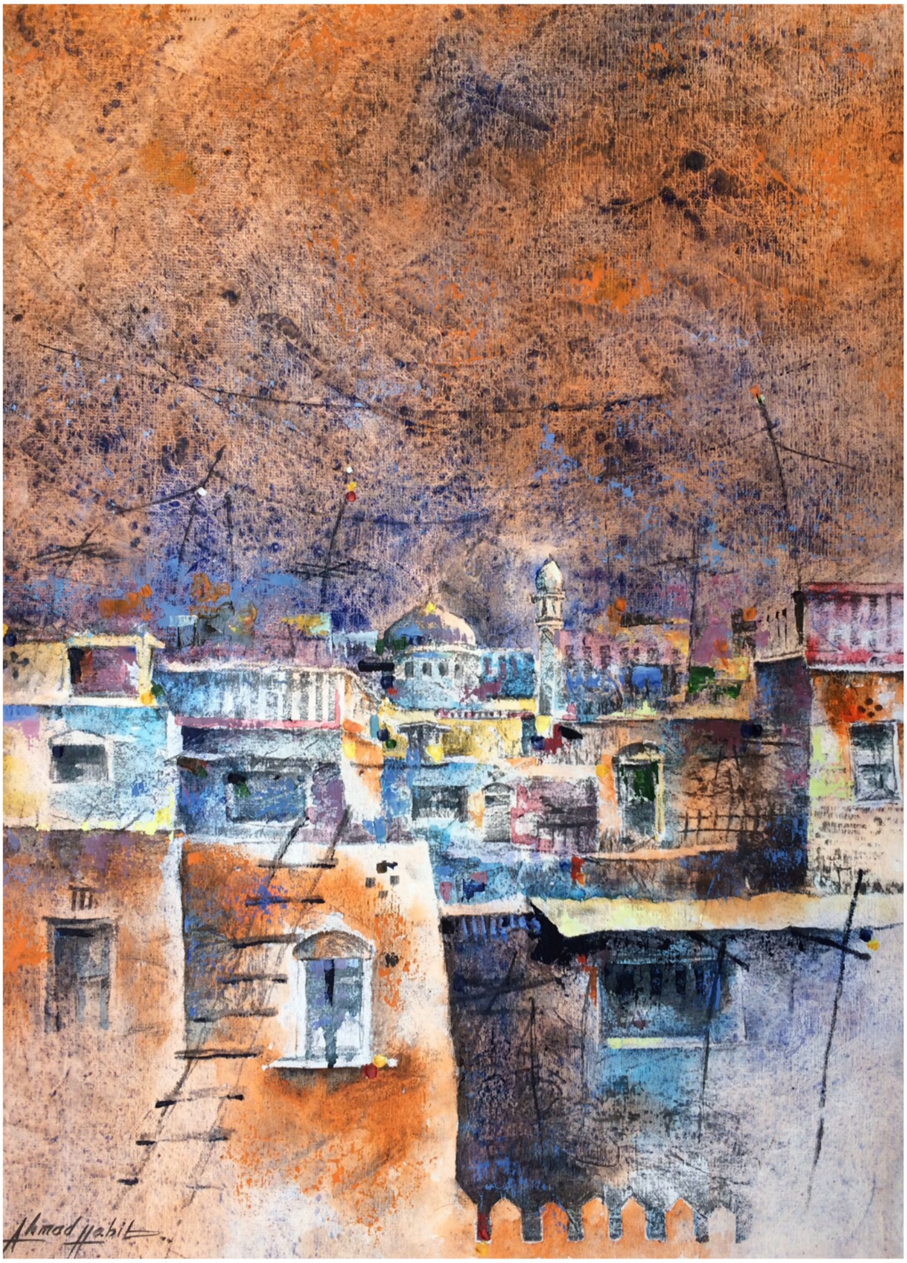
Ahmad Habib

اِک نُور سے سو نُور بناتی ہوئی صبحیں

(عقیدت)

قصہ سہانی شام کا۔۔۔۔

(افسانے)

مجھے یہ نظم لکھنی ہے

(نظمیں)

Ahmad Habib

تجھے ملا تو محبت سے آشنا ہوا میں

(خصوصی گوشہ: کازُواَواِشیگُو رَو)

مرے لیے نہ رُکے کوئی موجِ استقبال

(فکر و فلسفہ)

خوشبو بھی ہم راز بنائی جا سکتی ہے

(عالمی ادب سے تراجم)

مرا سُخن، مرا فن دوسروں کی خاطر ہے

(پاکستانی زبانوں سے تراجم)

اکادمی ادبیات کے دارالترجمہ کی مطبوعات

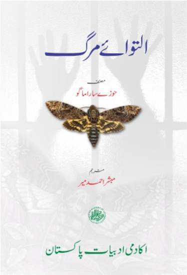
التوائے مرگ
مصنف
حوزے ساراماگو
مترجم
مبشر احمد میر
اکادمی ادبیات پاکستان

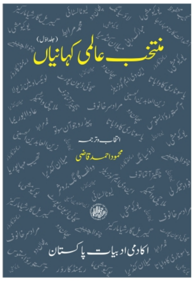
(جلد اوّل)
منتخب عالمی کہانیاں
انتخاب و ترجمہ
محمود احمد قاضی
اکادمی ادبیات پاکستان

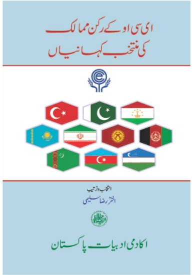
ای سی او کے رکن ممالک
کی منتخب کہانیاں
انتخاب و ترتیب
اختر رضا سلیمی
اکادمی ادبیات پاکستان

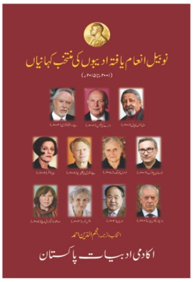
نوبیل انعام یافتہ ادیبوں کی منتخب کہانیاں
(۲۰۰۱ تا ۲۰۱۵ء)
انتخاب و ترجمہ: نجم الدین احمد
اکادمی ادبیات پاکستان

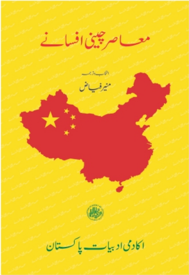
معاصر چینی افسانے
انتخاب و ترجمہ
منیر فیاض
اکادمی ادبیات پاکستان

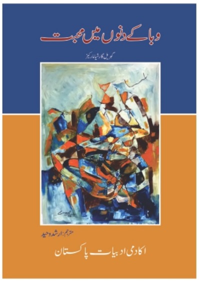
وبا کے دنوں میں محبت
گبریل گارشیا مارکیز
مترجم: ارشد وحید
اکادمی ادبیات پاکستان

ناول کا فن
میلان کنڈیرا
مترجم: ارشد وحید
اکادمی ادبیات پاکستان

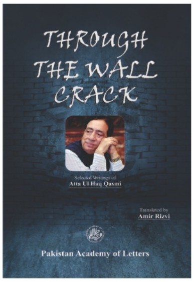
THROUGH
THE WALL
CRACK
Selected Writings of
Atta Ul Haq Qasmi
Translated by
Amir Rizvi
Pakistan Academy of Letters

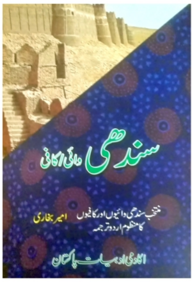
سندھی وائی / کافی
منتخب سندھی وائیوں اور کافیوں
کا منظوم اردو ترجمہ
امیر بخاری
اکادمی ادبیات پاکستان

Quarterly **Adabiyaat** Islamabad

July to September 2017

ISSN: 2077-0642

اکادمی ادبیات کی نئی مطبوعات

علامہ اقبال کی منتخب نظموں کے آٹھ پاکستانی زبانوں میں تراجم

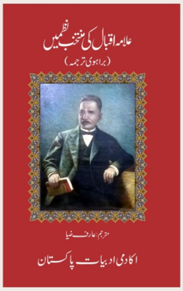
علامہ اقبال کی منتخب نظمیں
(براہوی ترجمہ)
مترجم: عارف ضیا
اکادمی ادبیات پاکستان

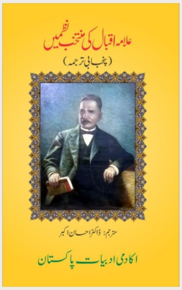
علامہ اقبال کی منتخب نظمیں
(پنجابی ترجمہ)
مترجم: ڈاکٹر احسان اکبر
اکادمی ادبیات پاکستان

علامہ اقبال کی منتخب نظمیں
(سندھی ترجمہ)
مترجم: سرمد چانڈیو
ادارت و نظرثانی: امداد حسینی
اکادمی ادبیات پاکستان

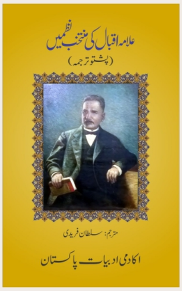
علامہ اقبال کی منتخب نظمیں
(پشتو ترجمہ)
مترجم: سلطان فریدی
اکادمی ادبیات پاکستان

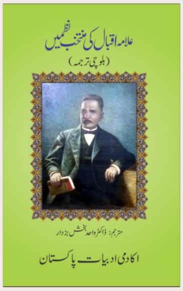
علامہ اقبال کی منتخب نظمیں
(بلوچی ترجمہ)
مترجم: ڈاکٹر واحد بخش بزدار
اکادمی ادبیات پاکستان

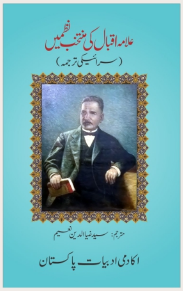
علامہ اقبال کی منتخب نظمیں
(سرائیکی ترجمہ)
مترجم: سید ضیاالدین نعیم
اکادمی ادبیات پاکستان

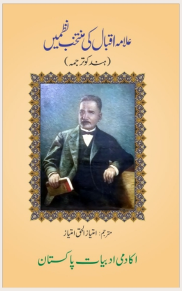
علامہ اقبال کی منتخب نظمیں
(ہندکو ترجمہ)
مترجم: امتیاز الحق امتیاز
اکادمی ادبیات پاکستان

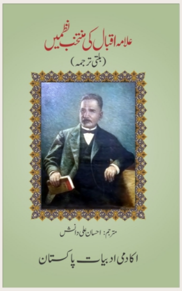
علامہ اقبال کی منتخب نظمیں
(بلتی ترجمہ)
مترجم: احسان علی دانش
اکادمی ادبیات پاکستان

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: ar.saleemipal@gmail.com